

سنگین

خدیجہ مستور



ماضی

سردیوں کی رات کتنی جلدی سنان ہو جاتی ہے۔ آج بھی شام سے بادل پھاگئے تھے۔ خنکی بڑھ گئی تھی۔ کھڑکی کے پاس لگے ہوئے بجلی کے کھمبے کا بلب خاموشی سے جل رہا تھا۔ گلی کے اس پار اسکول کی ادھ بنی عمارت کے قریب درختوں کے جھنڈ سے الو کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ اس کی آواز کی نحوست رات کو اور بھی سنان کئے جا رہی تھی۔ پاس کے بڑے کمرے میں اب قطعی خاموشی تھی۔ چھٹی کے کدوئیں بدلنے کی آہٹ بھی نہ محسوس ہوتی۔

سو رہی ہے مزے میں — عالیہ نے بڑی حسرت سے سوچا۔ اسے نیند نہ آ رہی تھی۔ رات کو نیند نہ آنا کتنا تکلیف دہ احساس ہوتا ہے۔ یہ احساس اس وقت تو اور بھی شدید ہو جاتا ہے جب بالکل نئی جگہ ہو — شاید نئی جگہوں کی پہلی رات اسی طرح بے خوابی سے گزرتی ہوگی — اس نے ایک بار پھر سو جانے کی کوشش کی۔ کھڑکی کے پٹ بھیڑنے سے ننھے سے کمرے میں اندھیرا چھا گیا اور وہ لحاف میں منہ چھپا کر اس طرح لیٹ گئی جیسے واقعی سو رہی ہو۔

دیر تک بے سدھ پڑے رہنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ ساری جدوجہد بے کار گئی۔ نیند کا تو کوسوں پتہ نہ تھا۔ ماضی کی یادیں گولے کی طرح دماغ میں لوٹیں لگا رہی تھیں۔ وہ بڑی بے بسی سے اپنے بستر پر پلٹتی مار کر بیٹھ گئی۔ کھڑکی کے پٹ کھول کر باہر دیکھنے لگی۔ گلی کے اس پار اسکول کی عمارت، آم اور پھل کے گھنے درخت سب اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شام گئی یہ سب کچھ کتنا صاف، اور خوب صورت نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی میں بیٹھ کر اس نے یہ سب کچھ ذرا دلچسپی سے دیکھا تھا مگر اس وقت اندھیرے میں درخت سیاہ پہاڑیوں کی طرح محسوس ہو

رہے تھے اور جب ہوا کا تیز بھونکا چلتا تو یہ درخت بچپن میں سنی ہوئی کمائیوں کے بھونکوں کی طرح خوفناک معلوم ہوتے۔

اس طرح تو نیند آنے سے رہی۔ اس نے سوچا اور کھڑکی کے بند بھیج کر بند کر دیئے۔ لیٹتے ہوئے اسے اپنا جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ سارے دن کے سفر کی بے چینی نے کہیں کا نہ رکھا تھا۔

ہائے بھئی۔ وہ کراہی۔ اب نیند نہیں آتی۔ جب تک دماغ کی دنیا دیران نہ کی جائے نیند کا مکان سے گزر ہو۔ ماضی کی یادیں ہر طرف سے دراتی چلی آ رہی تھیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ماضی کو بھول جاؤ۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے میں کیا رکھا ہے؟ آگے بڑھے جاؤ۔ پر اسے تو درٹے میں صرف اپنا ماضی ہی ملا تھا۔ ماضی جس سے اس نے کیا یکم نہیں سیکھا۔ اب وہ اس سے کس طرح دامن بچائے۔ جن حالات میں وہ یہاں آئی تھی۔ ان کی وجہ سے تو اور بھی یادوں نے سر اٹھا رکھا تھا۔

جائے اماں بھی سوئی ہوں گی یا نہیں۔ گھر میں کیسی خاموشی طاری تھی۔ گلی میں کوئی راہ گیر ٹھہری ہوئی آواز میں گانگڑ گیا۔

مفت ہوئے بدنام سنور یا تیرے لئے

یہ رات کس طرح گزری؟ ابائیل میں تمہاری راتیں کس طرح گزر رہی ہوں گی؟ اس نے جیسے بلبلار کرکھنے بیٹ میں اڑا لئے۔ دور کہیں سے گھوڑیاں کے گیارہ بجانے کی آواز آ رہی تھی۔

بلکی بلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ ہوا کے بھونکوں میں آتی ہوئی بوچھاڑ کھڑکی کے پٹوں پر مدھ لے میں لکھتا رہی تھی۔

اب یہ زندگی کیسی ہوگی؟ اس نے جیسے ڈر کر سوچا۔ کمرے میں کتنا اندھیرا تھا۔ اسے اپنے سوال پر جواب دینا پڑا۔ اندھیرا چھایا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے گہرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ نیند تو آج بھی کوسوں دور تھی پر ماضی کی یادیں اس کی رات کٹوانے کے لئے آ بیٹھی تھیں۔

وہ ایک اجاز ضلع تھا۔ سرخ سرخ اینٹوں کے مکان اس طرح بنے ہوئے

تھے کہ کسی ترتیب کا خیال ہی نہ آتا۔ بس ایسا محسوس ہوتا کہ کسی نے اٹھا کر نکھیر دیئے ہیں۔ وہاں اس چھوٹی سی جگہ میں کتنے بستے مندر تھے۔ ان کے سترے فٹس سر اٹھائے جیسے بھگون کی پر اترتا کرتے رہتے۔ مندروں میں صبح شام کھینے بنتے پجاریوں کے بچپن گانے کی مدھ مدھ آواز گھرنک آتی۔

وہاں درخت کس قدر تھے۔ دھول سے اتنی ہوئی کچی سڑکوں پر دونوں طرف ’آم‘ جاسن اور پھیل کے گھنے درخت تھے۔ ان درختوں کے سائے میں راہ گیر انوکھے پتے پھائے گھڑیاں سر کے نیچے رکھ کر مزے سے سویا کرتے۔ ان دنوں بہار کا موسم تھا۔ آسمان میں بور آچکا تھا۔ کوئل ہر دقت کو کا کرتی۔ انہیں دنوں تو وہاں اتنی تھی۔

جب اس نئی جگہ پر ایسا کا چالہ ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ بالکل تنہا اور اداس ہے۔ وہیں اس کا شعور جاگا تھا اور کچھ سوچنے بجھنے کی صلاحیت نے جنم لیا تھا۔

اس دن جب سب لوگ نئے گھر میں اترے تھے تو سامان کے بڑے بڑے بڈل صحن میں ہر طرف رکھے ہوئے تھے جنہیں ابا ٹکھ کی طرف سے لے ہوئے تھے۔ ہر ایسی کی مدد سے کھلا رہے تھے۔ اماں گھراور سامان کی طرف سے بالکل بے تعلق رہی۔ معلوم ہوتا تھا پھر بھی انہوں نے کئی بار گھوم پھر کر اونچے اونچے محراب دار ’اندوں‘ کمروں اور غسل خانے وغیرہ کو دیکھا تھا۔ تھیندہ آپا نظرس جھکائے چھوٹا دونا سامان اٹھا اٹھا کر کمروں میں لے جا رہی تھیں۔ اماں تخت بیڑاری سے آرام کری پر نیم دراز تھیں۔ صفدر بھائی اپنے کمزور شانے جھکائے برآمدے کی محراب میں اکڑوں بیٹھے تھے۔

”تم بھی اپنے ماموں کی مدد کرو۔“ اماں نے بڑی حقارت سے صفدر بھائی کی طرف دیکھا تھا۔

”رہنے دو وہ کمزور ہو گیا ہے بخار سے، پھر ششقرمیں بھی تھک گیا ہے۔“ ابا نے آہستہ سے کہا۔

”یہ تو بیشبہ ہی تھا رکھتا ہے۔“ اماں بڑبڑائیں اور پھر جیسے جمل کر ابا کے

ساتھ سامان کھلائے گئیں۔ تینہ آپا نے گھبرا کر صفدر بھائی کو دیکھا اور پھر نظریں جھکائیں وہ کچھ خوف زدہ ہی ہو گئیں۔

اسی دن تو اسے احساس ہوا کہ گھر کی فضا کبھی کبھی ہے۔ وہ سب کے مجرمے تیار دیکھ کر اور بھی رنجیدہ ہو گئی۔ اسے تو اپنی وہی پرانی جگہ یاد آ رہی تھی۔

وہاں تو لائن سے سارے افسروں کے پہلے پہلے بچکے بنے ہوئے تھے بنگلوں سے ذرا دور آسمان کا باغ تھا۔ پاس چھوٹا سٹالاب اور اس ٹالاب میں نیچے اور ہمیشہ ساتھ ساتھ نمایا کرتیں۔ وہاں اس کی ہم بست سی لڑکیاں اور لڑکے تھے۔ سارا دن مزے مزے کے کھیل کھیلتے جاتے۔ اور کچھ نہیں تو پانی میں بیٹھی ہوئی بھینسوں کو ڈھیلے ہی کھینچ کھینچ کر مارے جاتے۔ باغ میں گھس کر کیڑوں کی چوری کی جاتی، مگر جب چوری پکڑی جاتی تو باغ کا رکھوالا انہیں کچھ بھی نہ کہتا بلکہ زین پر بٹھی ہوئی بچی کیریاں خود ہی جن کر انہیں دے دیتا۔

”لمپے بابو ہر دن کے نیچے ہیں۔“ وہ بڑے پیار سے ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتا۔ کلا اور اوشا اسے منہ چراتیں، اس کے بڑے دانتوں کا مذاق اڑاتیں مگر وہ نہ جگرتا۔

رات کو خانسامن ہوا اس کی ضد پر کمائیاں سناتیں۔ شہزادے اور شہزادی کی کمائی جو ایک ہی بستر پر بیچ میں تھوڑا رکھ کر سوجاتے تھے۔ وہ اس کمائی سے سخت فخر مند ہو جاتی۔ اگر کسی نے ذرا سی بھی کرٹ لی تو کہیں شہزادے یا شہزادی کا جسم نہ کٹ جائے۔ خانسامن ہوا اسے سمجھاتیں کہ ”جہی کمائیاں میں جسم نہیں کٹا کرتے۔“ پھر بھی اس کی فکر نہ نہ ہوتی۔ سوتے میں بھی وہ خوف سے کرٹ نہ بدلتی۔ جانے وہ تھوڑا اس کے بستر پر کہاں سے آ جاتی۔

خانسامن ہوا اور بھی کیسے مزے مزے کی کمائیاں سناتی تھیں۔ راجہ بھوج اور منگوتیلی کی کمائی، کھ پتلی کی کمائی جو راجہ کے محل کی ہر چیز کھا گئی تھی۔ کھ پتلی کی کمائی بھی کتنی اچھی تھی۔ کھ پتلی کی بری حرکتوں کی اطلاع جب راجہ کو دی جاتی تو بڑے مٹھے انداز سے گایا جاتا۔

کانڈھ کی کھ پتلی رے راجہ مگنی سب گھوڑے کھائے جی
”خانسامن ہوا۔ جب راجہ کو گا کر بتاتے تھے تو وہ ناراض نہیں ہوتا تھا؟“
وہ حیرت سے پوچھتی تھی۔

”نہیں بیٹا، راجہ لوگ بڑے نازک مزاج ہوتے ہیں، ان کے سامنے ہر بات اچھی طرح کہنی پڑتی ہے۔ نہیں تو وہ بال بچوں سیٹ کو نمونہ نہ پلوا دے۔“
اسے خوف سا محسوس ہوتا تو خانسامن ہوا اسے اپنے پیسے سے بچھپاتے ہوئے بیٹے سے لگا لیتی۔

اماں سے تو اس کا صرف اتنا ہی تعلق تھا کہ جب وہ کھیلتے کھیلتے باہر سے آتی تو ان کے پلٹ جاتی۔ وہ اسے پیار کر کے پھر سے کھیلنے کی ہدایت کرتیں۔ اماں تو اسے صرف دور ہی دور سے نظر آتے۔ صبح و فتر چلے جاتے اور شام کو بینک دوستوں سے بھر جاتی۔ وہ سب زور زور سے باتیں کرتے، قہقہے لگاتے اور خانسامن ہوا ان کے لئے چائے پانی کرتیں۔

اس کے بعد وہ اسکول میں داخل کر دی گئی۔ اب تو اس کی دنیا اور بھی وسیع ہو گئی تھی۔ اس کی کئی ساتھی لڑکیاں اسکول میں آگئی تھیں اور دوسری نئی نئی لڑکیوں سے دوستیاں بڑھ رہی تھیں۔ جب وہ پڑھ کر آتی تو صفدر بھائی اسے اپنے پاس بلاتے، پڑھنے کے سلسلے میں سوالات کرتے، اس کے ہر جواب پر زور سے ہنستے۔ ”واہ تم کو تو کچھ نہیں آتا۔“ وہ اسے سخت برے لگتے اور وہ جلدی سے بھائی کے کوشش کرتی۔

جب وہ پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی تو اس نے خانسامن ہوا کے مشورے سے سلیٹے والے کھیل کھیلتا شروع کر دیئے تھے۔ صحن کے ایک کونے میں گڑیوں کا بڑا سا گھروندا بنا لیا گیا۔ اس گھروندے میں گڑیوں کی شادی ہوتی، دھوم سے رات نکلتی۔ گڑیوں کے بچے پیدا ہوتے، آپا سے دھول کی ہوئی ڈھیروں کڑیوں سے کپڑے سے جاتے، خانسامن ہوا شادیوں اور پیدائش پر کھجوریں بنا کر دیتیں۔ کبھی کبھی زدہ بھی چکے۔ اس دن کلا، اوشا اور رادھا چھوٹ نہ نائیں، وہ سب کھلے فرائے زردہ کھاتیں۔

اماں نے بڑی سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھیں بند کر کے جیسے ان نظروں سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا۔ اماں بوئے کرخت لمبے میں چڑاسی کو سمجھانے لگیں۔ ”تمہارے ذمے باہر کے کام ہیں۔ تم گھر کے کام نہیں کر سکتے۔“ ذرا ”ایک اماں کا انتظار کرو“ مگر یہ خیال رکھنا کہ جوان نہ ہو، ایسی غور تیں دو کوڑی کا کام نہیں کر تیں۔“

”بس کل تک آپ کی مرضی کا انتظار ہو جائے گا سرکار۔“
شام ہو رہی تھی اب اپنی پہلی سی چھری اٹھا کر باہر گھومنے چلے گئے۔ اماں نے ایک بار آنکھوں سے صندوق بھائی کو گھورا۔ ”چاہے کھلیو۔“ اماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور جیسے رٹا ہوا جلد استعمال کیا۔ وہ پھر باہر دلیز پر جا کھڑی ہوئی۔ دو منزلے مکان کی اوپری منزل سے دوواں اٹھ رہا تھا۔ مندروں سے گھنٹوں کی تیز آوازیں آ رہی تھیں۔

”ہند! کھلیو! کس سے کھلیو! یہاں اس جنگل میں کون ہے۔“ اس کا جی بھر رہا تھا۔ ”گھر کے اندر رہو یا پھر اس دلیز پر بیٹھو اور کھلیو کھلیو کے جاؤ۔“ وہ بڑبڑا رہی تھی۔ اس پر سب لوگ منہ بنا کر بیٹھے ہیں۔ وہ گھٹ گھٹ کر روئے گی۔

”آؤ بیٹا روٹی کھاؤ۔“ چڑاسی کی بیوی دیوار پر اپک رہی تھی۔ اس نے بلدی سے آنسو پونچھ کر منہ پھیر لیا۔

”عالیہ“ بڑ۔۔۔ آیا بڑی بڑی آنکھیں جھکائے اس کے پیچھے آکر بیٹھی ہیں۔ ”چلو اندر! اب اندر جا رہا ہے“ ہائے کتنی خوب صورت جگہ ہے یہ بھی۔ انہوں نے بھی ٹھنڈی سانس بھر کر دور دور دیکھا اور پھر اسے اپنی کمرے پہنائے اندر آئیں۔ وہ جھٹک کے پاس والے چھوٹے کمرے سے گزر رہی تھیں تو ایک لمبے کو ٹھٹک کر کھڑی ہو گئیں۔ صندوق بھائی میز پر رکھی ہوئی لائین کے پاس بٹکے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔

صحن میں قطار سے پلنگ بچے ہوئے تھے، آپا کا پلنگ مندی کے پودے کے پاس بچھا ہوا تھا، ان کے پاس اس کا پلنگ تھا۔ وہ اپنے بستر پر خاموشی سے لیٹ گئی۔

مگر یہاں تو کچھ بھی نہ تھا، اس نے باہر نکل کر ہر طرف نظر دوڑائی۔ جردا ہے بکریاں ہانکے لئے جا رہے تھے۔ دو چار ننگ و مڑنگ بچے بیٹھے مٹی سے کھیل رہے تھے۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے مکان دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے گھر کے پاس تو صرف ایک ہی دو منزلہ مکان تھا یا پھر چڑاسی کا گھر جو پہلی مٹی سے بنا ہوا تھا۔ وہ بڑی ڈگر تک اونچے دو منزلہ مکان کو دیکھتی رہی مگر وہاں سے کوئی لڑکی نہ اتری تھی وہ اپنا دوست بنا سکتی۔ ایک مرد سفید براق دھوئی کا پلو تھا سے تیزی سے بچے اترتا اور چلا گیا۔ اس کے بعد گھر کی اوپری منزل سے ہارمونیم پر گانے کی آواز آئے گی۔ اس نے گیت کے بول دہرائے مگر اسے وہ بول کتنے غیر دلچسپ لگے تھے۔

دروختوں پر ہند زور زور سے چھٹا رہے تھے وہ بڑی بیزاری سے بیٹھک کی دلیز پر بیٹھی رہی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خوب پیچ کر روئے، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور یہاں سے بھاگ جائے۔

”جینا! ہمارے پاس آ جاؤ۔“ چڑاسی کی بیوی صحن کی کبھی چنی دیوار پر اپک اپک کر اسے بلارہی تھیں
”ہند! وہ اندر آگئی۔“

بست سا سامان ٹھکانے لگ چکا تھا۔ صحن میں آرام کریاں بچھ گئی تھیں اور چڑاسی کا جائے بنا چکا تھا۔ ”آپا“ صندوق بھائی، ”ابا“ اور اماں سب ٹھکے سے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ اس سے کسی نے بھی بات نہ کی۔ صحن چچ میں مندی کا بھونسا پودا لگا تھا جس کی پتیاں خوب ہری ہو رہی تھیں۔ اس نے لوٹنے میں پانی بھر کر پودے میں ڈالنا شروع کر دیا۔

”چائے پوئے۔“ صندوق بھائی نے اس دن پہلی بار کچھ ایسے پیار سے بات کی کہ وہ ان کے پاس چلی گئی اور ان کے قریب والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”گھبرا رہی ہو بڑ،“ جگہ جگہ ہے کوئی ساتھ کھینے والا بھی نہیں۔“ صندوق بھائی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے گی۔ ایک صندوق بھائی تھے جو اس بات کو سمجھ سکتے تھے۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے ان کی گود میں جھٹک گئی۔

چاند ابھر رہا تھا۔ آسمان روشن تھا مگر آپا کا چہرہ صحن کے پلکے سے اندھیرے میں آسمان سے بھی کہیں زیادہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اسے تو اس دن احساس ہوا کہ آپا ہر وقت غم رہتی ہیں۔ اس وقت بھی وہ اپنے بستر پر بیٹھی بوے کھوئے ہوئے انداز سے مندی کی چٹاں نوچ نوچ کر بکھیر رہی تھیں۔

والان کی عمارت کے بچ میں رکھی ہوئی لائین کی لو بہت نیچی تھی۔ چہرہ اسی باورچی خانے میں کھانا پکا رہا تھا۔ اماں دوسری لائین ہاتھ میں اٹھائے کمرے میں جا بنے کیا کرتی پھر رہی تھیں۔

”جب تم اسکول میں داخل ہوگی تو پھر بہت سی لڑکیاں دوست بن جائیں گی۔“ آپا نے اس کی طرف کھٹ لے کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولے ہوئے سہلائے لگیں۔ مگر دکھ کے شدید احساس نے آپا کی محبت کا ذرا بھی اثر نہ لیا۔ ہاتھ چھڑا کر اس نے منہ پھیر لیا۔ پھر آسمان پر اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھنے لگی اور اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب خیمہ کا جھوکا اٹیا۔

”ارے بڑا، بغیر کھانا کھائے سو رہی ہو؟“ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ صفدر بھائی اس پر ہنسنے لگے تھے۔

”کیا ضرورت تھی ابھی سے جگانے کی؟“ اماں اس لیے میں بولیں جیسے وہ چہرہ اسی کو ہدایت دے رہی تھیں۔ صفدر بھائی اس کے پاس سے ہنسنے والے تھے کہ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر لیٹے لیٹے جھک کر ان کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ صفدر بھائی نے دو ایک بار اماں کو نیچی نیچی نظروں سے دیکھا اور پھر اس کا سر گود میں رکھ کر بیٹھ گئے۔

”کمانی سنا بیٹے صفدر بھائی، یہاں تو خانا من بوا بھی نہیں“ اس نے بھرائی آواز میں کہا۔

”کون سی کمانی بڑ؟“

”اسی شہزادی کی، جس کے ابا نے اسے ڈولے میں بٹھا کر جنگل میں چھڑوا دیا تھا۔“ اس نے اماں کی پروا کئے بغیر کمانی کی فرمائش بھی کر ڈالی۔ آپا جیسے احزانہ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔

”میں تم کو دوسری کمانی سناتا ہوں۔ ایک غریب لڑکا جو شہزادی سے محبت کرتا تھا۔ ہاں تو سنو، ایک تھا لڑکا۔“

آپا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔

اماں اپنے دکھوں میں مگن رہیں اور اپا اپنی دنیا میں مگن۔ دفتر سے آنے کے بعد وہ گھنٹہ آدھا گھنٹہ گھر میں گزارتے۔ اماں کسی نہ کسی بات پر لڑتیں اور اپا باہر کی راہ لیتے۔ قسم قسم کے دوست آ جاتے جن کے گھنٹوں جوش و خروش سے باتیں ہوتیں۔

کرتیں۔"

"ہمدادی کا معاملہ بھی خود تمہاری دادی ملے کرتیں۔ انہوں نے تمہارے باپ اور چچاؤں کی شادی اپنی مرضی سے کی تھی۔ بیویوں کو وہ بہت دیا کر رکھتیں مگر انہوں نے مجھ سے کبھی زیادتی نہ کی۔ میں ان کی طرح بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ میرا بھائی انگلینڈ میں پڑھتا تھا۔ مجھ میں تمہاری دادی جیسا رعب تھا۔ تمہاری بڑی اور مصلیٰ چچی ان کے سامنے ہوں نہ کر پاتیں۔ تمہاری دادی اگر کسی کے سامنے جھکتی تھیں تو وہ تمہارے سب سے چھوٹے چچا تھے۔ جب خلافت کی تحریک چلی تو وہ ترکی چلے گئے۔ پھر ان کا پتہ نہ چلا کہ کہاں گئے۔ پھر بھی تمہاری دادی نے کبھی کسی کے سامنے ایک آنسو نہ بہایا۔ بیٹے کو یاد کر کے ایک آہ نہ بھری کہ کہیں ان کے رعب داب کی نظریں نیچے نہ ہو جائیں۔ مگر اللہ کو پتہ اور ہی منحور تھا۔ تمہاری سسلہ پھر بھی نے چودہ سال کی عمر میں ان کا منہ کالا کر دیا۔ تمہاری دادی نے ایک دن اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہ سفور کے پلے کا ہاتھ پکڑے سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ اس دن دادی نے سسلہ پھر بھی کو کمرے میں بند کر کے اتنا مارا کہ سارا جسم ٹیلا ہو گیا۔ جب میں ان کے جسم پر ہلدی چھٹا لگے بیٹی تو کانپ کانپ گئی۔ پھر بھی یہ سزا تمہاری سسلہ پھر بھی کے لئے کتنی کم تھی۔ انہیں تو زندہ دفن دینا چاہئے تھا۔"

"دوسرے دن انہوں نے سفور کے باپ دادا کو زمینوں سے نکال دیا اور دو جہازوں کو بلا کر حکم دیا کہ انہیں سب کے سامنے جوئے مار کر گاؤں سے نکال دیں۔ اسی دن شام کو نائن نے آکر بتایا کہ جانے سفور کے باپ دادے کیا قصور ہو کہ سب کے سامنے جوئے مارے گئے۔ وہ دونوں گاؤں سے چلے گئے۔ اس خبر کو سن کر دادی ایسے بے پناہ رعب سے انہیں کہ سب کانپ گئے، مگر تمہاری سسلہ پھر بھی جیتے ہی مر گئیں۔ اس قصے کے بعد انہوں نے نہ تو ڈھنگ سے کپڑے پہنے اور نہ بالوں میں سنگھسی کی۔ تمہاری دادی انہیں ہر وقت نظروں میں رکھتیں۔"

"ایک دن میں نے ان کو بڑی عجیب حالت میں دیکھ لیا۔ سردیوں کے دن تھے تمہاری سسلہ پھر بھی بھی دھوپ کھا نہ چھت پر گئی ہوئی تھیں۔ ان کے قریب جھت کی منڈیر پر جنگلی کبوتر بیٹھا غوغاں کر رہا تھا اور سسلہ اس سے کہہ رہی تھی۔

"اے کبوتر! تو شہزادیوں کے پیغام لے جاتا ہے، میرے حال پر رحم کر، ایک بیٹا میرا بھی لے جا۔ ان سے کہو کہ سسلہ میرے فراق میں تڑپتی ہے۔"

"کبوتر تو خیر یوں ہی بھرے اڑا گیا مگر میں نے تمہاری دادی کو یہ بے شری لی باتیں کہہ سنائیں۔ انہوں نے بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ دوسری بیویوں کو یہ باتیں نہ معلوم ہوں۔ پھر بھی یہ بات تو سب کو معلوم ہو کر رہی اللہ جانے، وہ کبوتر تھا کہ جن۔"

"اس دن تمہارے دادا کہیں باہر گئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ رات مہمان خانے میں رہیں گے۔ دادی نے اس دن سونے سے پہلے گھر میں تالا لگا کر چابیوں اپنے سرانے رکھ لی تھیں۔ مگر جب صبح ان کی آنکھ کھلی تو چابیوں کا گھجھا اور تمہاری سسلہ پھر بھی دونوں غائب تھے۔ تمہاری دادی دم بخود بیٹھی تھیں۔ انہوں نے سب کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ اگر منہ سے اف کی تو زندہ گاڑ دوں گی۔ کتوں سے نچوڑ دوں گی۔ دوسرے دن شام کو دادا واپس آئے تو دادی نے بند کمرے میں دیر تک باتیں کیں۔ جب وہ باہر نکلے تو ان کا چہرہ شرم اور نفرت سے سرخ ہو رہا تھا۔"

اتنا قصہ کہہ کر اماں نے بڑی حسرت سے کہا تھا کہ — "کاش سسلہ میری بیٹی ہوتی تو پہلے ہی دن اسے اپنے ہاتھوں سے زہر کھلا دیتی۔"

"تمہارے دادا جانے کیا کرتے مگر اسی دن تمہارے ابا چند دن کی چھٹی لے آئے گئے اور بڑی بے شری سے سسلہ کے حق میں اپنے ابا سے لڑتے رہے۔ میرا فیرت سے برا حال تھا۔ کاش تمہارے باپ سے میری شادی نہ ہوئی ہوتی۔ تمہاری دادی فحش سے شغلی رہیں مگر تمہارے ابا کی مونچھوں کی لاج رکھتے ہوئے منہ سے نہ نہ بولیں مگر تمہارے دادا کو جانے کیا ہوا کہ اسی وقت اپنی واشخاؤں کو گھروں سے نکال دیا اور گاؤں سے چلے جانے کا حکم بھجوا دیا۔ دادی کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے حکم دیا کہ صرف واشخائیں جائیں گی مگر ان کے بیٹے نہیں جائیں گے۔ اس لئے کہ وہ ان کے شوہر کا خون تھے۔"

"یتیم لڑکے گھر آگئے۔ تو بہ، ان کی صورتیں دیکھ کر گھن آتی تھی۔ دونوں

چھوٹے لڑکے ایسے ندیدے تھے کہ برسات کے دنوں میں کھیلوں کی بجلی ہوئی جھوٹی
مٹھلیاں چوس چوس کر بیٹے میں مرگے۔ شکر ہے مرگے ورنہ کیا پتہ کہ تمہارے ابا
انہیں بھی آج کیلے سے لگا کر کسی کالج میں پڑھوا رہے ہوتے۔“

”سلہ نے بھاگ کر نکاح کر لیا تھا۔ تمہارے ابا کی دھمکیوں سے ڈر کر
تمہارے دادا نے بظاہر کچھ نہ کیا مگر جہاں کہیں سلہ کے میاں نوکری کرتے، اسے
چھڑوا دیتے۔ سلہ اور وہ دونوں بھوکے مرتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انہیں تو کتوں
کی طرح بھوکا مرنے چاہیے تھا مگر تمہارے ابا نے انہیں انسانوں کی طرح مر جانے
دیا۔ مصدّر کی پیدائش پر سلہ کو دق ہو گئی اور کچھ دن بعد ایزیاں رگڑ رگڑ کر مر
گئی۔“

”جب دادی کو سلہ چھو بھی کی موت کی خبر ملی تو جانے ان کی شرم کہاں م
گئی۔ اپنی بے حیائی کی موت پر سینہ کوٹ کوٹ کر رونے لگیں۔ مجھ سے تو قسم
لے لو جو میری آنکھ سے ایک آنسو بھی گرا ہو۔ حیران ہو کر تمہاری دادی کو دیکھ
رہی تھی جو نوکروں چاکروں کے چچ میں لوٹ لوٹ کر رہ رہی تھیں۔ اسی وقت
انہوں نے اپنے تئیں بیڑوں کو تار کرادیے تمہارے ابا اور بڑے چچا اس کلموں کی
موت پر بھانگے چلے آئے مگر تمہارے پیٹھے چچا نے سب کی عزت رکھ لی۔ انہوں
نے اس جہنم جلی کے موتے پر آنے سے انکار کر دیا۔“

”تمہاری دادی رد دھو کر چپ ہو گئیں مگر میری نظروں میں ان کی ذرا بھی
عزت نہ رہ گئی تھی۔ بس مجبور تھی جو خاموش رہی۔ تمہارے ابا اور بڑے چچا اس
گاؤں چلے گئے جہاں سلہ رہتی تھی اور جب تمہارے ابا واپس آئے تو اس کلمو ہے
مصدّر کو سینے سے لگالائے۔“

”سلہ کو مرے چالیس دن بھی نہ ہوئے تھے کہ تمہارے دادا سجدے کے
لئے جھکتے ہوئے اللہ کو پکار رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے گھر تباہ ہو گیا۔ تیوں بیڑوں نے اس
گاؤں میں رہنا پسند نہ کیا اور جاکیر کو کھڑے کھڑے ایک نواب کے ہاتھوں چچ کر
اپنی اپنی ملازمتوں پر واپس چلے گئے۔ اگر وہ جاکندہ ہوتی تو آج میں دادی کی جگہ
ملکہ بن کر بیٹھتی مگر نصیب میں تو یہ لکھا تھا۔ اب تمہاری دادی اپنے بڑے بیٹے

گدوں پر پڑی ایزیاں رگڑ رہی ہیں اور اس فساد کی جڑ کی اولاد میری چھاتی پر
مومک دل رہی ہے۔ ہائے!“

اماں جب بھی آپا کو یہ قصہ سنا تیں تو بڑے غور سے ان کی طرف دیکھتیں
اور آپا جیسے گھبرا کر ان سے نظریں پچا لیتیں۔ اماں آپا سے تو کچھ نہ کہتیں مگر اسے
سمجھانے لگتیں۔ ”میری جان تم اس کٹک کے ٹپکے کے پاس زیادہ نہ اٹھا بیٹھا کرو۔
اس کے باپ دادا نے میرا راج پات چھین لیا۔“

اماں کی اس نصیحت کا اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا تھا۔ اسے تو غصہ آتا کہ
جب مصدّر بھائی اتنے اچھے ہیں تو اماں ان سے کیوں ناراض رہتی ہیں۔

ایک دن تو وہ اماں کی شکایت بھی کرنا چاہتی تھی مگر جب مصدّر بھائی کے
پاس گئی تو کچھ نہ کر سکی۔ ”مصدّر بھائی آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔“ وہ ان کی
تشریف کرنے لگی۔

”مگر میں برا کسے لگتا ہوں؟“

”کسی کو بھی نہیں!“ اور وہ جلدی سے بھاگ آئی۔

جانے کون کبھی منزل کے دروازے کی زنجیر کھڑکھا رہا تھا۔ اس نے کلاف
سے منہ نکال کر دیکھا۔ کمرے میں گھور اندھرا چھایا ہوا تھا۔ چچی جان کی آواز سنائی
دے رہی تھی۔

”ان شاعروں کا برا ہو!“ اتنی سردی میں لوگ اپنے گھروں سے کب نکلتے
ہوں گے۔“

بادلوں کی گرج میں وہ اور کچھ نہ سن سکی۔

”اللہ!“ اس نے جیسے بے چینی سے کھوت بدلی۔ ”بہ! اگر نیند آتی
ہائے تو کیسا اچھا ہو۔“

”سب منہ بنائے بیٹھے رہتے ہیں آپا؟“ اس نے بڑے دکھ سے فریاد کی۔
 — ”میں تو لڑکیاں بھی نہیں جن کے ساتھ کھیلوں کو دوں تو جی بھل جائے۔“
 ”ارے بونتم اتنی بڑی ہو رہی ہو اور تم کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ جب گھر
 میں لڑائی ہو تو سب چپ رہتے ہیں۔ دوسری ماں اور ابا میں کھٹ پٹ ہو گئی
 ہے۔“ اس دن پہلی بار آپا اس کو بڑا سمجھ کر سنجیدگی سے باتیں کر رہی تھیں۔
 ”کیوں لڑائی ہوئی؟“

”بس یہی کہ اماں کو صفدر بھائی سے نفرت ہے، جب تک وہ اس گھر سے
 نہیں جاتے یہ لڑائیاں بھی نہیں ختم ہوتیں۔“

پھر کمرے کے پلکے سے اندھیرے میں آپا اسے اپنے پاس بٹھا کر سرگوشیاں
 کرنے لگیں۔ — ”جب تمہارے صفدر بھائی چوتھے درجے میں پڑتے تھے تو میں
 بالکل چھوٹی سی تھی مگر مجھے سب یاد ہے، ایک بار اماں نے ان کو بے حد مارا تھا۔
 جب ابا کو معلوم ہوا تو وہ اماں سے روٹھ کر ٹھاکر صاحب کے گھر چلے گئے تھے، پھر
 ٹھاکر صاحب نے بڑی مشکل سے ابا کو راضی کر کے گھر بھیجا تھا۔ بس اس وقت سے
 اماں صفدر بھائی سے اور بھی نفرت کرنے لگیں۔ کیسے بے شرم ہیں یہ تمہارے
 صفدر بھائی بھی جو یہاں سے جاتے نہیں، اب تو اس لائق بھی ہو چکے ہیں کہ کما
 کھائیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اماں کی ہدایت پر نوکرانی صفدر بھائی کو کمر میوں
 میں ددو وقت کا سزا ہو کھانا کھلائی تھی۔ چلو بھر دودھ میں دھیرو پانی ملا کر پینے کو
 دیجی اور گوشت پر کے میٹھیڑے کاٹ کر ان کے لئے قیدہ بنا دیجی۔ مگر صفدر بھائی
 نے کبھی ابا سے شکایت نہ کی۔ ایک دن خود ابا کو جانے کیا سوچھی کہ ان کا کھانا
 دیکھنے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد صفدر بھائی کو اپنے ساتھ کھانا کھلانے لگے۔ اس کے
 بعد بھی صفدر بھائی کی صحت خراب ہی رہی۔“

”ہے، میٹھیڑے تو کتوں کو کھاتے ہیں، وہ تھانا آیا ہمارا چھوٹا سا کتا، ٹامی،
 اسے بھی تو میٹھیڑے ابال کر دیئے جاتے تھے؟“ اس نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر آپا
 ایک دم سکے گئیں اور وہ حیران ہو کر رہ گئی۔

”تم صفدر بھائی سے زیادہ نہ بولا کرو۔“ آپا نے آنسو پونچھ کر جلدی سے کہا۔

صحن میں کیڑوں کی آرام کریاں کچھ مٹی تھیں۔ چھوٹی میز پر آپا کے ہاتھ کا
 کڑھا ہوا میز پوش پڑا تھا۔ ماما میز پر چائے کے برتن لگا رہی تھی اور اماں ایک
 سال بدایتیں دینے جا رہی تھیں۔

آپا مندی کے چھوٹے سے پودے پر پانی چھڑکنے کے بعد اماں کے پاس آ
 بیٹھیں۔ صفدر بھائی ابا کے پاس والی کرسی پر بیٹھے تھے۔ وہ ابا کے پاس کھڑی تھی۔
 مگر کوئی بھی تو اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ سب بیزار تھے۔ اس نے کئی بار ابا کے
 ہاتھ پر ہاتھ رکھا لیکن وہ صرف مسکرا کر رہ گئے۔ اماں صفدر بھائی کو گھور گھور کر
 دیکھ رہی تھیں۔

آپا نے اس طرح جلدی جلدی چائے پی جیسے کسی ضروری کام سے جا رہی
 ہوں۔ مگر اس کی چائے بڑی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ اس نے مارے غصے کے پانی کو
 ہاتھ بھی نہ لگایا۔ وہ کتنی سخت رنجیدہ ہو رہی تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی گھر ہے جہاں
 سب لوگ منہ بھلائے بیٹھے رہتے ہیں۔ کیسا اچھا ہو تاکہ وہ اس جگہ نہ آئی ہو تھی۔
 میںیں آکر تو اس نے سب کے چھوٹے ہوئے منہ دیکھے تھے۔ وہ نہ جانے اور کیا
 کیا سوچ کر سب سے ناراض ہو گئی تھی اور وہاں سے ہٹ کر مندی کی پتیاں نوچنے
 لگی۔

”تم چائے نہیں پیو گی بیٹی؟“ ابا نے پوچھا مگر وہ چپ رہ کر اپنی فنگل کا اظہار
 کر رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خوب زور سے ٹھٹھے۔ — ”نہیں پیجی، بلا
 سے ٹھنڈی ہو جائے، کسی کا چارہ ہے؟“

”کوڑا کیوں کر رہی ہو؟“ اماں نے سختی سے پوچھا اور وہ اٹھ کر آپا کے پیچھے
 ہوئی جو لمبے لمبے قدم رکھتی اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔

دور پھرنے لگیں۔

وہ آپا کی چہانت کی پروا کئے بغیر باہر آگئی۔ سب اسی طرح حیرا بیٹھے تھے اور کہیں بہت دور سے اذان کی آواز آرہی تھی۔

”صفر بھائی باہر گھومنے چلیں؟“ اس نے اماں کی طرف دیکھے بغیر کہا، مگر صفر بھائی بالکل خاموش رہے۔

”اب اسے اسکول میں داخل کرا دو تا ورنہ یوں ہی ماری ماری پھرے گی۔“ اماں نے تیرے لیے کہا۔

”معلوم کروں گا“ سنا ہے یہاں بس ایک ہی مشن ہائی اسکول ہے اور وہاں صرف انگریزی پڑھائی جاتی ہے یا پھر اپنے مذہب کی تبلیغ ہوتی ہے۔ انگریزوں کے ان اسکولوں کے تحت خلاف ہوں۔ یہ ہماری غلامی سے ہر طرح کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔“

”بات تو ساری یہ ہے کہ تم انگریزوں کے خلاف ہو، ان کی نوکری کرو گے مگر بنی کو ان کے اسکول میں نہیں پڑھاؤ گے، بس اس خاندان میں تو صرف تمہاری بہن اور بھانجا پڑھے گا، تمہاری ایک صاحبزادی دس دسے پڑھ کر گھر بیٹھ رہیں، انہیں خیر سے قسے کہناؤں کی دہائیات کہنا ہی دے دے کر تباہ کیا۔ اب دوسری کو انگریز دشمنی کے پردہ کر دو۔“ اماں ایک دم بھر گئیں۔

اس نے گھبرا کر صفر بھائی کی طرف دیکھا۔ وہی تو آپا کو کہنا ہی دیتے تھے۔ صفر بھائی جیسے بوکھلا کر اپنے کمرے کی طرف بھاگے اور اپنے کمرے کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس وقت کتے زخمی نظر آ رہے تھے۔

وہ لڑائی کے خوف سے باہر آگئی۔ بیٹھک کے سامنے والے چوڑے پردے پر دو آرام کرسیاں پڑی تھیں۔ وہ وہاں بیٹھ کر پاؤں ہلانے لگی۔ دو منٹوں کے مکان سے ہارمونیم پر گانے کی آواز آرہی تھی۔

کون گلی گیو شام، بتا دے کوئی

کاشی ڈھونڈا، بندرا ڈھونڈا

گوگل میں ہو گئی شام، بتا دے کوئی

کون گلی گیو شام، بتا دے کوئی

وہ چپکے چپکے بول دہرانے لگی۔ گانا بجانا اسے کتنا اچھا لگتا، مگر اماں کے ڈر سے کبھی گانے کا نام نہ لیا۔ وہ تو اماں کے منہ سے یہی سنتی رہی تھی کہ شریفوں کے گھر کی لڑکیاں نہیں گاتیں۔

چوڑے پردے پر بیٹھے بیٹھے شام کا اندھیرا چھانے لگا۔ مندروں سے گھنٹوں کی آواز آرہی تھی اور ڈھیروں پرند بھیرا لینے کے لئے درختوں میں شور مچا رہے تھے۔ مانے کبھی سڑک پر گھبراہٹ کا ریوڑ دھول اڑاتا مگر رہا تھا۔ وہ انہیں سننے لگی مگر نہ لگا۔ گھر میں لڑائی دیکھ کر وہ سختی رنجیدہ ہو گئی تھی۔

”اندر چلو، بڑا رات ہو رہی ہے۔“ جب صفر بھائی نے آکر اسے اٹھایا تو وہ ان سے لپٹ کر رونے لگی

”جب تم اسکول میں داخل ہو جاؤ گی تو دل بہل جائے گا۔“ صفر بھائی نے اس طرح اسے سینے سے لگایا تھا۔ جیسے مارے ماتا کے تڑپ رہے ہوں۔

ماما لالین ہاتھ میں لئے جانے ادھر سے ادھر کیا کرتی پھر رہی تھی۔ ابا اور اماں اسی طرح حیرا بیٹھے تھے۔

”مکھو آئیں؟“ اماں نے سختی سے سوال کیا اور اس کے جواب کا انتظار نہ بغیر ابا سے مخاطب ہو گئیں۔ ”میں کہتی ہوں کہ اسے فوراً اسکول میں داخل لڑاؤ۔ مجھے تو اپنی اسی لڑکی پر ارمان پورے کرنے ہیں۔ تمہارے ارمان تو بہن اور بھانجے پر پورے ہو گئے۔“

”صفر میاں تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“ ابا نے نرمی سے کہا اور جب صفر بھائی اپنے کمرے میں چلے گئے تو ابا ایک دم سخت ہو گئے۔ ”مجھے مشن لوگوں سے نفرت ہے، میں اسے نہیں پڑھاؤں گا، بے شک جاہل رہے۔“

”یہ تو میں دیکھوں گی کہ جاہل رہے گی یا پڑھے گی، تم کو تو اللہ واسطے کا بھر پور انگریزوں سے، جس تھاں میں کھاؤ اسی میں چھید کرو۔“ اماں کی آواز میں اس کا لفظ تھا کہ ابا کرسی سے اچھل پڑے۔

”میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے میری اجازت کے بغیر اپنے

بھائی کے پاس میرے روپے کیوں رکھائے؟ میں تو اپنے بچوں سے مجبور ہو کر نوکر کم کر رہا ہوں۔ اگر تم نے وہ روپے غائب نہ کئے ہوتے تو میں ان سے کوئی تجارت کم لیتا۔

”کون سے روپے؟“ اماں جیسے بلہلا اٹھیں۔

”وہی جو زمین بیچنے کے بعد میرے حصے میں آئے تھے؟“

”خوب! وہ روپے تو عالیہ اور تمینہ کے لئے ہیں، یہاں کیوں رکھتی؟ اسی لئے تاکہ تمہاری بہن اور بھانجے کے کام آجائے۔ میں اب ایسی بدھو نہیں ہوں۔“ اماں ہنسیں۔

”میں تمہارے بھائی پر دعویٰ کر دوں گا۔“

”جانتے ہو میرے بھائی کی بیوی انگریز ہے۔“ اماں نے بڑے غرور سے سر اونچا کر لیا۔

”وہ تو میں جانتا ہوں، تمہارے بھائی بچارے یوں ہی پھرتے تھے، انگریز بیوی لاکڑ تو بڑا عمدہ ملا ہے۔“ ابا اس طرح بات کر رہے تھے جیسے گالی دے رہے ہوں۔

”تم کو نوکری کرتے بارہ پندرہ سال ہو گئے مگر بڑا عمدہ نہ ملا، اس لئے اب جلوے نہیں تو اور کیا کرو گے۔“ اماں نے حقارت سے جواب دیا۔

”فؤہ!“ ابا نے سخت ہنسی سے منہ پھیر لیا اور پھر دالان کے کونے میں کھڑی ہوئی چھڑی اٹھا کر باہر چلے گئے۔ اماں دوپٹے کا پلو منہ پر ڈال کر دھیرے دھیرے رونے لگیں۔ آپا آکر انہیں سمجھانے لگیں تو انہوں نے آنسو پونچھ لئے۔

”میں نے وہ روپے تم دونوں بہنوں کے لئے بیع کرائے ہیں ورنہ صفر اور نغمہ پر اڑ جاتے۔“ اماں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور لمبی آہیں بھرنے لگیں۔

اس وقت اسے محسوس ہو رہا تھا کہ صفر بھائی بھوت ہیں جو سب کچھ کھا جائیں گے، اماں کے لئے اس کا جی تڑپ اٹھا تھا۔ یہی چاہتی تھی جا کر اماں کے لپٹ جائے مگر مارے گھبراہٹ کے اپنے گھبر پر لیٹ گئی۔

پورا چاند ابھر چکا تھا۔ ہارمونیم پر گانے کی مدھم مدھم آواز آرہی تھی۔

جو میں جانتی پچھڑت ہو یا گھونگٹ میں آگ لگا دیتی

وہ گیت سنتے سنتے سو گئی۔ سوتے میں ایک بار اس نے محسوس کیا کہ کوئی

اسے اغوا رہا ہے مگر وہ نہ اٹھی۔ جانے رات سب نے کھانا بھی کھایا تھا کہ نہیں۔

اماں کو کسم دیدی سے ذرا بھی بد روی نہ تھی حالانکہ انہوں نے دوسری ہی ملاقات پر اپنی ساری چٹا کر خالی تھی۔۔۔ میں تو اس وقت چودہ چندرہ سال کی تھی۔ شادی کو صرف تین مہینے ہوئے تھے، ”وہ“ ان دنوں امرت سر میں بدلی ہو کر گئے تھے۔ جس دن وہ جلیاں والا بارگ کے چلے میں شریک ہونے گئے تو اس سر نے جیبرا روکا مگر وہ ان کی باتوں پر ہنسنے رہے۔ میں اپنے ساس سر کی باتیں سن سن کر باگھل ہوئی جا رہی تھی پر مارے لاج کے کچھ نہ کہہ سکی۔ گھوگھٹ کے اندر سے ان کے اٹھتے ہوئے پاؤں دیکھتی رہی۔ وہ تو کہتے تھے کہ مجھے تم سے بڑی محبت ہے پر جاتے سے میرے دل کی مرضی نہ پوچھی۔ وہ ہنسنے ہوئے چلے گئے اور پھر کبھی نہ مڑے۔ میں ان کی راہ تک تک کر تھک گئی۔ مجھے بیوہ جان کر سب میرے سامنے سے بچتے ہیں۔ پر جانے کیا بات ہے کہ میں آج تک اپنے کو بیوہ نہیں سمجھتی۔ میں بیوہ ہوں موسیٰ؟“ کسم دیدی نے اماں کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا اور پھر جانے کیوں چھت تنکے لگی تھیں۔ اماں نے اپنے سامنے ہانداں کیسٹ لیا تھا اور وہ جانے کیوں اس وقت کسم دیدی کے لپٹ گئی تھی۔

”کسم دیدی گڑ کھاتی ہی نہیں جو پھوڑیں گی“ انہیں گڑ سے نفرت ہے۔“ وہ غصے سے بچ پڑی تھی اور اماں کھل کھلا کر ہنس دیں۔ اس دن اس نے آپا سے بات بھی نہ کی تھی۔ ”ایسی خاموشی کس کام کی کہ اپنی سیلی کی طرف سے بولتی تک نہیں۔ بڑی آپا ہیں کیس کی“ — وہ چپکے چپکے بڑبڑاتی رہی۔

اس روز شام کو زور سے آندھی چلی اور بادل گھر کر آجئے شاید جون کے آخری دن تھے۔ ساری رات بادل چھائے رہے اور کسی کسی وقت ہلکی سی بارش ہو جاتی اماں اور ابا کرے میں سو رہے تھے۔ وہ آپا کے ساتھ برآمدے میں سو رہی تھی۔ کسی وقت ہوا تیز ہوتی تو بوجھار پالنتی تک آتی اور اس کی آنکھ کھل جاتی مگر ایب بار جو اس کی آنکھ کھلی تو آپا اپنے بستہ پر نہ تھیں۔ بادل دھیرے دھیرے دھمک رہے تھے۔ اسے ڈر لگا مگر آپا چند ہی منٹ میں آنکھیں پر وہ اکیلی نہ تھیں، صغدر بھائی بھی ساتھ تھے۔ اسے سخت حیرت ہوئی کہ کیا آپا راتوں کو صغدر بھائی سے بات کرتی ہیں۔ کیا وہ اماں سے اتنا ڈرتی ہیں۔

آپا بلیوں جیسی چال سے آئیں اور جب اپنے بستہ پر لیٹنے لگیں تو صغدر بھائی نے انہیں لپٹا لیا۔ پھر ان کے چہرے پر ہنسنے لگے۔ اس نے مارے حیرت کے سانس تک روک لی تھی۔ سلمہ پھوپھی کی کمانی اسے یاد آ رہی تھی۔ اس وقت اس کے تین عجیب سے احساسات ہو رہے تھے۔

صبح جب آپا اسے اسکول جانے کے لئے تیار کر رہی تھیں تو اس نے دھیرے سے پوچھا تھا — ”آپا رات تم کہاں چلی گئی تھیں؟“

”ایں!“ مارے خوف کے آپا کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔

”میں کوئی اماں سے تھوڑی کھوں گی، میں کسی سے نہیں کھوں گی۔“ اس نے پوری عورتوں کی طرح آپا کو تسلی دی تو انہوں نے اسے لپٹا لیا۔ ان کا سارا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔

”اگر تم نے اماں سے کہہ دیا تو وہ جانے کیا کریں گی۔ سلمہ پھوپھی کے

ساتھ بھی جو کچھ نہ ہوا ہوگا، بڑا ہمارے صفدر بھائی مجھے اچھے لگتے ہیں، بس اتنی سی بات ہے۔“

”وہ خود مجھے اچھے لگتے ہیں، میں بھلا اماں سے کہہ سکتی ہوں، کہیں اماں بھی انہیں چڑاسی سے جوتے۔“

آپا نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ان کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ ”میں ان کو یہاں سے بھگا دوں گی۔“

”یہ بات ٹھیک ہے۔“

والان میں صفدر بھائی کھڑے تھے، وہ ان کے ساتھ اسکول چلی گئی مگر وہاں بھی اس کا جی نہ لگا۔ صفدر بھائی کہتے تھے کہ اسکول جا کر جی بھل جائے گا، مگر وہ تو بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ ہر بات کا اس کے دماغ پر اثر ہوتا۔ رات کا قصہ بار بار یاد آتا اور وہ انجام کے خوف سے ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکتی تھی۔

اس دن اسکول کی نگران نے گھر آنے کو کہا تھا۔ اماں اور اپا سارا دن ٹھہر جاتی رہیں۔ دیواروں میں سٹے ہوئے کھڑکی کے جالے تک صاف کیے گئے۔ صفدر بھائی گیندے اور گل عباسی کے پھول لے آئے جو نیلے گلدانوں میں سجا دیئے گئے۔ ماما نے باٹلیاں بھر بھر کر صحن دھویا اور وہاں مندی کے پودے کے پاس آرام کرسیاں اور میز بچھا دی گئی۔ میز پر آپا کے ہاتھوں کا کڑھا ہوا سب سے خوب صورت میز پوش بچھایا گیا۔ چائے کے لئے نیا جاپانی سٹ ٹکالا گیا۔ وہ سٹ اسی وقت نکالا جاتا جب خاص قسم کے مسمان آتے۔ چائے کے ساتھ کھانے کو کئی چیزیں ملی گئیں۔ اماں اس دن بے حد خوش اور مصروف نظر آ رہی تھیں۔ دوپہر میں انہوں نے نہ خود آرام کیا نہ ماما کو کمر لگانے دی۔

”بھئی حد ہے، انگریز ہو کر خود ہمارے گھر آنے کو کہا۔“ اماں بار بار آپا سے کہتی اور کھلی جاتیں۔

اماں کی اس بات پر اس نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ صفدر بھائی اپنی طراوت روکنے کے لئے، ہونٹ بھیجھ لیتے ہیں۔

”میرا خیال ہے کہ زیادہ لوگوں کو چائے پر نہ شریک ہونا چاہئے، وہ انگریز شاید اسے پسند نہ کرے۔“ چار بیٹھے میں جب تھوڑی سی دیر رہ گئی تو اماں نے تیری پر بل ڈال کر اپنے حساب بڑی عام سی بات کی اور صفدر بھائی اسی وقت اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ٹھیک چار بجے مسز ہارڈ آگئیں۔ اماں اور آپا نے ان کا خیر مقدم کیا۔ مسز ہارڈ نے نیلی کالج کی گلیوں جیسی آنکھیں گھوم گھوم کر گھر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ اپنی پڑھنے ہی جلدی جلدی بولنے لگیں۔

اماں اس سے بڑا اور کیا بہانہ کر سکتی تھیں۔ ایک انگریز عورت کے ساتھ
ہائے نہ بیٹھنے کی کوئی بڑی وجہ ہی ہو سکتی تھی۔

صفر بھائی اپنے کمرے میں اونٹن منہ پڑے تھے۔ وہ جانے اس وقت کیا
 سوچ رہے تھے۔ کمرے کے اندر کتنی جلدی شام ہو جاتی ہے، ان کے کمرے میں

سزہ وارڈ کے جاتے ہی اماں جیسے بھٹا انھیں۔ ”دیکھا، چائے پر نہیں آتا۔ وہ تو کوئی مجھے اچھا ماں یاد آگیا ورنہ کیا سمجھتیں سزہ وارڈ، دیکھ لیتا یہ اپنی نظر نہ کے پیچھے کچھ کر کے رہیں گے۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ انگریز سے زیادہ اچھا حکمران کون ہوگا۔ اپنے لوگ تو ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہتے ہیں ارے کون سمجھائے اس شخص کو؟“

”کوئی کام لگ گیا ہوگا۔“ آپا نے ابا کی صفائی پیش کی۔

”کام؟“ اماں بھرا انھیں۔ ”کوئی کام نہیں ہوگا۔ ارے وہ شخص۔“

اماں جانے اور کیا کچھ کہتی رہی۔ وہ جلدی سے صفد بھائی کے پاس چلی گئی۔ چائے کی پیالی اسی طرح میز پر رکھے رکھے غصہ ہی ہو گئی تھی۔ صفد بھائی لائین کی چیلی چیلی روشنی میں عجیب سے لگ رہے تھے۔

”صفد بھائی آپ نے چائے نہیں پی؟“

”ارے تو کیا میں نے نہیں پی۔“ وہ پیالی اٹھا کر پیانی کی طرح پی گئے۔

”میں نہیں بولتی آپ سے، اب پی ہے تو کیا؟“ وہ کمرے سے نکل رہی تھی تو صفد بھائی پکار رہے تھے مگر اس نے جواب تک نہ دیا۔

جب کافی اندھرا ہو گیا تو اماں نے میز کرسیاں ہٹا کر بیگ بچا دیئے۔ اماں تھکن سے چور رہی تھیں اور ایفون کے نشے سے آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ ان کے ہر مرض کا علاج صرف ایفون سے ہوتا تھا۔ ننھی سی کالی گولی نگلتے ہی وہ سارے دن کی دردور پھٹ پھٹ بھول جاتیں۔ تھکن غائب ہو جاتی اور وہ ملکہ جیسی شان سے سو جاتیں۔

اماں بستر لگا کر باورچی خانے میں گئیں تو ابا آگئے۔ اماں انھیں دیکھتے ہی بکھر گئیں۔ اب آئے ہیں خان صاحب، کیا وہ نہ سمجھتی ہوں گی کہ آپ کو ان کا آنا برا لگا، حد یہ وہ انگریز ہو کر ہمارے گھر آئے اور صاحب بھادر پروا بھی نہ کریں۔ اگر وہ رپورٹ کر دے کہ جناب نے اس سے بدسلوکی کی ہے تو پھر ہوش ٹھیک ہو جائیں گے۔“ اماں نے اتنے زور سے پانڈان بند کیا کہ اماں گھبرا کر باورچی خانے

نے باہر نکل آئیں۔

”اب وہ زمانے لہ گئے جب تمہارے انگریز کے نام سے تقرری چھٹی تھی،“ وہ دسری بات ہے کہ میں کچھ نہ رسکوں تو کیا نفرت بھی نہیں کر سکتا۔“ ابا نے غصے سے کہا۔ ”یہ بدینیت تاجر، یہ حکمران کیا؟ مجھے تو ان کی ساری قوم سے نفرت ہے۔ اگر میرا دماغ بوڑھے بھائی جیسا ہوتا تو پھر دیکھتا، مگر میں تو بندھا ہوا ہوں، نوکری کرنے پر مجبور ہوں۔“

”ہوں! وہ تو میں جانتی ہوں کہ تم ہر وقت سب کو بھوکا مارنے پر تلتے ہوئے“

”یہی تو وجہ ہے کہ نوکری کر رہا ہوں ورنہ میں تو بوڑھے بھائی کی طرح وکان کر کے بیٹھ جاتا مگر تم تو سب کچھ اپنے بھائی کے پاس رکھ آئیں، وہ پروا دیا نہ دار آدمی ہے، اس کی بیوی انگریز ہے۔“

”میں نے دس دفعہ کہا کہ میرے بھائی بھادج کا نام مت لیا کرو۔“ اماں ایک دم سسکیاں بھر بھر کر رونے لگیں۔

آپا بڑی خاموشی سے چنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں، ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میلی لمبی چاندنی میں ان کے آنسو تکتے دردناک معلوم ہو رہے تھے۔

”سب روؤ، سب لڑو، وہ گھر سے بھاگ جائے گی۔“ اس نے بڑے ہڑصوں کی طرح سوچا تھا۔ لڑائی اور آنسو اس کی روح میں لرز رہے تھے۔ وہ اپنے بستر پر اوندھی لیٹ گئی اور زور زور سے سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

”دیکھو بیگم، ان بچوں پر کیا اثر پڑ رہا ہے، یہ سب تباہ ہو جائیں گے اور۔“ ابا کپڑے تبدیل کرنے کے لئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اماں نے آنسو پونچھ لئے۔

”اماں کھانے آؤ، عالیہ سو نہ جائے۔“ اماں نے آواز دی۔

”میں نہیں کھاؤں گی۔ وہ زور سے چچی اور پھر رونے لگی۔

کھانا آیا تو اس نے ابا کے نرم نرم ہتھیلیوں والے ہاتھ اپنی پیشانی پر

محسوس کئے، مگر وہ سوتی بن گئی، وہ تو اس دن اعلانیہ سب سے روٹھ گئی تھی۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ مگر کی نفاد صوب چھاؤں کی طرح بدلتی رہتی۔ اکی شامیں بیٹھک میں گزرتیں، دوستوں کے ٹکٹھ میں وہ زور زور سے باتیں کرتے۔ ماما چائے بنا کر باہر لے جاتے ہوئے چپکے چپکے بڑبڑاتی رہتیں اور اماں جیسے بوئے اضطراب کے ساتھ ادھر ادھر پھرتی رہتیں یا کسی کئے ہوئے کام کو پھر سے کرنے لگتیں۔ آپا بدستور خاموش رہتیں اور کسی کتاب کے ایک ہی صفحے کو پڑھنے چلی جاتیں۔

خدا جانے آپا اتنا کم کیوں بولتی تھیں۔ کیا محبت لوگوں کو گونگا بنا دیتی ہے؟ کیا محبت کا نام الفاظ کی موت ہوتا ہے؟ پھر لوگ اتنی گھٹیا چیز کے پیچھے کیوں بھاگتے ہیں؟ آپا تم کتنی مصوم تھیں۔

گھر کے اس دردناک ماحول سے گھبرا کر وہ بیٹھک کے دروازے پر جا کھڑی ہوتی۔ نسو، جناح، گاندھی وغیرہ کے سنے ہوئے ناموں کے علاوہ اس کی سمجھ میں صرف اتنا ہی آتا کہ سب انگریزوں کی برائی کر رہے ہیں۔ اسے کوئی بھی مزے کی بات نہ سنائی دیتی۔ اس پر ابا اسے دیکھتے ہی اندر جانے کا حکم دیتے۔ صفدر بھائی اس کے آنکھوں آنکھوں میں کئے ہوئے اشارے سمجھنے سے انکار کر دیتے۔ وہ بھی تو شام کے وقت بیٹھک سے اٹھنے کا نام نہ لیتے تھے۔

وہ رنجیدہ ہو کر باہر چوتڑے پر جا بیٹھتی اور اسے اپنی پہلی جگہ یاد آئے لگتی۔ کتنی دور رہ گئی تھی وہ جگہ، وہاں سے آتے ہوئے ٹرین کی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر اس نے اتنے درخت گئے تھے کہ سارے حساب سے دم توڑ دیا تھا۔

بیٹھک کا مہینہ تھا۔ لوچاتی رہتی۔ آموں اور پٹیل کے درختوں میں چھپے ہوئے پرند سارا دن شور مچاتے رہتے۔ مہن میں لگا ہوا مہندی کا چھوٹا سا پودا سوکھ چلا تھا۔ ماما لاکھ پانی ڈالتیں مگر اس کی پتیوں پر رونق نہ آتی۔ چاندنی راتوں میں ٹھاکر صاحب کے گھر سے کسم دیدی کے بار مومین پر گانے کی آواز آتی تو آپا اٹھ کر ٹٹلنے لگتیں۔ کسم دیدی ان دنوں ایک ہی گیت کو رنے جاتیں۔

اماں ابا کے انتظار سے ٹھک کر آپا سے باتیں شروع کر دیتیں، وہی صفدر

لے خاندان سے دشمنی کی داستانیں، نجد بھیجی کی خود غرضی کے قصے، بھائی اور بھادج کے محبت بھرے گیت۔ آپا پلکیں جھپکا جھپکا کر سب کچھ سنیں مگر خود کچھ نہ کہیں۔ ابا کی بیٹھک جب سوتی ہوتی تو وہ کسی دوست کے گھر چلے جاتے اور دس گیارہ سے پہلے واپس نہ آتے۔

رات سونے سے پہلے وہ صفدر بھائی کے پاس چلی جاتی۔ باہر چوتڑے پر ان کا پنگ بچھا ہوتا جہاں وہ خاموش پڑے کچھ سوچتے رہتے۔

"صفدر بھائی کمانی بنائے۔" وہ جاتے ہی فرمائش کرتی اور ان کی کمر سے 'لب لگا کر بیٹھ جاتی۔ صفدر بھائی اپنے بچپن میں سنی ہوئی کمانیاں یاد کرنے لگتے اور :ب کمانی یاد آ جاتی تو زور سے ہنستے۔ وہ بیٹھ ایک شتراوی اور ایک غریب آدمی تے کمانی شروع کرتے تھے اور غریب آدمی شتراوی کو نہ پا سکتے کے غم میں بیٹھ مر جاتا تھا۔

"صفدر بھائی آپ تو کسی شتراوی سے شادی نہیں کریں گے؟" ایک بار اس نے بڑی فکر سے پوچھا تھا۔

"لا حول ولا ی" میں کیوں مروں گا بنو۔" وہ اس قدر بے تھے کہ وہ چکر رہ گئی تھی۔ گرمیوں کی چٹیاں گزرتی جا رہی تھیں۔ وہ خوش تھی کہ اسکول کھلنے کے دن قریب آ رہے ہیں۔ جتنا وقت اسکول میں گزرا وہ خوش رہتی، ساری دنیا کو بھول جاتی۔

اس دن دوپہر میں جب وہ سو رہی تھی تو اماں کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز نے اسے جگا دیا تھا۔ ابا کی آواز مدھم مگر جھلائی ہوئی تھی۔ وہ گھبرا کر اماں میں آگئی جہاں آپا پہلے سے کھڑکی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر بات کیا ہے۔

ذرا دیر بعد باہر سے رائے صاحب کی آواز آئی اور ابا باہر چلے گئے۔ آپا ابا نے جانے سے پہلے ہی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"اس گھر میں صفدر دولہا بن کر اسی وقت آئے گا" جب میری لاش نکل جائے گی۔" ابا نے جاتے جاتے اماں کی بات ایک لمحے کو رک کر سنی اور پھر چلے

ابا جیسے ہی بینک میں گئے، اماں نے آکر آپا کو لپٹا لیا۔

”دیکھ لیتا میں زہر کھالوں گی، وہ تم کو اس کینے مسافر کے ساتھ بیاہنے کا سوچ رہے ہیں، ہائے ان کا تو داغ خراب ہو گیا ہے، یہ اس شخص سے شادی کرچ گئے جس کے باپ دادا نے خاندانی عزت لوٹ لی، میرا راج پاٹ جھین لیا۔“ اماں روتے روتے پٹنگ پر بیٹھ نکلیں۔ ”اب اس کینے کو بی اے کرنے کے لئے علی گڑھ بھیج رہے ہیں۔ میں آج ہی تمہارے ماموں کو خط لکھوں گی، پھر دیکھوں گی کہ سب کچھ کیسے ہوتا ہے۔“

وہ ڈر گئی کہ ماموں میاں جانے کیا کریں گے، مگر پھر یہ سوچ کر اسے کچھ تسلی ہوئی کہ اماں تو بیٹھ ہی ماموں میاں کو خط لکھا کرتی ہیں مگر وہ دو تین مہینے بعد ہی جواب دیتے ہیں۔

”تمہاری دادی بے شرم تھیں جو مسافر کے باپ کو داماد بنا کر اب تک زندہ بیٹھی ہیں، میں تو اسی وقت زہر کھالوں گی۔“

”آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں، کچھ بھی نہ ہو گا۔“ آپا جیسے کنوئیں کی تہ سے بولیں، ان کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔

”اے ہمارے آسانی باپ تو ہمارے گھر سے لڑائیاں ختم کرا دے! مسافر بھائی کے کمرے میں جاتے ہوئے وہ چپکے چپکے دعا کر رہی تھیں۔ مس مری کی یاد کرائی ہوئی یہ دعا اسے بہت سے دکھوں سے نجات دلا دیتی تھی۔

کمرے میں جا کر دیکھا کہ وہاں تو مسافر بھائی بھی رو رہے تھے۔ کچھ نہیں کرتا یہ آسانی باپ بھی، وہ آسانی باپ سے بھی روٹھ گئی تھی اور روتے روتے مسافر بھائی سے لپٹ گئی۔

”سب رو رہے ہیں، اللہ کرے میں مرجاؤں۔“ وہ بہت سنجیدہ ہو رہی تھی۔ ”ارے میں تو علی گڑھ جا رہا ہوں تا، اس لئے رو رہا ہوں، مجھے اپنی عالیہ بنو یاد آئے گی۔“ انہوں نے ہستے ہوئے آنسو پونچھ لئے۔ ”تم دس گیارہ سال کی ہو کر کتنی بڑی ہو گئی ہو۔“ انہوں نے قہقہہ لگایا۔

”مجھے معلوم ہے سب جھوٹ بول رہے ہیں۔“

مسافر بھائی صرف ایک ہفتے بعد علی گڑھ جا رہے تھے۔

ایک ہفتہ ماہ پوس کے سورج کی طرح جلدی جلدی ڈوبا جا رہا تھا اور وہ بیٹے ہونے دنوں کو انگلیوں پر کتنی رہ جاتی۔ وہ کتنی رنجیدہ رہنے لگی تھی۔ اسے یقین تھا کہ آپا کے بعد صرف مسافر بھائی اس کا خیال کرتے ہیں۔ آپا خاموشی سے محبت کرتی ہیں، مگر مسافر بھائی تو اس کے ساتھی ہیں جن سے وہ کھیلتی ہے، کمائیاں سنتی ہے۔ وہ چلے جائیں گے تو پھر وہ کیا کرے گی؟

مسافر بھائی نے یہ دن اپنے کمرے میں بند ہو کر گزار دیے۔ ان دنوں امان پر بادل چھانے لگے تھے۔ بھگی بھگی ہوائیں چلتی رہتیں۔

امان نے مسافر بھائی کی صورت دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ ابا نے اماں سے بات کرنی چھوڑ دی تھی۔ وہ دس گیارہ بجے رات تک انگریز دشمنی کے زبانی اظہار میں مصروف رہے۔ آپا کا مطالعہ بہت ترقی کر گیا تھا۔ وہ جو کچھ پڑھتیں، اسے حفظ کرنے لگی تھیں۔ گھنٹوں گزر جاتے مگر صفحہ الٹنے کی نوبت نہ آتی۔

وہ گھر کے ماحول سے گھبرا کر باہر چوتڑے پر جا بیٹھتی جہاں چھپا سکیں۔ ان کی پیا کرتا۔ وہ چچا اسی سے باتیں کرنے لگتی۔

”تمہاری کتنی تنخواہ ہے؟“

”چند روپے۔“

”تم نے اپنا گھرانہ ان کیوں نہیں بنایا؟“

”ہم غریب ہو جیں بیٹا، کچھ گھریٹا کر لوگوں کی برابری توڑی کر سکتے ہیں۔“

اسے ایک دم مسافر بھائی کے ابا یاد آ جاتے جو بیٹے جی کسی سے عزت نہ کرا لے۔ اسے وہ ساری کمائی یاد آنے لگتی جو کتنی بار آپا کو سنائی تھی۔ اس کا کلیجہ دھمکتا تو وہ اٹھ کر مسافر بھائی کے پاس چلی جاتی مگر وہ تو انا، دنوں بات کرتا بھول گئے تھے۔

دوسرے دن صبح مسافر بھائی علی گڑھ جا رہے تھے۔ ان کا سامان بندھا کر رکھا تھا۔ کمرہ بالکل اجاڑ معلوم ہو رہا تھا۔ اماں اس دن بڑی بیٹائی سے سارے گھر میں

حلقی رہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ماما کو ڈانٹیں اور آپ ہی آپ بیڑا تکی رہیں۔“ ام سے نکالنے کی بجائے اسے پڑھنے کو بھیجا جا رہا ہے، اس مردود کو ہماری دولت سے پڑھا کر ہمارے سر پر بٹھانا چاہتے ہیں، اللہ اسے واپسی نصیب نہ کرے!“

شام کو ابا صفدر بھائی کے کمرے میں گئے اور بڑی دیر بعد باہر نکلے، پھر بیٹھک میں چلے گئے۔ اتنی دیر اماں تلملائی تلملائی پھرتی رہیں۔

دن گزرتے گئے، صفدر بھائی کی یاد دہم پڑنے لگی۔ اسکول سے آکر وہ کسم دیدی کے گھر چلی جاتی اور وہاں ہارمونیم پر ”کون گلی گیو سورے شام“ کی مشق لاتی رہتی۔ وہ ان کے گھر میں کتنی خوش رہتی۔ اسے اپنے گھر کی فضا اس نہ آتی۔ اماں اب بھی ہر وقت فکر مند اور پھرتی ہوئی نظر آتیں، آپا اسی طرح یا تو کتاب کے ایک ہی صفحے پر نظریں گاڑے پڑی رہتیں یا پھر نظریں جھکائے کسی نہ کسی کام میں اماں کا ہاتھ بٹاتی رہتیں۔ اس نے جی میں فیصلہ کر لیا کہ صفدر بھائی کے علاوہ بھی یہاں کچھ گڑ بڑ ہے۔

صفدر بھائی کے کمرے میں بڑا سخت ڈال دیا گیا تھا جس پر سفید چاندنی پٹی ہوئی تھی۔ کھانے کے لئے اسی پر دسترخوان بچ جاتا۔ جب سے صفدر بھائی نے کمرے میں کھانا شروع ہوا تھا۔ آپا کی خوراک بہت کم ہو گئی تھی۔

صفدر بھائی نے علی گڑھ جا کر صرف ایک خط لکھا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے کوئی خط نہ لکھا، اپانے منی آرڈر سے روپے پیسے تو وہ بھی واپس کر دیئے تھے۔ اس روز ابا بہت رنجیدہ تھے مگر اماں بے حد خوش نظر آ رہی تھیں۔ وہ بڑے فخر سے ہنس رہی تھیں اور ابا نظریں چرا رہے تھے۔

”وہ جانتا ہے کہ تم انہی روپوں کی وجہ سے اس سے نفرت کرتی ہو۔“ آخر ابا کو بولنا ہی پڑا۔

اماں مارے غصے کے بکھر گئیں۔ ”تو کیا میں اس بچ کسان کے بیٹے کو پیٹنے سے لگائے رکھتی، کیا ہماری اولاد نہیں جو اس پر دولت خرچ کی جائے، وہ امان فراموش کینہ، اس نے روپے واپس کر کے ہمارے منہ پر مارے ہیں۔ اسے اب تمہاری ضرورت ہی کیا ہے، بی، اسے کرے گا تو عیش کرے گا۔ بچ کما

حلقی رہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ماما کو ڈانٹیں اور آپ ہی آپ بیڑا تکی رہیں۔“ ام سے نکالنے کی بجائے اسے پڑھنے کو بھیجا جا رہا ہے، اس مردود کو ہماری دولت سے پڑھا کر ہمارے سر پر بٹھانا چاہتے ہیں، اللہ اسے واپسی نصیب نہ کرے!“

شام کو ابا صفدر بھائی کے کمرے میں گئے اور بڑی دیر بعد باہر نکلے، پھر بیٹھک میں چلے گئے۔ اتنی دیر اماں تلملائی تلملائی پھرتی رہیں۔

وہ رات بڑی اندھیری تھی۔ آندھی بارش کے آثار تھے۔ اس رات والان میں بستر لگائے گئے تھے۔ کھانے کے بعد سب لوگ لیٹ گئے۔ بڑے طاق میں رکھی ہوئی لائٹیں کی بجلی بجتی کر دی گئی۔

سوئے سے پہلے اس نے بڑے استہکاک سے دعا کی تھی کہ آسانی باپ صفدر بھائی کو روک لے اور صبح بھیجی نہ ہو۔ اس دعا کے بعد وہ سو گئی تھی۔

صبح کے خوف نے ایک بار اس کی آنکھ کھول دی تھی۔ اس نے دیکھا کہ آصفدر بھائی کے کمرے کی طرف سے دبے قدموں آ رہی ہیں۔ پھر وہ اپنے بستر پر لیٹ گئیں، اس نے ان کی دھیمی سی سسکی کی آواز سنی اور پھر سو گئی۔

صفدر بھائی صبح تازے پر بیٹھ کر چلے گئے۔ جانے سے پہلے وہ اماں کے پاس آئے تھے۔ ذرا دیر کھڑے رہے مگر جب اماں نے ان کی طرف دیکھا تب تک نہیں تویا، کی دعائیں لیتے چلے گئے۔

وہ دروازے تک ان کے ساتھ گئی مگر جب آنکھ کھلی مڑک پر دھول اڑاتا چل دیا تو وہ ابا کی ٹانگوں سے لپٹ کر رونے لگی۔ وہ پہلا موقع تھا کہ وہ ابا کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی اور وہ سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے ورنہ ابا کو فرصت ہی کبیا ملتی جو کسی سے محبت کا اظہار کرتے۔

دوپہر کسم دیدی آگئیں جو چپکے چپکے آپا سے باتیں کرتی رہیں۔ شام کو چائے کے بعد ابا نے اماں سے پورے ہفتے کے بعد بات کی تھی۔

”جب وہ بی اے کر لے گا تو وہ کام ضرور ہوگا، سمجھ گئیں؟“

”ہم بھی دیکھیں گے۔“ اماں کی آواز میں چیلنج تھا۔

ہے کسی نے، اصل سے خطائیں کم اصل سے وفا نہیں۔“

”میری بہن کا بیٹا کم اصل ہے اور تمہارے بھائی کی بیوی، پتہ نہیں کس بھتیگی کی اولاد ہوگی۔ تمہارے بھائی نے اس سے شادی کر کے تمہاری قوم کے منہ پر تھنڑ مارا ہے، خدا کی شان ہے اگر یہ بھتیگی بھی ہمارے حکمران ہیں۔“

”میرے بھائی بھادج کو کچھ کہا تو اچھا نہ ہوگا، وہ تم کو جانتی ہے نا اسی لئے منہ نہیں لگاتی، میری وجہ سے چپ رہتی ہے ورنہ کب کا تم کو جیل بھجوا دیتی۔“

اماں کی آواز بھرا رہی تھی۔

”وہ بھتیگی مجھے جیل بھجوا دیتی؟“ ابا غصے سے جھنجھکا۔

اماں زور زور سے رونے لگیں۔ آپا کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں ہلک رہی تھی۔ وہ بھتیگی بڑی ہوتی جاتی اتنی ہی حساس۔ اسے ابا سے شدید محبت ہوتی جاری تھی اور اماں کی مجھڑا لطیفیت سے بیزاری ہو جتی جاتی مگر جب اماں کو روتے دیکھتی تو اس کا دل تڑپ اٹھتا۔ یہی جی چاہتا کہ اماں کو کلیجے میں چپالے۔

”اب آئے تمہارا وہ بچہ بھانجہ، اگر بھتیگی سے جوتے نہ گلوائے ہوں تو میرا نام نہیں۔“ اماں نے روتے ہوئے چیلچیل کیا۔

”ضرور آئے گا اور ہمیں اس کی بارات آنے گی۔“ ابا جلدی سے باہر چلے گئے۔

اماں دیر تک بوڑھاتی رہیں۔ ”ایک دن اس گھر کا انجام بہت برا ہوگا۔“

وہ کمرے میں چلی گئی۔ آپا کمرے پر پتنگ پر اوندھی پڑی تھیں۔ ”عالیہ بنو! میں انہیں خط لکھ دوں گی کہ اب وہ یہاں کبھی نہ آئیں۔“ آپا نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ کتنا زرد ہو رہا تھا۔

”مگر ابا جو کہتے ہیں کہ تمہاری شادی ہوگی صفدر بھائی سے؟“ اس نے آپا پر جھک کر کہا۔

”افوہ! اماں یہ شادی کبھی نہ ہونے دیں گی، اور مجھے بدنامی سے بھی بہت ڈر لگا ہے، اس لئے کچھ نہیں ہو سکتا۔“ آپا نے بازوؤں میں منہ چھپا لیا۔ وہ

پپ چاپ بیٹھی آپا کا ہاتھ سلاتی رہی۔ اس وقت وہ کیسی بچی باتیں سوچ رہی تھی۔ صفدر بھائی تو مزے سے پڑھتے ہوں گے اور انہیں کوئی یاد بھی نہ آنا، گا مگر یہاں سب انہیں یاد کر کے لڑے مرتے ہیں۔ سب کتنی فضول باتیں ہیں صفدر بھائی نے اسے بھی تو ایک خط نہ لکھا۔ کیا وہ آپا کو یاد کرتے ہوں گے۔

”اماں نے نہ کتنا کہ میں رو رہی تھی۔“ آپا نے آنسوؤں سے بیگیا ہوا چہرہ اٹھا کر کہا۔

”میں نے کب کبھی کچھ کہا ہے اماں سے۔“ وہ جلدی ہی تو گئی۔

کسم دیدی کمرے میں آگئیں تو وہ اٹھ کر دالان میں چلی گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اب وہ دونوں کس قسم کی باتیں کریں گے۔ پھر بھی سب اس سے ہر بات چھپاتے صرف اس لئے کہ خاصی بڑی ہونے کے باوجود وہ سب سے چھوٹی تھی۔ کوئی بھی اس کی ولی کیفیت نہ جانتا تھا۔ کوئی بھی تو یہ نہ سوچتا تھا کہ اس کے دماغ کی کیا حالت ہے۔ کوئی اسے سمجھنے کی کوشش نہ کرتا۔ کوئی یہ نہ جانتا تھا کہ وہ تو اب اسکول میں دعا کرتے ہوئے آسمانی باپ تک سے اپنے گھر میں رحمتیں نازل کرنے کی دعائیں کیا کرتی تھی۔

ابا کچھ بے چین بنے ہو کر اٹھ بیٹھے۔ ”میں تو تم لوگوں کی وجہ سے خود ہی بدم نہیں کرتا“ اور مجھے تو کچھ کرنا بھی نہیں آتا“ بس یہ نفرت ہے جو چھپائے نہیں جیتی۔“

اس کے بعد ماں دیر تک روتی اور بولتی رہیں مگر ابا ایک لفظ بھی نہ بولے۔ دوست کی گرفتاری کے بعد اماں کو آپا کی شادی کی فکر اور بھی بری طرح تانے لگی۔ ایک بھائی اور بھادر کے سوا ان کا اپنا تو کوئی بھی نہ تھا“ ہاں ابا کے مزیدوں میں ڈھیروں لڑکے تھے۔ اماں نے ان دونوں اپنے بھائی کو بھی خط لکھا تھا کہ آپا کی شادی کا ٹھکانہ کریں۔ ان کے بھائی نے جواب میں لکھا تھا کہ تمہاری بھابی ہمتی ہیں کہ شادی لڑکی کی پسند سے ہونی چاہیئے“ اس لئے آپ خاندان کے لڑکوں کو حیمینہ سے ملائیں اور وہ جسے پسند کرے شادی کر دیں اور وہ کہتی ہیں کہ ہم حیمینہ کی شادی میں ضرور آئیں گے۔

یہ خط پڑھ کر اس کی توجان پھٹک گئی تھی مگر اماں سارا دن مسکراتی رہیں۔ وہ بار بار خوش ہو کر کہتی تھیں۔ ”لو بھلا بچاری بھابی کو کیا خبر کہ یہاں ایسی رانیں نہیں ہوتیں۔“

اماں یہ خط پڑھ کر خود ہی خوش ہوتی رہیں مگر ابا سے ذکر تک نہ کیا“ ہاں ابا نے پیچھے پڑی رہتیں کہ حیمینہ کی شادی کا انتظام کرو۔

ایا تو چپ رہے یا پھر یہ کہہ کر جان چھڑاتے کہ جہاں جی چاہے کرو۔ اماں یہ جواب سن کر لڑنے بیٹھ جاتیں۔ ”پھر تم یہ کہہ دو کہ باپ نہیں“ وہ تو اس خودی باہر نکل کر لڑا ڈھونڈ لوں گی۔“

ابا ان باتوں سے بچنے کے لئے آواز دے کر آپا کو اپنے پاس بلا لیتے تو اماں نے ”نہو ر“ خاموش ہوتا جاتا۔

انہیں دونوں بڑی چچی کا خط آگیا۔ وہ جمیل بھیا کے لئے حیمینہ آپا کو مانگ رہی تھیں۔ اماں کو ایسے وقت میں یہی پیغام غصت لگا اور ابا سے پوچھ کر منظور کی کا خط لکھ دیا۔

اسی دن بولی جلی تھی۔ دوسرے دن کسم دیدی ہمارے ہاں بست سا بچوان

کئی خواتین اور بہاریں آکر گزر گئیں“ پر اس کے گھر کی خزاں بہار میں نہ بدلی۔ صحن میں لگے ہوئے مہندی کے پودے کو آپا کتا ہی پانی دیتیں مگر اس کی پیاس نہ بجھتی“ پتی پتی ہری شاخیں سیاہ پڑ گئی تھیں۔ آپا ان کئی برسوں میں کتنی کمزور ہو گئی تھیں۔ ابا گھر سے بالکل بے تعلق سے نظر آتے“ دفتر سے آنے کے بعد بیٹھک آباد ہو جاتی اور انگریز حکمرانوں سے نفرت کے اظہار میں ابا کی آواز سب سے اونچی ہوتی۔ اماں اس وقت بڑی بے چینی سے صحن میں شغلی رہتیں۔

”ہائے وہ دن سامنوس دن تھا۔ جب میری شادی ہوئی تھی“ سب کچھ ختم ہو گیا“ جو رہا ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا۔“ وہ شلٹلے شلٹلے رک کر آپا سے کہتیں اور جواب نہ پا کر پھر بڑبڑانے لگتیں۔

ویسے ابا وہ صفر بھائی کی طرف سے کسی قدر مطمئن تھیں۔ علی گڑھ سے بی اے کرنے کے بعد وہ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ ابا نے بہت سراما کرمان کا پتہ نہ معلوم ہوا۔ اماں بہت جلدی میں تھیں کہ کسی طرح آپا کی شادی کر دی جائے۔ انہیں خطرہ تھا کہ صفر بھائی کا بہوت پھر کہیں سے نہ اٹکے۔

اماں جب کھانا پکا چکتی تو اماں اس سے شادی کے متعلق باتیں کرتی رہتیں۔ ابا کو تو گھر کی کسی بات سے دلچسپی رہی نہ تھی۔ رات جب وہ بستر پر آتے تو کوئی کتاب اٹھا لیتے۔ شادی کی بات ہوتی تو ہاں ہاں کر کے ٹال دیتے۔

اس دن جب اماں نے کسم دیدی سے سنا کہ ابا کے ایک دوست گرفتار کر لیے گئے ہیں تو اماں مارے دہشت کے کانپ گئیں۔

”تم ہم سب کو بھیک منگوادو گے“ اگر دشمنوں کو کسی نے پکڑ لیا تو کیا ہو گا؟“ رات اماں بلک بلک کر روئیں۔

دعا۔

”میرے پاس بیٹھے نہ بیٹھے سے کیا ہوتا ہے اماں؟“ آپا نے شاید زندگی میں پہلا بار سختی سے جواب دیا تھا۔

”اللہ کرے کہ کم دیدی اپنے گھر خوش رہیں۔“ وہ برابر دعائیں کئے جا رہی تھیں اور اسے بار بار سلی پوچھی یاد آ رہی تھیں۔

چند دن تک رائے صاحب آپا کی بیٹھک میں بھی نہیں آئے اور جب آئے تو اب سے یہی کہتے رہے کہ کم اپنی مانی کے گھر گئی ہے، روٹھ کر گئی ہے، اس لئے مارے اداسی کے کہیں نہیں آیا گیا۔

کم دیدی کی مانتی نے بھی تو اماں سے یہی کہا تھا کہ ”کم روٹھ کر اپنی مانی کے گھر ہر دوڑا چلی گئی ہے۔ جب وہ واپس آئے گی تو پھر اپنی اڑانے والوں سے پوچھوں گی۔“ مگر جب اس نے یہی بات آپا سے کہی تو ان کا چہرہ قح پڑ گیا۔

”انہ کرے وہ واپس آئے۔“ انہوں نے دھیرے سے کہا۔

کم دیدی کے بھاگنے کے بعد اماں کی فکروں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ مانتی تھیں کہ کسی طرح بھی آپا کو ان کے گھر کا کر دیا جائے۔ اماں سارا دن جمیل بیٹا نے حسن اور لیاقت کا ذکر کرتی رہیں۔ وہ ان باتوں کو بڑی دلچسپی سے سنتی مگر آپا کو جانے کیا ہو گیا تھا کہ ایک دم گھر کے کام میں جٹ گئی تھیں۔ سارے کمروں کا اماں الٹ کر پھر سے سجایا گیا۔

”آپا تم نے تو جمیل بھیا کو دیکھا تھا، وہ کیسے ہیں۔“ اسے اپنی آپا کے ہونے والے شوہر سے سخت دلچسپی ہوتی جا رہی تھی۔

”پتہ نہیں!“ آپا اس کے سوال پر ہنس پڑیں۔ وہ خاصی خوش نظر آ رہی تھیں۔

”عالیہ اب تم کو صفدر بھائی نہیں یاد آتے؟“

”قلعی نہیں، سخت بے مروت آدمی تھا، جو مجھے یاد کرے میں اسے یاد کرتی ہوں۔“ اس نے بڑے کھرے پن سے جواب دیا۔ ”میں تو اب صرف اپنے جمیل کو یاد کرتی ہوں۔“ اس نے شرارت سے آپا کو دیکھا تو وہ بڑے زور سے ہنسنے لگی۔

لے کر آئیں اور جب آپا سے گلے ملنے لگیں تو ان کے منہ پر ڈھیر سا عیر مل دیا پھر اس کی طرف جھپٹیں مگر وہ کم دیدی کے بچے نہ چڑھی۔ آپا کی رنگی ہوئی صورت دیکھ کر اماں کو بے ساختہ ہنسی آگئی شاید اس وقت وہ رنگ کھیلنے کو گناہ سمجھتا بھول گئی تھیں۔

”تم نے ہولی نہیں کھیلی کم؟“ اماں نے پوچھا تھا۔

”میں دھوا جو ہوں موسیٰ۔“ کم دیدی کی ہنسی ہوئی صورت کلامی۔

”ہوں!“ اماں نے شاید پہلی بار انہیں سے دیکھا تھا۔

”جی چاہتا ہے کہ خوب رنگ کھیلوں موسیٰ، رنگیں ساری پنوں، من کو مارنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے، پر ہتی نے تو یہ کچھ بھی نہ تھا۔“ کم دیدی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

”چپ رہو کم تنہا کے دن رونا منوں ہوتا ہے۔“ اماں نے انہیں سمجھانا چاہا تو کم دیدی نے جلدی سے آنسو پونچھ لئے اور پھر آپا سے باتیں کرنے لگیں۔

دوسرے دن دوپہر میں ماما نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اماں کو بتایا کہ کم دیدی بھاگ گئیں، مارے حیرت کے اماں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”ارے کیا بچ کچھ کم دیدی بھاگ گئیں؟“ وہ خود بھی چونک کر اماں کا منہ دیکھنے لگی، مگر آپا کے چہرے پر ذرا بھی حیرت کے آثار نہ تھے، وہ مندی میں پانی دے رہی تھیں، جس کی چٹیاں اب ہری ہو چلی تھیں۔

”ہے، رائے صاحب کی ناک کٹ گئی، کیسے عزت والے لوگ تھے۔“ ماما ماتا ہیٹ پیٹ کر باتیں کئے جا رہی تھی۔

”اب خوب ہوئی کھیلے گی، رنگیں ساریاں پہنے گی، اماں باوا کی ناک کٹ گئی تو کیا ہوا، ارے میں ہوتی تو بھاگنے والوں کو زندہ دہا دیتی۔ سگی بہن نکلی سسلہ کی، توبہ! اور نہ کریں دوسری شادی، اپنے دھرم کو لے کر چائیں اب، بیٹی ہر وقت گاتی رہتی تھی تب کسی کو پتہ نہ چلا۔“ اماں باتیں کرتے ہوئے آپا کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ”ارے اگر مجھے پتہ ہوتا تو اپنی تہینہ کے پاس ایک منٹ کو نہ بیٹھے

”آپا اللہ کرے میرے امتحان کے بعد آپ کی شادی ہو، ورنہ سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔“ اس نے بڑی فکر سے کہا۔ نویں کلاس کی پڑھائی نے اس کو کس قدر سنجیدہ بنا دیا تھا۔

”میں تمہارے امتحان سے پہلے شادی کر ہی نہیں سکتی، مجھے دلس تو تم ہی بناؤ گی۔“ آپا نے اسے غور سے دیکھا اور پھر کرے سے نکل گئیں۔

ان دنوں مندی کی بچیوں کا رنگ کتنا گھرا سبز ہو رہا تھا۔ آپا صبح شام لوٹے بھر بھر بانی ڈالتیں۔ ماما انہیں بڑی شفقت سے دیکھ کر ہنسی ”خوب سچو بنیا“ یہ مندی تمہارے ہاتھوں میں لگتی ہے۔“

آپا بڑی ڈھٹائی سے مسکرائیں۔ کیا مجال تھی جو وہ کسی کی بات پر ذرا سار فرمائیں۔ اماں کے سامنے اپنے جیز کی تیاریوں میں مگن رہتیں۔ ایسے خوبصورت بڑپوش اور نیکی کے خلاف کاڑھ رہی تھیں کہ ہاتھ چوم لینے کو مٹی چاہتا۔ اس سے ’ی کام کو نہ کہا جاتا کیونکہ وہ تو نویں کلاس کی تعلیم کے پہاڑ کو سر کر رہی تھی۔

ان دنوں گھر کی فضا میں چاندنی کی ٹھنڈک محسوس ہوتی۔ اماں، ابا کے وجود کو اس طرح بھول گئی تھیں کہ لڑنے کا نام بھی نہ لیتیں۔ درزی اور ستار سارا دن کہہ کہہ چکر لگاتے رہتے۔ نمونوں کی کتابوں کو دیکھ دیکھ کر اماں کی آنکھیں نہ فٹکتیں اور وہ بڑے سکون سے اپنی کتابیں پڑھتی رہتی۔

پر ہائے یہ سکون کتنا عارضی تھا۔ ایک دن صبح ماما نے آکر بتایا کہ اپنی نمبہ بنایا کی سسلی کسم واپس آگئی ہے۔

”چل جھوٹی!“ اماں مارے حیرت کے چیخ پڑیں۔

”اللہ قسم بی بی جی وہ واپس آگئی ہے۔ میری نند نے خود اسے دیکھا ہے۔

اس کے ساتھ ایک آدمی بھی ہے، مکان لے رکھا ہے کرائے پر۔“

”ہے اتنی بے شرمی، ایک تو بھائی اور پھر ماں باپ کے سینے پر مونگ دلنے

نہیں آگئی، ارے اسے رہنے کو کوئی اور جگہ نہ جڑی تھی۔ اگر اس نے میرے گھر

داخل کیا تو ٹانگیں چیر کر پیٹیک دوں گی۔“ اماں نے آپا کی طرف دیکھ کر کہا اور آپا

اچرہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ وہ میز پوش چھوڑ کر انہیں — اور جلدی سے

اپنے کمرے میں چل گئیں۔

جب وہ ان کے پاس گئی تو آپا بڑی بے چینی سے ہاتھ مل رہی تھیں۔

”اری عالیہ، وہ یہاں کیوں آگئی۔ یہاں تو سب اسے ذلیل کریں گے۔ وہ بے وقوف اسے یہاں کیوں لے آیا؟“

”شاید وہ اپنے ماں باپ سے ملنے آئی ہوں، چھ مہینے بھی تو ہو گئے۔ شاید وہ معافی مانگنا چاہتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”اری بے وقوف!“ آپا کچھ سوچنے لگیں۔

”جائے کسم دیدی کس گھر میں ہوں گی، کیسے ملوں ان سے جو اماں کو بھی چھ نہ چلے۔“ اس کا بھئی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح کسم دیدی سے مل لے۔

”تم ان سے نہ ملنا ورنہ اماں ماری ڈالیں گی۔“ آپا نے ہدایت کی مگر وہ برابر کی سوچ رہی تھی کہ اگر مکان معلوم ہو جائے تو اسکول جاتے ہوئے ضرور ملے گی۔

اس رات آپا سخت بے چین رہیں۔ رائے صاحب کے گھر میں ایسا سناٹا تھا کہ کسی کے بولنے کی آواز نہ آتی۔ آپا شاید ساری رات نہ سوئی تھیں۔ صبح ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

اماں کام کرنے آئی تو اس نے پھر بے حد اہم خبر سنائی کہ وہ آدی راتوں رات کسم دیدی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ باقی رات کسم دیدی روتی رہیں۔ آس پاس کے سارے لوگ جمع ہو گئے۔ ماں باپ سے ملانے کے بہانے اور معافی دلانے کے لئے لایا تھا۔ رائے صاحب نے ملنے سے انکار کر دیا تھا مگر ان کی بیوی آج صبح منہ اندھیرے کسم کے گھر گئی تھیں۔

”یہی سزا ہوتی ہے ایسی چراغاؤں کی، بہت اچھا ہوا جو چھوڑ کر چلا گیا، لو بھلا گھر سے بھاگ کر بیوی بننے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ کر لے مزے اب بھگتے۔“

اماں زہر میں بھیجی ہوئی باتیں کر رہی تھیں اور آپا پر جیسے سکتا طاری ہو گیا تھا۔

”میں اب اسے کون کی کہ رائے صاحب کو سمجھائیں، وہ کسم دیدی کو گھر لے آئیں، ہائے وہ اکیلے کیا کریں گی۔“ اس نے بڑے جوش سے کہا تھا۔ اس مرو کی

طرف سے اسے کیسی سخت نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ یہاں لا کر اس نے کون سا کارنامہ انجام دیا۔ وہیں کہیں دیار غیر میں چھوڑ کر بھاگ جاتا تاکہ وہ سرپٹک پٹک گر کر جائیں، یہ ایڈوں کی ذلت تو نہ نصیب ہوتی۔

”کیا کوئی تم اپنے ابا سے، یہی تاکہ بھاگی ہوئی بیٹی کو گھر بٹھالیں، شرم نہیں آنے کی تم کو ایسی باتیں کرتے؟“ اماں نے سخت غصے سے پوچھا تھا۔

”ہاں یہی کون کی!“ وہ اماں کے سامنے سے ہٹ گئی۔

شام کو جب ابا دفتر سے آئے تو وہ ان کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔

”ابا! کسم دیدی اکیلے گھر میں رو رہی ہیں، رائے صاحب کو سمجھائیے وہ اسے لے آئیں، کوئی انہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔“

”مجھے سب معلوم ہے میں تمہارے کہنے سے پہلے ہی رائے صاحب کو بھانپا، بڑی سمجھ دار ہے میری بیٹی۔“ ابا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرائے۔

”اسے کیا ضرورت ہے کہ ایسی بے شرمی کی باتوں میں حصہ لے؟“ اماں نے بے تاب ہو رہی تھیں۔

”کیوں نہ حصہ لے، مشن اسکول میں پڑھاتی ہو اور بولنے تک کا حق نہیں آتی۔“

”صاف بات کیوں نہیں کرتے کہ اگر بڑے بے شرم ہوتے ہیں؟“ اماں لڑنے لگی۔

”رات ابانے پچکے سے بتایا کہ رائے صاحب نے بات مان لی ہے، وہ کسم کو کہ لے آئیں گے اور شاید لے بھی آئے ہوں۔“

ابا کے اس سلوک پر وہ سختی خوش ہوئی تھی، اس دن اسے اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا تھا۔ پھر بھی وہ باوجود کوشش کے کسم دیدی سے ملنے نہ جاسکی۔

وہ رات سختی لینی ہو گئی تھی۔ اسے نیند نہ آ رہی تھی۔ کب صبح ہو اور وہ

انہیں مل جاتے ہوئے کسم دیدی سے ملے۔ آوارہ نکلنے نے بھونک بھونک کر رات کو ابا کو دیران کر دیا تھا۔

کہ نہ جانا ورنہ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے۔“

اس شام اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کی عجیب سی کیفیت ہو رہی ہے۔ عشق اور عاشقی کے اچھے اچھے سے خیالات اسے پکڑائے دیتے تھے۔ یہ عشق و محبت کیا ہے جس کے لئے انسان بڑے سے بڑا گناہ اٹھا لیتا ہے، آخر کیوں، کس لئے۔۔۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔

سوچتے سوچتے وہ تھک گئی تھی۔ اس نے سب سے پہلے کھانا کھالیا اور اپنے بستر پر لیٹ کر کورس کی کتابوں سے اچھے لگی۔ پھر اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کس وقت سو گئی۔

سوٹے سوٹے ایک بار اس کی آنکھ کھل گئی۔ باہر سے کتوں کے بھونکنے اور رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ رات بچ بچ محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک اس کی نظر سامنے اٹھ گئی۔ چاندنی میں رائے صاحب کی چھت کا کمرہ صاف نظر آ رہا تھا اور اس میں دیوے کی روشنی ادھر ادھر پھری رہی تھی۔ پھر اسے کوئی نظر آیا جو سر سے پاؤں تک سفید کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے مارے خوف کے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کمرے میں تو کوئی بھی نہ رہتا تھا۔ خود کم دیدی نے اسے بتایا تھا کہ جب سے دادا جی اس کمرے میں مرسے ہیں، تب سے یہ بند پڑا ہے۔ وہاں جاتے ہوئے سب لوگ ڈرتے ہیں۔

اس نے ڈر کر سوچا کہ شاید کم دیدی کے دادا کی روح آگئی ہو مگر پھر اسے یاد آیا کہ ہندوؤں کے گھروں میں بھوت آتے ہیں۔ اس نے ڈر کر آپا کو پکارا لیکن وہ کڑھ لے کر بھر گئیں۔

ذرا دیر بعد روشنی بجھ گئی اور سایہ غائب ہو گیا، تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔ صبح سب لوگ چائے پی رہے تھے کہ رائے صاحب کے گھر سے رونے پینے کی آواز آنے لگی۔

”میں جانتا ہوں کہ کم پھر بھاگ گئی۔“ ماما بڑے چاؤ سے باہر بھاگی، ساتھ ہی

ابا بھی باہر نکلے۔

”چلو فرصت ہوئی، کم تالاب میں جاؤں گی، پتہ نہیں چلا کہ رات کس وقت

اسکول جانے سے پہلے وہ کم دیدی کے گھر پہنچ گئی۔ ماں جی رسوئی میں تھیں۔ رائے صاحب آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔ انہوں نے انگلی کے اشارے سے بتایا کہ کم ادھر ہے۔

وہ کمرے میں گئی مگر کم دیدی وہاں نہ تھیں۔ کوٹھڑی میں جھانکی، وہاں وہ کمرے پٹنگ پر گڑی مڑی پڑی ہوئی تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ جھج گئیں تو وہ خود ہی آگے بڑھ کر ان سے لپٹ گئی۔

”بت یاد آتی تھیں کم دیدی۔“ اس نے غور سے انہیں دیکھا۔ فصل کٹ چکی تھی، کھیت ویران پڑا تھا۔

اس نے ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھانا چاہا۔ ”یہاں اندھیری کوٹھڑی میں کیوں گھسی ہیں باہر چل کر بیٹھنا۔“

”وہاں بیٹھوں تو سب لوگ مجھے دیکھنے آتے ہیں۔ ماں جی نے کہا کہ چھپ کر بیٹھو۔ پھر پتا جی میری صورت دیکھ کر دکھی ہوتے ہیں، میں بدنام ہو گئی ہوں نا۔ تمہینہ کیسی ہے؟“

”گھر چل کر دیکھ لو دیدی۔“

”اب میں کہیں نہیں جا سکتی۔“ ان کی آنکھوں کی ویرانیاں رو رہی تھیں۔

”میں اپنی دیدی کو خود لے جاؤں گی۔“

اسکول کا وقت قریب تھا اس لئے وہ شام کو آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ راستے بھر وہ کم دیدی کے عاشق کو کوستی رہی تھی۔

جب گھر آئی تو آپا نے اسے پکڑ لیا اور کم دیدی کے لئے اکٹھے بت سے سوال کر ڈالے مگر وہ کیا بتاتی۔ کم دیدی سے تو کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی۔

”ان سے جا کر مل لونا آپا۔“

”اب اگر ان سے ملی تو اگ انگلیاں اٹھائیں گے، وہ بد معاش جو مشہور ہو گئیں۔“

”مگر لوگ اس آدمی کو برا کیوں نہیں کہتے جو انہیں چھوڑ کر بھاگ گیا؟“

”بس نہیں کہتے، لڑکی ہی کو برا سمجھتے ہیں، تم بھی اب بڑی ہو گئی ہو، ان کے

گھر سے نکل گئی۔" ابا چند منٹ بعد واپس آ کر جیسے کرسی پر گرے پڑے۔
 "سارا دن لوگ اسے دیکھنے اور معلومات حاصل کرنے آتے رہے۔ شاید وہ
 دیکھنا چاہتے تھے کہ بھاگنے والی کے سر پر سینگ تو نہیں نکل آئے ہیں۔" میرے
 کپڑے لاؤ، مجھے رائے صاحب کے گھر جانا ہے۔"

اماں بالکل دم بخود تھیں۔ آپا رو رہی تھیں اور وہ ابا کے کاندھے پر سر
 رکھے سر سے پاؤں تک لرز رہی تھی۔ ابا اس کا سر سلا رہے تھے، اسے تھپک
 رہے تھے مگر اسے جانے کیا ہو گیا تھا کہ رو یا بھی نہ جاتا تھا۔

کسم دیدی کھات پر ڈال کر گھر لائی جا چکی تھیں۔ عورتوں کے ہجوم کو چکر کر
 جب اس نے ان کے کھلے چہرے کو دیکھا تو چیخ پڑی۔ سو جا ہوا نیلا چہرہ جذبات سے
 خالی تھا۔ سب ان کو دیکھ رہے تھے مگر انہوں نے سب کو دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔
 ان کے ہونٹ عجیب انداز سے کھلے ہوئے تھے جیسے "کون گلی گیو شام" کے بول
 ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گئے ہوں۔ کھات سے لٹکی ہوئی سفید ساری کے پلو سے پانی کی
 آخری بوند بھی ٹپک کر کچے گھن میں جذب ہو چکی تھی۔

اکتوبر کا مہینہ تھا۔ ہلکی ہلکی سردی پڑنی شروع ہو گئی تھیں۔ دلا بیاں اونٹ
 اداہ کسب لوگ اندر سونے لگے تھے۔ سریوں میں اسے کیسے مزے کی نیند آتی
 تھی آپا کو جانے کیا ہو گیا تھا کہ رات کا زیادہ حصہ جاگ کر گزار دیتیں۔ ان کی
 صحت خراب ہو رہی تھی۔ رنگ مدھم پڑ گیا تھا اور چہرے پر خشکی دوڑ گئی تھی۔
 اماں ان کی غذا کا خاص طریقے سے خیال رکھتیں۔ صبح چائے کے بجائے پاداموں کا
 چہرہ پایا جاتا۔

آپا کا جہیز مل گیا تھا اور اماں بے چین تھیں کہ کسی طرح شادی کی تاریخ
 طر ہو جائے۔ ادھر بڑی چچی کے خط پر خط آرہے تھے کہ جلدی سے تاریخ مقرر
 کر دی جائے مگر ابا ڈھیل دیے جاتے کہ تہنہ کی صحت ٹھیک ہوگی جب دیکھیں
 گے

ایک بار بڑی چچی کا خط آیا تو اس میں جیل بھیا کی تصویر تھی۔ وہ تصویر لے
 کر ابا نے پاس گئی تو انہوں نے منہ پھیر لیا۔

"انسان صرف ایک ہی بار کسی کا بتا ہے۔" انہوں نے غصے سے کہا پھر
 ابا، ہم بس دیں۔" اب اکتھے ہی دیکھ لیں گے۔" ان کی ہنسی میں کتنی بے
 لگائی تھی

"ابا آپ کو صفر بھائی یاد آتے ہیں ابا؟" اس نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"جہ! کیوں یاد آنے لگے۔" آپا نے سر ہانے رکھی ہوئی کتاب اٹھالی۔

ابا دفتر سے آئے تو بہت رنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ اماں نے میز پر چائے کا
 ملا، ابا کا، یا مگر ابا اسی طرح آرام کرسی پر لیٹے رہے۔

"ابا آج چائے نہیں پیو گے، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ پھر آج تم کوئی اچھا سا

”شاہاش تم بڑی سمجھ دار ہو، میری ساری امیدیں تم سے وابستہ ہیں، تم کو ہونا چاہیے ان بے ایمان تاجروں سے نفرت ہے، انہوں نے ہمیں غلام بنا لیا ہے۔“

”مجھے بھی نفرت ہے ابابا! اس نے ابابا کو خوش کرنے کے لیے کہا تھا۔ ابابا نے تپائی پر پیالی رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں خوشی سے ہلک رہی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کہ ابابا آخر سارے انگریزوں سے کیوں نفرت کرتے ہیں۔ خود اس کے اسکول کی نگران سستی اچھی اور پیاری ہیں، وہ آخر کب ملک پر حکومت کر رہی ہیں۔“

”انشاء اللہ ایک دن یہ سب اپنے ملک واپس چلے جائیں گے، میں تم لوگوں کو لے کر نیال سے کچھ نہیں کر سکتا مگر اتنا بڑا ملک تو پڑا ہے نا؟“

”جی ہاں بہت بڑا ملک ہے!“ اس نے کس قدر احمقوں کی طرح کہا تھا کہ ابابا بھی مسکرا پڑے۔

جانے کس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ کشتی اٹھا کر جلدی سے اندر آگئی۔

”مجھے سب معلوم ہے کہ وہ اپنے آپ کو کیوں تباہ کر رہے ہیں؟“ رات کو ابابا نے اس سے سرگوشیوں میں کہا تھا کہ وہ چپ رہی، قسم دیدی ڈوب مری، پھر ابابا کو مفسد بھائی یاد آتے ہیں، اس نے بڑی نفرت سے سوچا۔

اماں برآمدے میں بیٹھی بڑی چچی کے خط کا جواب لکھ رہی تھیں۔ ابابا جب لکھا لکھانے آئے تو اماں نے جیسے اعلان کیا۔ ”میں نے تمہاری بھانج کو عید کی دس تاریخ لکھ دی ہے۔“

ابابا چپ رہے، انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ لائین کی چلی چلی روشنی میں وہ قدر دہکی نظر آ رہے تھے۔

ان دیکھ کر شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دو، تمہاری بھابی کے خط پر خط آ رہا ہے۔“ اماں نے اپنی کرسی ابابا کے قریب کھسکا لی۔

”تمہاری وجہ سے وہ اس گھر کو چھوڑ گیا، وہ غلط قسم کی پارٹی کے ساتھ ہو اس نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا ہے۔ اس کی تباہی کی ذمہ دار تم ہو۔“

ابابا کا چہرہ فق پڑ گیا۔ سب سمجھ گئے تھے کہ ابابا کی بات کر رہے ہیں۔

”کس کم بخت کو تباہ کیا ہے میں نے؟“ اماں نہیں۔

”مفسد کی بات کر رہا ہوں، اب آیا عقل میں؟“ ابابا نے تڑ سے جواب دیا۔

”ہائے وہ اس گھر سے جا کر بھی نہیں گیا، وہ میاں سے کبھی نہیں جاسکے گا۔“ اماں نے رونے کا حربہ استعمال کر دیا۔

”تم اطمینان رکھو، اب وہ کبھی نہ آئے گا۔“ ابابا نے آہستہ سے کہا اور چائے پئے بغیر بیٹھک میں چلے گئے۔

جب وہ ابابا کے لئے چائے لے کر بیٹھک میں گئی تو وہ آنکھیں بند کئے تخت پر لیٹے تھے۔ اسے دیکھ کر اٹھ گئے اور مسکراتے گئے۔ ”تمہاری ماں کو میں کیسا سمجھتا ہوں، انہوں نے تمہارے بھائی کو جلا کر کھا ہے، بھلکتے سے اس کا ایک دوست آیا ہے، اس نے یہ سب کچھ بتلایا ہے، تمہارا بھائی تم کو بے حد پوچھ رہا تھا۔“

”ابابا کن کی پاپٹی ہے؟“

”بیٹا وہ دہریوں کی پاپٹی ہے۔“ ابابا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ میں تو اسی کو اپنا بیٹا سمجھتا تھا۔“

وہ کب کسی کو باپ سمجھتے تھے۔ جا کے ایک خط بھی نہ لکھا، کسی کی محبت کی قدر نہ کی۔ ابابا خواہ مخواہ ان کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہیں، اس نے دل ہی دل میں سوچا مگر اب اسے کچھ نہ کر سکی۔

”تمہاری پڑھائی کا کیا حال ہے؟“

”ٹھیک ہے ابابا!“

”تم انگریزوں کے مذہب سے تو متاثر نہیں ہو؟“

”توبہ توبہ!“

اس کی سرخی سے تھناؤں کے خون کا پتہ چلتا ہے۔"

"اوند! آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں آپ؟" — اس نے الجھ کر آپا کی طرف دیکھا، اس وقت اسے خیال آیا تھا کہ اماں ٹھیک ہی تو کہتی ہیں کہ صفدر بھائی نے الم غلام ستا دیں دے دے کر آپا کو جاہ کر دیا ہے۔

"میں کیسی باتیں کرتی ہوں" — وہ مسکرائیں — "باتیں ہی تو سب بولہ ہوتی ہیں، انہیں باتوں نے مجھے مسافر بنادیا اور یہی باتیں میرے سفر کو ختم کر گئی ہیں۔"

"آپا آپ کو صفدر بھائی یاد آتے ہیں، سچ بتائیے؟"

"کون صفدر بھائی؟" اری بے وقوف، تیرے پاس تو عقل نام کو نہیں۔
آپا نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا — "چلو اب سو جائیں، اتنی رات ہو گئی۔"

شادی میں صرف چند دن رہ گئے تھے۔ اماں سخت مصروف اور خوش تھیں۔
ای کسی وقت انہیں یہ فکر بھی ستانے لگتی کہ ان کے بھائی اور بھانجے نے ہفتے پہلے اپنے کو لٹکا تھا مگر کسی وجہ سے نہ پہنچ سکے۔ وہ برابر ان کا ذکر کرتی رہتیں۔
"اس ملک کی بدلتی ہوئی ریتیں بھی تو بھائی کی طبیعت کو اس نہیں آئیں۔ ذرا میں انہیں زکام ہو جاتا ہے، معدہ الگ خراب رہتا ہے۔ کہیں نہ کہیں دعوت میں اس طرح کو مر چیں کھانی پڑ جاتی ہیں۔ بھلا مریج بھی کھانے کی چیز ہے؟" اماں آیا سے اب چاہتیں مگر وہ خاموش رہتیں۔

آپا نے اپنے کمرے سے ٹھکانا چھوڑ دیا تھا۔ اب گھر میں آتے تو اپنے کمرے کے دروازے سے بھینچ لیتیں۔ اماں کو ان کی اس شرمانے والی ادا پر بڑا پیار آتا۔ وہ اکثر سے کہتیں کہ شرم ہو تو ایسی ہو۔

اس نے آپا کے چہرے پر شرم و حیا تلاش کرنے کی لاکھ کوشش کی پر رتی بھر
میں: لی۔ آپا کو تو جب شرم آتی تو جابانی گزیا کی طرح گھائی پڑ جاتیں، مگر وہ تو
الغیہ ہو رہی تھیں، ان کی آنکھوں میں ایسی گمراہی تھی، ایسا اندھیرا تھا کہ ان
اگر طرف دیکھ کر لگتا کنویں میں جھانک رہے ہوں۔

شادی کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی۔ اماں کی مصروفیت بڑھ گئی تھی۔
بارہ ایک بجے کے قریب چہرہ اس کی بیوی برقع اوڑھ کر آ جاتی اور چادروں کے
دھان صاف کرنے لگتی۔ ادھر بیرون شگ میوے کاٹنے کو پڑے تھے۔ اماں اس
سے کام لیتے ہوئے کس قدر بے رحم نظر آتی تھیں۔ سارے دن کی تھکی ہاری
چہرہ اس کی بیوی جب شام کو اپنے گھر جانے کے لئے اٹھتی تو لڑکھڑاتی۔
جنوری کے آخری دن تھے۔ ایک روز پہلے بارش کے ساتھ اولے پڑے
تھے۔ رات اس قدر سرد ہو گئی تھی کہ لگتا برف کی سل پر بیٹھے ہیں۔ مندروں سے
آتی ہوئی گھنٹوں کی صدائیں جیسے طعمر کر رہ گئی تھیں۔

بڑی دیر تک باتیں کرنے کے بعد آپا نے اس کی طرف سے کروٹ لے لی
تھی۔ وہ سوئے ہی والی تھی کہ آپا نے پھر باتیں شروع کر دیں۔ جانے ان کی نیند کو
کیا ہو گیا تھا۔

"ایسا لگتا ہے کہ مسافروں کی طرح بیٹھی ہوں۔" انہوں نے بوئے کھوئے
ہوئے انداز میں کہا۔

"مسافر تو ہیں ہی، کچھ دن بعد وطن بن کر چلی جائیں، وطن بن کر آپ کیسی
خوب صورت لگیں گی۔"

"اور میرے ہاتھ ہیں نا خوب صورت؟" — آپا نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ
لحاف سے نکال کر لہرائے۔ "ان میں مندی رہے گی، اسی دن کے لئے تو میں
نے مندی کے ذرا سے پودے کو سیٹھا تھا، اب وہ لگتا بڑا ہو گیا ہے، جی چاہتا ہے کہ
اس کے سائے میں پڑ کر سو رہوں۔ یہ مندی بھی کیسی عجیب چیز ہوتی ہے، اس سے
ساک کی منک آتی ہے، محبت کی ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے اور یہ بات بھی ہے کہ

بارات آنے میں جب سات دن رہ گئے تو آپا کو نملادھلا کر اور پہلے کپڑے پہنا کر مانجھے بٹھا دیا گیا۔

رات میرا تیس اور ڈونیاں ڈھول لے کر آگئیں اور برآمدے میں چم ہوئی درری پر بیٹھ کر قسم قسم کی آوازوں میں گانے لگیں۔ کتنا ارمان، کتنی آرزوئیں تھیں ان گانوں میں، جو کچھ کنواری زندگی میں نصیب نہ ہوا تھا اسے لینے کی تمنا میں گیت کا ایک ایک بول ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔

گیت ہوتے رہے اور آپا پہلے دوپٹے کی اوٹ سے آنسو پونچھتی رہیں۔ کے دوستوں کی بیویاں ایک ایک کیت کو دو دو بار سننے کی فرمائش کرتیں مگر گانے والیوں کے گلے نہ ٹھتے۔ درری پر وقفے وقفے سے دو دو چار چار آنے والے داد کے طوار کرتے رہے۔

رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے اماں دوپہر میں تھک کر مری نیند سو رہی تھیں، ماما بہت دنوں بعد دوپٹے کی چھٹی لے کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔ آپا بلی تھیں مگر انہیں نیند نہ آ رہی تھی۔ وہ بار بار کروٹیں بدلتیں۔ سامنے صحن کی بچی دیوار کو ابٹھا ایک ساں بولے جا رہا تھا۔ اس کی آواز سے دوپہر کا سناٹا اور بھی گہرا گیا تھا۔

”مہمان آنے والے ہیں“ اس لئے کوا بول رہا ہے۔“ اس نے خوش ہو کر آپا سے کہا۔

”اور مہمان جانے والے بھی تو ہیں۔“ آپا بلی مدت بعد خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھیں مگر ہر ایک دم کچھ سوچ کر اٹھ بیٹھیں۔ ”عالیہ تم کو کیا چم میری اتنی عمر کچھوے کی طرح رینگ رینگ کر مزاری ہے۔“ ان کا چہرہ سرخ گیا۔

”تم مجھ سے بہت اچھی رہیں، میری حیثیت تو ایسی رہی جیسے کوٹھری میں کوا کباڑ ڈال کر بھول جائے، اماں۔“ اس کے ہونٹ کاٹنے لگے۔

”اماں مجھے بھی تو ڈانٹتی ہیں مگر میں تو خوش رہتی ہوں۔“

”انہوں نے تو سب کچھ صفور بھائی کی دشمنی میں کیا، انہیں مجھ سے خطرہ

”مگر اب تو آپ آزاد ہو جائیں گی، صفور بھائی اب آپ کی زندگی تلخ کرنے نہ آئیں گے۔ خدا سمجھے ان سے بھی۔“

”ارے کو سو تو نہیں!“ وہ ٹنگے پاؤں باہر پانی پینے چلی گئیں۔

بب وہ پانی پی کر آئیں تو ان کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ انہوں نے لینے ہی ازمیں بند کر لیں۔

حد ہے، آپا اب تک اس کہنے کے لئے سوچتی ہیں، قسم دیدی کا انجام دیکھنے کے بعد بھی عقل ٹھکانے نہ آئی۔

وہ سونے کی کوشش کر رہی تھی کہ چڑاسی ڈاک لے کر آگیا۔ آپا بھی اٹھ گئیں۔ اس نے خط الٹ کر دیکھا، اماں کے نام تھا اور ایک کونے میں صفور لکھا تھا۔ آپا نے تڑپ کر خط کھول لیا اور پڑھنے کے بعد اس کی طرف بڑھا دیا۔ پڑھ کر وہ مارے خوف کے لرزے لگی تھی۔ ”جی، تمہیں یہ شادی مبارک ہو، آپ اسے اسی کا بھی بتا دیں پھر میری وہ میری رہے گی۔ وہ صرف میری ہے۔“

آپا کے چہرے پر ایسا سکون تھا جیسے دنیا جہان کی دولت مل گئی ہو، اس نے ہلکی سے خط پھاڑ کر اس کی کڑیاں چولے میں ڈال دیں۔ دوسرا خط ماموں کا تھا، اس نے اعتقاد سے سرہانے رکھ لیا۔

”میرا ہم تو سوتے ہیں، سخت نیند آ رہی ہے۔“ آپا بلی چالاکی سے سوتی بن گئیں مگر وہ صفور بھائی کو دل ہی دل میں گالیاں دے رہی تھی۔ اگر یہ خط اماں کو مل جاتا تو مگر کیا ہو؟ اس خیال ہی سے اس کا دل ڈوبنے لگا۔

”آپا کتنے کہتے ہیں صفور بھائی!“ اس نے آپا کو بلایا۔

”اور نہیں تو کیا ہے، خدا کے لئے اماں سے ذکر نہ کرنا ورنہ جانے کیا ہوگا“ انہوں نے دھیرے سے کہا۔

رات کھانے پینے کے بعد دالان میں درری بچھا دی گئی۔ ماما نے ڈھول کس اراج میں لڑھکا دی اور مانگے کا گیس کا ہنڈا دالان کے درمیان لٹکا دیا، ذرا دیر بعد انہیں آنے لگے۔

رات گیارہ بجے کے بعد جب میرا میں گاجا کر چلی گئیں تو آپا ہلے ہلے ہوئے کمرے سے نکل کر دالان میں آگئیں۔ کٹنیں پڑی ہوئی دری پر لڑھکی ہوئی ڈھول بڑی سونی معلوم ہو رہی تھی۔ اما کرسیاں اٹھا اٹھا کر کمرے میں رکھ رہی تھی اور ساتھ ہی جانے کیا تلاش کئے جا رہی تھی۔ ”ہائے جانے کہاں گئی ہتی ہی نہیں، ناس جانے اس یاد کا۔“

”عالیہ بھو، سنو جب میں چلی جاؤں اور تم کو کبھی مضر ملیں تو میرا ایک پیغام کہہ دینا، کہہ دو گی؟“ بستر پر لیٹے ہی آپا نے بڑی بچاری سے کہا۔
 ”کیا آپا؟“ آپا کو عجیب سی حالت میں دیکھ کر اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔
 ”یہی کہ میں ان کو کبھی نہیں بھولی اور بس۔“
 ”اب سو جائیے آپا۔“
 باہر کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ جانے کس وقت سو گئی۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو آپا بے خبر سوئی ہوئی تھیں۔ وہ اسکول جانے لے لئے تیار ہوئی رہی مگر آپا نہ اٹھی۔ جب سب لوگ چائے پینے کے لئے اٹھے تو اماں نے اماں کو بھیجا کہ آپا کو جگا کر چائے دے دے۔
 اماں کی چیخ کی آواز سن کر اماں اور اماں آپا کے کمرے کی طرف بھاگے۔ اماں نے ”او ہتزار مار کر کہہ رہی تھی۔“ ”تمہیں بیانا نہیں رہیں۔“
 ”کہاں گئیں، کہاں چلی گئیں۔“ وہ مارے خوف کے کانپنے لگی۔ وہ جانے لپے کمرے تک گئی جہاں ابا بے ہوش اماں کو تھامے کھڑے تھے مگر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بھی گر پڑیں گے۔

آپا جج نہیں رہی تھیں۔ ان کے مندی رچے ہاتھ بڑی بے بسی سے پھیلے ہوئے تھے اور ہونٹ اس طرح سیاہ ہو رہے تھے جیسے کسی نے مسی لگا دی ہو۔
 اماں ہوش میں آتے ہی پچھاؤں کھا رہی تھیں۔ ابا بچوں کی طرح رو رہے تھے اور وہ آپا کے ٹھنڈے جسم سے لپٹی بلک رہی تھی۔
 ابا نے جلدی سے آنسو پونچھ لئے۔ ”ہیشہ سے دل کنزور تھا، اس لئے دل لی حرکت بند ہو گئی ہے، اماں تم جا کر پانی گرم کرنے کا انتظام کرو، اللہ کو یہی منظور تھا۔“ ابا کی آواز کانپ رہی تھی۔

اماں کے باہر جاتے ہی ابا نے اماں سے سرگوشی کی۔ ”تم بہت سے کام ہو، ام، سببت میں بچھن گئے ہیں، میت کو جلدی سے اٹھانا ہے۔“ اماں کو چھوڑ کر انہوں نے اسے لپٹا لیا اور دو سرے کمرے میں لے گئے۔ ”تم تو بڑی سمجھدار ہو، ام، میں نہیں۔“

ابا اسے کیلے کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے مگر اس وقت تو ابا کا حکم بڑھا اس

کے بس میں نہ تھا، وہ جا کر دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ ابا اماں کو سمجھا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں کانڈ کا ایک پرزہ تھا جسے انہوں نے ماچس سے جلا دیا اور پھر اماں کو تمام کردالان میں لے آئے۔

ماما نے پتیلے میں پانی چڑھا کر اس وقت صبح ہی صبح دوری بچا دی، پر ڈھول کس کر نہ ڈالی۔ ابا کے دوستوں کی بیویاں آ رہی تھیں پر کوئی دوری پر پیسے نہ پھینک رہا تھا، سب رو رہی تھیں اور ان کے پیچ میں چنبلی ہوئی اماں کو بار بار نشتر آ رہا تھا۔

آپا کو جلدی جلدی منلا دھلا کر مرخصت کر دیا گیا۔ اماں پاگوں کی طرح ان کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔
 ”ارے بھیا، بڑی بھیا رخصت ہو گئیں تم گاؤنا“ کاہے کو بیا ہی بدیس لکسیا بابل مورے۔“

ماما کی بات پر پیسے کرام چ گیا۔ وہ آپا کے کمرے میں بھاگ گئی تھی اور زمین پر بیٹھ کر دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ جٹے ہوئے کانڈ کے ٹکڑے ادھر ادھر سے اڑتے پھر رہے تھے۔

”ہائے کیسی امانوں بھری چلی گئی۔“ ماما بولا لی ہوئی کمرے میں آئی اور ادھر ادھر کچھ تلاش کرنے لگی۔ ”کل سے انیم کی ڈبیا کوئی تو پھر نہ ملی ایک ذرا سی کھالیتی تو دل ٹھہر جاتا۔“

بڑے بچا، بڑی چچی اور ماموں آئے، دو دن رہے پھر سب رو پیٹ کر چلے گئے۔ ماموں کی انگریز بیوی نہ آ سکی تھی کیونکہ ان دنوں وہ ماں بننے والی تھی اور ابا کی بیوی بھی تو نہ آئے تھے۔ ذرا اپنی ہونے والی دلہن کی تربیت ہی دیکھ لیتے۔
 اس قصبے کے بعد اماں کیسی چپ اور گھٹی گھٹی رہیں، اس کے بعد تو صرف وہی ان کی محبت کا مرکز رہ گئی تھی۔ ہر وقت نظروں میں رکھیں، ذرا دیر کو پاس نہ ہوتی تو اماں کو اختلاج کے دورے پڑنے لگتے۔

ابا اماں سے کتنے دور ہو گئے تھے۔ دفتر سے آ کر بیٹھک ہی میں ہاتھ منہ دھو کر، وہیں چائے پیتے اور کھانا کھا کر رات کے گیارہ بارہ بجے تک دوستوں کے فونٹ میں بحث و مباحثہ کرتے۔ رات جب سب سو جاتے تو چپکے سے آ کر اپنے اپنے کمرے میں جا کر سو جاتے۔ آپا کے مرنے کے بعد سناٹا ہر طرف دوڑا تا پھر تاتا اور کوئی بھی نظر نہ آتا جو اس سناٹے کو توڑے۔

صفدر بھائی کی پھر کوئی خبر نہ گئی۔ انہیں زمین ٹھل گئی یا آسمان۔ وہ تو ان بچپن کے لئے ترستی تھی۔ وہ انہیں لکھانا چاہتی تھی کہ قبر کے پاس کافی جگہ ہے اگر محبت کرتے ہو تو پھر آ جاؤ۔

اس دن جب ابا بیٹھک میں آئے تو کوئی ساتھ نہ تھا۔ وہ جلدی سے ان کے پاس پہنچی۔ کتنی مدت ہو گئی تھی کہ وہ ابا کے پاس نہ بیٹھ سکی تھی۔ ان سے کوئی بات نہ کر سکی تھی۔

”ابا آپ گھر میں نہیں آتے، کسی سے نہیں بولتے۔“ اس نے جاتے ہی ابا کو بلایا تھا، اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ ابا نے گھبرا کر اس کا سر سینے سے لگا لیا تھا۔
 ”تمہاری ماں نے مجھے گھر سے دور کر دیا ہے، تم کو سب کچھ معلوم ہے۔“

تھے۔ عورتیں محبت میں خودکشی کر کے مثالی وفا پیش کر جاتیں اور مرد کسی تاریک رات میں قبر پر شیخ روشن کر کے پلے جاتے اور بس۔
کتابوں کو الماری میں بیخ کر وہ مارے جلاہٹ کے روتی رہی اور آپا آنسوؤں کے پردوں کے اس بار کھڑی بڑی حقارت سے اس کو دیکھتی رہی تھیں۔

اس کا کتنا ہی چاہا تھا کہ اماں نے کسی کو گھر سے دور نہیں کیا، صفدر بھا نے سب کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے، پھر آپ تو انگریز دشمنی میں اپنے مصروف ہیں کہ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہی نہیں۔ آپ محبت کو پچھانتے ہی نہیں۔۔۔۔۔ وہ یہ سب کچھ نہ کہہ سکی۔ اسے خود حیرت تھی کہ ابا کی بے اعتنائیوں کے باوجود انہیں سب سے زیادہ کیوں چاہتی تھی۔ کیا جہاں آباد تھا ابا کی شفیق آنکھوں میں وہ ابا کے خلاف کبھی ایک لفظ بھی تو نہ کہہ سکی۔

”تمہاری ماں نے مجھے کبھی نہ سمجھا، انہوں نے میری کسی خواہش کا ساتھ دیا اگر مجھ میں بھی تمہارے بڑے چچا جیسی جرات ہوتی تو آج میں اتنا مجبور ہوتا۔۔۔۔۔ ابا جانے اور کیا کہنے والے تھے کہ رائے صاحب آگئے۔

آپا کی موت نے اسے اپنی عمر سے دس حلال آگے بڑھا دیا تھا۔ وہ اماں دلوئی کرنا چاہتی تھی۔ ابا کو گھر واپس لانے کے لئے بے قرار تھی۔ وہ انہیں سیاست بازی سے ہٹانا چاہتی تھی۔

اس کی شکایت کے بعد ابا تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے گھر میں بیٹھنے لگے مگر ایسا لگتا کہ اماں سے کترا رہے ہیں اور اماں جب ان سے آنکھیں چار کرتیں چہرے پر بیٹے دونوں کی یاد رز نے لگتی اور وہ صفدر بھائی کے لئے سوچتی رہ جاتی کس قدر فحاش سے اس شخص نے ایک خط لکھ کر آپا کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔

آپا کی موت کو کئی مہینے ہو گئے تھے مگر اماں نے ان کی کسی چیز کو ادھر سے ادھر نہ کیا تھا۔ آپا کا پتنگ اسی طرح پڑا تھا، ان کی کتابیں اسی طرح رکھی تھیں۔ جب ان کے کمرے میں جاتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ دل ڈوب جائے گا۔ اماں ان کے جیز کے بکس بھی اسی کمرے میں لگوا دیئے تھے۔ انہیں دیکھ کر اسے عجیب سی بے بسی کا احساس ہوتا۔ کچھ دن بعد آپا کے جیز کے بکس میں جیمز گھس کر سہا کچھ چاٹ جائیں گے، برسات میں پچا کو گنا سیاہ پڑ جائے گا۔ وہ سوچا کرتی۔

میزک کا استھان دینے کے بعد وہ بالکل بیکار ہو گئی تھی۔ دن کاٹنے نہ سکتے اس دن وہ یوں ہی آپا کی کتابیں اٹھا کر پڑھنے لگی۔ سکتے عشق و محبت سے بھرپور

دن کا ایک بچ گیا مگر ابا کھانے پر بھی نہ آئے۔ وہ اماں کے ساتھ رات کی موت کے انتظام میں مصروف رہی۔ اس نے ہینک کو بڑے نئے طریقے سے سبایا تھا اور گیس کے دودھ بڑے منگوا کر اچھی طرح صاف کرا لئے تھے۔ اماں کی قسم کے کونے اور کباب تیار کر رہی تھیں اور ایک ساں مٹھے جا رہی تھیں کہ معاملہ بغیر مریج کا پینا جائے۔ اماں نے اتنی گن سے کبھی کسی کی موت کا انتظام نہ کیا تھا۔

کھانا بس تیار ہی تھا کہ چڑاسی بولا کھایا ہوا بغیر آواز دینے گھر میں گھس گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑی دور سے بھاگتا ہوا آ رہا ہے۔ ”ہینک صاحب اپنے بابو جی کو پولیس پکڑ لے گئی، معانے کے وقت افسرے بھڑا ہو گیا اور اپنے بابو جی نے رول سے اس کا سر پھاڑ دیا۔“

اماں نے آنکھیں پھاڑ کر اس طرح دیکھا جیسے ان کے چاروں اور اندھیرا پھانسیا ہو۔ پھر انہوں نے چیتا چاہا تو بس منہ کھول کر رہ گئیں۔ دعوت کے سامان پر طیاں ہینک رہی تھیں۔

”کماں ہیں ابا، میں ان کے پاس جاؤں گی۔“ وہ ہانگوں کی طرح اٹھ کر بھاگی تھی مگر چڑاسی اس کے سامنے دیوار بن گیا تھا۔ ”آپ کہاں جائیں گی بھیا بیٹی؟“

”تو میرے سر چڑھتا ہے!“ اس نے چڑاسی کو مارنے کے لئے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے تھے۔ ”میں تو بھیا بیٹی کا غلام ہوں، آپ کہاں جائیں گی، بابو جی تو تھانے میں ہیں۔“ چڑاسی نے صافے کا پلہ آنکھوں پر رکھ لیا۔ ”ذیم پھول کہتا تھا اپنے بابو جی کو، حرم زاہد۔“ چڑاسی نے سرخ سرخ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”مجھے مل جائیں تو ایک ہزار ایک انگریزی صدے کر کے پھینکوں اپنے ماہی پر سے، خون چڑھ گیا ہے میری آنکھوں میں، خون!“

ذرا دیر میں رائے صاحب آگئے۔ اماں دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر ان سے باتیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے ماموں کا پتہ دے دیا تھا کہ انہیں تار کر دیا مانے، مگر اس نے جلدی سے بڑے چچا کا پتہ بھی دے دیا۔ وہ تو بڑے چچا کو صرف

دو تین دن سے ابا تخت مصروف تھے۔ دفتر سے بھی بڑی دیر میں آتے۔ ان کا انگریز افسر معانے کے لئے آنے والا تھا۔ ابا ہر چیز ٹھیک کرانے کے علاوہ ڈاک بیٹنگ میں اس کے رہنے کا انتظام بھی کر رہے تھے۔ آپا کے ہاتھوں کے کڑے ہوئے کٹی میز پوش اور گلداں بھی چڑاسی مانگ لے گیا تھا۔

”خوب! انگریزوں کو گالیاں دیتے ہیں اور اب وہ آ رہا ہے تو مارے ڈر کے شئی گم ہے حضرت کی، زبان بی جمع خرچ کرنے میں کیسے تیز ہوتے ہیں لوگ بھی۔“ اماں بڑے فخر اور فخر سے ہنسن تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ کاش وہ ایک ذرا دیر کو اماں کی اماں بن سکتی تو پھر بتاتی کہ چھیڑ خانی کرنے کا کیا فائدہ ہوتا ہے۔ ابا گھر سے دور ہوتے جا رہے تھے اور اماں اپنے حال میں مست تھیں۔

رات ابا تھکے ہارے واپس آئے تو اس سے کہا تھا۔ ”بیٹی تم رات کے کھانے کا ذرا اچھا سا انتظام کرا دینا، ایک چھ سات آدمیوں کا کھانا ہو گا بس، صبح وہ معانے کو آ رہا ہے رات ہمارے گھر دعوت ہوگی۔“

”بھئی حد ہے، خالی خولی نفرت کرتے ہو اور خوشامد میں لگے ہو اس کی، ارے مجھ سے کہو میں خود دعوت کا انتظام کر دوں گی۔“ آخر اماں ابا کے سامنے بھی نہ چوکیں۔

”میں نے خوشامد نہ کی تو پھر تم ہینک جو مانتے لگو گی۔“ ابا جلدی سے باہر چلے گئے اور وہ اماں سے ایک لفظ نہ کہہ سکی۔ ان کی اباڑ صورت دیکھ کر رحم آنے لگتا۔

دوسرے دن ابا تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر انشیں چلے گئے۔ اماں اپنے ہینک پر پاؤں لٹکائے بیٹھی بڑے فخر سے ہنستی رہیں، مگر ابا نے ان کی طرف نہ دیکھا۔

کاش نیند آجائے یا پھر صبح ہو جائے۔ وہ پھر سونے کے لئے لیٹ گئی۔

یہاں سے دوڑ کر دوں غلی منزل میں آسکوں۔ برآمدے میں پڑے

جبرمی پر بیٹھی دھواں دھار قسم کی باتوں میں مصروف تھیں۔

”اٹھ گئیں عالیہ! میں نے تم کو اس لئے جلدی نہیں اٹھایا کہ جانے نی؛
پراچھی نیند آئی ہو یا نہیں۔“ بڑی چچی نے اسے اپنے پاس بٹھایا۔

”میں تو خوب سوئی تھی بڑی چچی۔“ اس نے اپنی اماں کی طرف دیکھا،
کے چہرے پر شب بیداری اور فکروں کی دھول اڑ رہی تھی۔

”اللہ مارا پراٹھا تو رکھے رکھے سوکھ گیا“ اب کیا سواد رہ گیا ہوگا۔“ کریم
ہوا نے تو اچھا کر پراٹھا گرم ہونے کے لئے ڈال دیا۔ ”گھی میں گندھی ہو
پوریاں ہوں تو دس دن بھی نہ سو سکیں“ بس زمانے زمانے کی بات ہے۔“ کریم
ہوا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”سارا سامان اسی طرح بندھا ہوا ہے، ناشتہ کر چکو تو اسے کھلاؤ۔“ اماں
نے آہستہ سے کہا۔

”لو بھلا“ یہ کیا کھلائے گی جیل اور ٹھیکل آکر سب کر لیں گے، عالیہ تو او
کا کمرہ پسند کرے گی۔ اکیلے میں مزے سے پڑھے گی، پہلے وہاں جیل رہتا تھا کرا
نے رات ہی کسمہ دیا کہ وہ کمرہ عالیہ کو دے دو اور دلہن تم تو بیس میرے پاس رہ
گی؟“ بڑی چچی نے اماں سے پوچھا۔

”ہاں بیس رہوں گی۔“ اماں ایک لمحے تک کچھ سوچنے کے بعد بولیں۔ شا
انہیں وہ زمانہ یاد آگیا ہوگا۔ جب وہ بڑی چچی کو منہ لگانا پسند نہ کرتی تھیں۔
چاری بڑی چچی لئے بچے گھر کی لڑکی تھیں، مگنی ہو گئی تھی اس لئے دادی نے مجھ
ہو کر بیاہ لیا تھا کیونکہ بڑے چچا جڈ کر رہے تھے، ویسے دادی کا تو پکا ارادہ تھا
جب دولت نہ رہی تو مگنی بھی تو ڈدی جائے۔

سوکھی ہوئی سچی چھڑی روٹی اور تھوڑے سے دودھ میں ادبٹی ہوئی چا۔
پیتے ہوئے عالیہ کو احساس ہوا کہ گھر کی اقتصادی حالت اچھی نہیں ہے۔

”کیسے مزے کا پراٹھا ہے، واہ وا بالکل کریم ہوا کی کھال کی طرح ٹنگ۔
ہے نا بچیا۔“ آخری بات چچی نے اتنے دیر سے کہی کہ کریم ہوا سن نہ سکیں۔

”مزے کے تو ہیں چھی۔“ عالیہ نے اپنی ہنسی روکی۔

”اللہ نے چاہا تو عالیہ کو اور منظر کی دلہن کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی، اچھے
دن نہیں رہے مگر جیل پاس ہو گیا تو پھر اس گھر کے دن پلٹ جائیں گے اور پھر اپنا
منظر بھی تو چھٹ کر آجائے گا۔“ بڑی چچی کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔

انہیں اگر اپنے بال بچوں کی فکر ہوتی تو آج جیل میں کیوں ہوتے
انگریزوں نے ان کا کیا بگاڑا تھا بھلا؟“ اماں نے لمبی سانس بھری اور پھر سر نیچا کر
کے چپکے سے آنسو پونچھ لئے، ذرا دیر کے لئے سب چپ ہو گئے جیسے کچھ سوچنے
لگے۔

”اللہ تو اس گھر کو بھی مصیبت سے بچاتا۔“ کریم ہوا آہستہ سے بڑبڑائیں۔

”کریم ہوا، دکان جانے کی دیر ہو رہی ہے، ناشتہ بھجوا دو!“ بیٹھک سے
ایک بڑی ٹیخف سی آواز آئی اور کریم ہوا نے جھلا کر چٹا پکا، پھر ڈالیا سے ایک
روٹی کھینچ کر کال لی، مٹی کی پیلی پیالی میں چائے انڈیل کر کریم ہوا کے لئے برآمد
سے نکل گئیں۔

”خوب ہیں یہ اسرار میاں بھی، بھئی حد ہے بے شرمی کی، جب تک کھانے
کو نہ مل جائے، مجال ہے کہ جین لے لیں، انہیں تو بس کریم ہوا ٹھیک کرتی
ہیں۔“ چھی زور سے ہنسی۔

”اچھا تو اب تک بیس ہے، یہ بڑے بھائی کا کارنامہ ہوگا۔“

”ہاں وہی ہے، کہاں جانے یہ بچپارہ بھی، پھر دکان بھی تو دیکھتا ہے۔“

بڑی چچی نے مجرموں کی طرح سر جھکا کر اماں کو بیٹی نظر نہیں دیکھا۔

”خوب!“ اماں نے بڑے مغنی خیر انداز سے کہا اور چھالیہ کانٹے لگیں۔

یہاں وہ کس قدر الگ تھلگ اور اونچے پر بیٹھی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

عالیہ نے سب کچھ خاموشی سے سنا اور ہمدردی کی ایک لہر اس کے سینے کے
پار ہو گئی۔ ”ہائے! اگر بچپارے اسرار میاں کے دوسرے بھائی آموں کی کھیاں

ہنسی ٹھٹھیاں نہ چوستے تو شاید آج زندہ ہوتے۔ اسرار میاں کے ساتھی تو ہوتے۔

اب یہ بچپارے تھا اتنے بہت سے جائز لوگوں کے سچ میں کیسے زندہ ہوں گے۔“

”ذرا دیر اپنی دادی کے پاس جا کر بیٹھو۔“ اماں نے اسے حکم دیا اور وہ

جلدی سے جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آپا کی موت اور اپا کی گرفتاری نے اسے بڑا سادت مند بنا دیا تھا۔ شاید اس طرح اماں کو خوشی محسوس ہو۔
شام کے وقت تو دادی سے کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی۔ ایک تو سفر کی ٹھکان تھی۔ دوسرے دادی پر دے نے حملہ کر رکھا تھا۔

عالیہ کو دیکھتے ہی دادی نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ دہلے دہلے مرجھائے ہوئے ہاتھوں کی کھال لٹکی ہوئی تھی۔ مگر انتہائی کزوری کے باوجود ان کے چہرے سے رعب واپ برس رہا تھا۔ عالیہ نے بڑی عقیدت سے ان کے پھیلے ہوئے ہاتھ حتم لے اور اپنا سر ہولے سے ان کے سینے پر ٹکا دیا۔ ”مجھی اپنے اٹنے پلٹے بسز کو ٹھیک کر رہی تھی۔ طاق میں رکھی ہوئی لائین کو اب تک کسی نے نہ بچھایا تھا۔“

”منظر تو پھر کبھی نہ آیا، میری آنکھیں اسے دیکھنے کو ترس رہی ہیں۔“
دادی نے ٹھنڈی سانس بھری اور عالیہ نے ہونٹ سمجھنے لے۔ دادی سے تو سب نے چھپایا تھا کہ ان کا بیٹا جیل میں ہے اور وہ بھی اقدام قتل کے سلسلے میں۔
”چھٹی نہیں ملتی دادی، اب ان کا نام بہت بڑھ گیا ہے، اسی لئے تو انہوں نے ہم سب کو یہاں رہنے کے لئے بھیج دیا ہے۔“ وہ دادی کی نظروں سے بچنے کے لئے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”شکر ہے کہ پھر سب اکٹھے ہو رہے ہیں، کیا پتہ تمہارا چھوٹا بچا بھی آ جائے۔“ دادی کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آ گئی۔

”مجھی نے لائین کی چٹی اونچی کر کے پھونک مار دی۔ لمبے سے کمرے میں دو اونچی اونچی سیاہ رنگ کی مسریوں اور دو کرسیوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ دیوار پر مولانا محمد علی جوہر کی ایک تصویر لگی ہوئی تھی جس کے فریم پر جانے کتنی آندھیوں کا غبار جمع تھا۔“

”منظر بیٹے کا کوئی خط بھی آیا؟“

”نہیں دادی، وہ بہت مصروف رہتے ہیں۔“ اپا کی یاد سے اس کا دل کٹ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے، مردوں کی یہی شان ہے کہ کام کریں، تمہارا چھوٹا بچا۔“
دادی نیکی کے سارے ذرا سی اونچی ہو گئیں۔ ”تم کو پتہ ہے ناکہ وہ خلافت لے زمانے میں چلا گیا، پھر نہیں آیا۔ اس وقت خلافت کا بڑا زور تھا، مجھے ایسی باتیں پسند نہیں، مگر دوسرے گھروں میں عورتیں ٹوپیاں کاڑھ کاڑھ کر پنڈے دیتی تھیں۔ انہوں نے گانے بنا رکھے تھے، کیا تھا وہ بھلا سا گانا۔“ دادی تیاریوں پر ملبی ڈال کر سوچنے لگیں۔ ”ہاں وہ یاد آیا۔“

بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ سب فضول باتیں ہیں، اسی طرح تمہارے بڑے بچا بے وقوفی میں پھنس گئے ہیں۔“ مگر اب میری بات سنتا کون ہے، خیر کبھی تو عقل آئے گی، اور۔“
”ہے کتنا گندہ کمرہ ہو رہا ہے، اس پر سے دادی کے تھوک اور پیشاب کی بو، مگر میں اپنی دادی کو کسی اور کمرے میں تھوڑی رہنے دوں گی، یہ تو میرا اپنا کمرہ ہے، بڑی چچی کہتی ہیں کہ میں اسی کمرے میں پیدا ہوئی تھی۔“ ”مجھی جلدی سے لہرے سے چلی گئی اور پھر بھاڑو لے ہوئے واپس آ گئی۔ آج اسے صفائی کا بہت خیال آ رہا تھا۔ گندے کمرے کی وجہ سے وہ شرابا شرابا عالیہ کی طرف دیکھ رہی تھی اور عالیہ سوچ رہی تھی کہ اپا کہاں ہوں گے، کس جیل میں ہوں گے، ان کا خط اب آئے گا۔“

اتنی سی باتیں کرنے سے بھی دادی کی سانس پھولنے لگی مگر جب ”مجھی نے بھاڑو دے کر دھول اڑانی شروع کی تو انہیں زور کا دورہ پڑ گیا۔ مارے کھانسی کے ان سے سانس نہ لی جاتی۔ عالیہ گھبرا کر ان کا سینہ سلا رہی تھی مگر ”مجھی بڑے اطمینان سے بھاڑو دے رہی تھی۔“

دادی کے چہرے سے لہینہ بہہ رہا تھا اور مارے کرب کے آنکھیں ابلی پڑتی تھیں، عالیہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ کرکین بوا جھپٹ کر اندر آئیں اور دادی کے پاس نہ گئیں۔ ان کے دونوں ہاتھ آنے سے بھرے ہوئے تھے۔

”ماکھن۔۔۔ ماکھن۔“ کرکین بوا عجیب سی چیتابی کے ساتھ دادی کو

”سلا رہی تھیں اور ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھے جیسے اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو روک رہی تھیں۔“

”ارے مہمی بڑی چچی سے کمر جلدی سے ڈاکٹر کو بلائیں۔“ عالیہ پہلی دفعہ دسے کا اتنا شدید حملہ دیکھ رہی تھی۔

”حد کردی بچیا، بھلا اتنی سی بات پر ڈاکٹر آیا کرتے ہیں، دادی کو تو اسی طرح دورہ پڑتا ہے، سہانے خیرے کی ڈیبا رکھی ہے، ذرا سا چٹا دجے، اتنے بپے لکمان کہ ہر وقت ڈاکٹر کو بلایا جائے، آپ تو خواہ مخواہ گھبرا گئیں۔“ مہمی دوپٹے میں منہ چھپا کر اپنی ہنسی روکنے لگی۔

عالیہ نے حیران ہو کر مہمی کو دیکھا، وہ دبیز سے باہر کوڑا چھینک رہی تھی۔ کیا وہ بھی میاں بیار پڑے گی؟ اس نے ڈر کو سچا — ابا تو ذرا سی چھینک پر ڈاکٹر کو بلوا لیتے تھے، لیکن میاں تو مہمی ڈاکٹر کے نام پر ہنستی ہے۔ کھانسی کی آواز سارے گھر میں گونج رہی ہے مگر یہ آواز صرف کریمین بوا کو سنائی دیتی ہے۔ سب اپنے کاموں میں لگے ہیں۔ کوئی ادھر نہیں آتا۔

ذرا دیر بعد دادی کی سانس ٹھیک ہو گئی اور وہ جیسے تھک کر لیٹ گئیں۔ کریمین بوا ان کے چرے سے ہلینے پونچھ رہی تھیں — ”اب کیا حال ہے! ماکن؟“ کیسی تڑپ تھی کریمین بوا کی آنکھوں میں۔ دادی نے ”ہوں“ کر کے آنکھیں بند کر لیں تو پھر کریمین بوا کو آٹا گوندھنا یاد آ گیا۔

”مہمی کو بلاؤ۔“ دادی نے آہستہ سے کہا تو وہ کمرے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر مہمی کو آواز دینے لگی۔

”کسے جب منہ دھو لو گی تو آؤں گی، ہر وقت بلاتی رہتی ہیں۔“ مہن میں بھی ہوئی چوکی پر مہمی بیٹھی منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ جانے وہ اور کیا بڑبڑاتی رہی۔ دادی کے رعب کی ساری کمائیاں اس کی آنکھوں کے سامنے اڑاڑ دم ہو گئیں۔

”جلدی چلو عالیہ، سامان ٹھیک کرالو۔“ برآمدے سے اماں کی آواز آئی تو وہ پچکے سے دادی کے پاس سے سرک آئی۔ وہ اس وقت آنکھیں بند کئے بڑے سکون سے سو رہی تھیں۔

جیل بھیا کو اس وقت اس نے بڑے غور سے دیکھا۔ وہ ایسے خاصے تھے مگر ان کی آنکھیں چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، پھر ان آنکھوں میں ایسی گمراہی تھی کہ غور سے دیکھتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی۔ اس وقت وہ سب سامان ٹھکانے لگانے کے بعد جیسے تھک کر دالان کی عراب کے پتوں بچ آکڑوں بیٹھے تھے۔ اماں بہت بیزار نظر آ رہی تھیں۔ بس کچھ ایسی کیفیت جیسے کسی طویل سفر سے دو چار ہو گئی ہوں اور منزل بہت دور ہو۔

”یہ سڑکب ختم ہو گا؟“ عالیہ نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر اپنے بستر بند کی طرف بڑھی جو مہن میں ایک طرف ہڑا ہوا تھا۔ اس کا بکس اور بستر اوپر کی منزل کے چھوٹے کمرے میں جانا تھا۔

”میں لے چلتی ہوں بچیا۔“ مہمی کے غرارے کی پہنی ہوئی گوٹ زمین پر لٹ رہی تھی۔ وہ بستر بند کے تھے چھیننے لگی۔

”تم ہٹ جاؤ بے وقوف۔“ جیل بھیا بڑی تندہی سے اٹھ کر مہمی کے ہاتھ سے تے کھینچنے لگے۔

”ذرا ہوش میں رہیے گا بھیا، ہاں۔ میں بچیا کی وجہ سے آپ کو جواب نہیں دیتا چاہتی ورنہ۔“ مہمی کا چہرہ سرخ ہو گیا — ”ہٹ جائیے میں خود لے جاؤ گی بچیا گا بستر۔“ مہمی نے جیل بھیا کا ہاتھ جھٹک دیا اور بستر بند چھینٹ کھینٹ کر ڈیوں پر چڑھنے لگی۔ جیل بھیا چوکی پر بیٹھ کر مہمی سے مزے سے تماشہ دیکھنے لگے۔ بستر بند کی رگڑ سے ڈیروں دھول اڑ رہی تھی۔

”ارے مہمی، مگر جانے گی، کیوں اپنی جان کے لاگو رہتی ہے۔“ بڑی چچی بان لگاتے لگاتے گھبرا کر اٹھ گئیں۔

”مگر نے دو اماں کبھی تو میں بھی اسے بے بس دیکھوں۔“ جیل بھیا کھسکا کر

”واہ کیا بات ہے، بے بس دیکھ کر خوش ہوتے ہیں جیل بھیا، پھر اس سے اور اماں سے تو بہت خوش ہوں گے۔“ عالیہ نے طرے سے جیل بھیا کی طرف الجھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ وہ تو پہلے ہی اسے نکلیوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ

جلدی سے ہمچی کے پیچھے ہوئی مگر بستر بند پہلے ہی اوپر جا چکا تھا۔ ہمچی اسے دیکھ کر بڑے غم سے مسکرائی۔

”دیکھئے بچا میں لے آئی نا اکیلے، بڑے آئے جمیل بھیا، ذرا سامان اٹھا کر تھک بیٹھے تھے، بستر بند اوپر چڑھتا تو ہانپنے لگتے۔“ وہ زور سے نفی۔

”ارے یہ گوٹ بھی پھٹ گئی۔“ اس نے پا جائے کی گوٹ اس طرح دیکھی جیسی ابھی دیکھ رہی ہو۔ اب بھلا وہ کیسے کہتی کہ یہ گوٹ تو اس وقت بھی پھٹی ہوئی تھی جب اسے پینے کے لئے بکس سے نکالا تھا۔ یہ برسوں پرانے کپڑے تو اس کی اماں مرحومہ کے تھے جو اب اس کا حق ڈھانک رہے تھے۔

عالیہ ہمچی کے ساتھ مل کر بستر بند کھولے لگی۔ شام کا بھینٹا ہو چلا تھا مگر ابھی گلی میں روشنی نہ ہوئی تھی۔

رات کو وہ جس بستر پر لیٹی تھی اسے سمیٹ کر اپنا بستر لگا دیا۔ اسنے میں جمیل بھیا اس کا بکس اٹھائے آگئے۔ ”عالیہ یہ کمرہ تمہارے لئے ٹھیک رہے گا“ پہلے میں اس کمرے میں رہتا تھا، اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ گلی سے بجلی کی خیراتی روشنی بھی مل جاتی ہے، میں نے بیٹیں لی۔ اسے کی تیاری کی ورنہ لائٹیں کی روشنی میں تو آنکھیں پھوٹ جاتیں۔ یہ بڑا کمرہ بھی خالی رہتا تھا۔ یہاں کوئی نہ آتا تھا۔ بس کسی کسی وقت کوئی چگاڈو آ جاتی تھی۔ جمیل بھیا نے ٹیکسیوں سے ہمچی کو دیکھا مگر وہ بڑی خاموشی سے کمرے کے باہر کھلی چھت پر جا کھڑی ہوئی تھی۔

”کیا آپ کی شادی اسی بد تمیز سے ہو رہی تھی۔“ اس نے سخت ناگواری سے سوچا۔ ”ارے تو وہ اس کے ساتھ چند دن بھی نہ بیٹیں، کیا یہ وہی شخص ہے جس کا نام آپا کے ساتھ لے کر وہ خوش ہوتی تھی۔“

عالیہ نے اپنا بکس ٹھکانے لگا دیا اور جمیل بھیا سے کوئی بات کہنے بغیر ہمچی کے پاس چلی گئی، جاتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا، جمیل بھیا جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے تھے۔

”آپ سے ملنے کا اتنا شوق تھا بچا کہ بس کیا بتاؤں۔“ ہمچی بولی ”بڑے بچے اور بڑی چچی آپ کی بڑی تحریف کرتے تھے۔ آپ پڑھی ہوئی ہیں نا، اسی لئے بڑے

بچا تحینہ آپا سے جمیل بھیا کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ میں تو جاہل ہوں نا بچیا؟“

”تم تو بغیر پڑھے اتنی پیاری ہو، ہمچی، میں تو تم سے مل کر سب سے زیادہ خوش ہوئی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”میں خط بھی لکھ لیتی ہوں اور پڑھ بھی لیتی ہوں، بس اسکول نہیں گئی نا۔“ ہمچی نے بڑے غور سے بتایا۔

”تم اس سے مل کر ذرا بھی خوش نہیں ہو، تم یہاں کسی سے بھی مل کر خوش نہیں ہوگی، تم تو مجھ پڑھی لکھی لڑکیوں والا اخلاق دکھا رہی ہو۔“ جمیل بھیا نے بڑے مزے میں کہا اور ہاتھ ہلا ہلا کر چھت پر ٹھٹھنے لگے۔ کسی نے دیکھا ہی نہیں کہ وہ کب آکر پیچھے کھڑے ہو گئے تھے۔

”پتہ نہیں آج جمیل بھیا کہ کیا ہو گیا ہے، آپ کو دیکھ کر ان میں کچھ شان آ گئی ہے بچیا، ویسے تو یہ حال تھا کہ میرے بغیر کوئی کام نہ ہوتا۔“ ہمچی نے ترچھی نظروں سے جمیل بھیا کو دیکھا۔

”میں کمرہ رہا ہوں ہمچی کہ اب تم نیچے چلی جاؤ۔“ جمیل بھیا جانے کیوں ایک دم بخید ہو گئے۔

”کیوں جاؤں؟ اس گھر میں میرے باپ کا بھی حصہ ہے، جہاں چاہوں گی، نہیں گی، بڑے آئے۔“

”اچھا تو پھر میں ہی چلا جاتا ہوں۔“ جمیل بھیا بڑی تیزی سے سیڑھیاں طے کرنے لگے۔

عالیہ کے لئے یہ ساری باتیں کتنی عجیب تھیں۔ اس نے حیران ہو کر ہمچی کو دیکھا۔

”بھیا آپ پروانہ کریں، یہاں تو ہر دم ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔“ ہمچی نے شرمندہ نظر آ رہی تھی۔

”چلو میں اپنی کتابیں ٹھیک کر لوں۔“ اسے اچانک اپنی تعلیم کا خیال ستانے لگا۔ اللہ میاں اب وہ کیسے پڑھے گی، روپے کہاں سے آئیں گے، مگر جیسے ہی اسے

آیا کہ ماموں کے پاس اماں نے ڈھیر سے روپے جمع کرا رکھے ہیں تو اس نے

انجمنان کی ایک لمبی سانس لی۔

مٹی نہیں۔ ان کے ہاتھوں میں لمبی راکھ بھری ہوئی تھی۔
 ”کیا دادی سو رہی ہیں؟“ کلیل دلمبر کھڑے کھڑے کرے میں جھانکا۔
 ”سو رہی ہیں، پھر تم کو کیا؟“ مٹی نے اسے اڑانے کے انداز سے جواب
 دیا۔

”یکو مت، بڑی آئیں۔“ کلیل بھکارا۔
 ”ارے دادی سو رہی ہیں، چپ رہو کلیل، میرے بھیا۔“ عالیہ گھبرا کر
 لڑی ہوئی۔

”مجھے کچھ پیسے چاہئیں عالیہ بھیا، کتابیں خریدنی ہیں۔“
 ”دادی کی طبیعت خراب ہے اس وقت۔“ عالیہ نے اسے سمجھانا چاہا۔
 ”اب دھری ہے نا ان کے پاس روکر، سب کچھ تو لے گیا پاؤں دبا دبا کر
 ہلاک۔“ مٹی مارے غصے کے بول رہی تھی۔ ”اتنی ہی ست تھیں
 نیناں، کھا گئے سارے مل کر۔“

”تم سے تو کبھی پاؤں بھی نہ دباے گئے، بھکاری دادی پڑی تڑپتی ہوتی ہیں
 اور یہ لاٹ صاحب مزے کرتی ہیں۔“ کلیل نے جواب دیا۔

”میرے منہ نہ لگا کر کہنے، دیکھ تو ابھی بتاتی ہوں۔“ مٹی اپنی مسری
 نے کودی۔ دادی نے ایک لمبے لمبے آنکھیں کھولیں اور پھر کراہ کر روٹ بدل لی۔
 عالیہ کلیل کو کھینچتی ہوئی باہر لے آئی۔ کریمین ہوا میں چھپی ہوئی چوکی
 ہالٹین رکھ رہی تھیں۔ انہوں نے منہ ہی منہ میں کچھ کہا اور پھر برآمدے میں
 چلی گئیں۔

”ارے کلیل اب تو تم بڑے ہو رہے ہو پھر بھی لڑتے ہو، مٹی بھی تو تم
 کتنی بڑی ہے۔“ عالیہ نے اس کے شانے کو دبایا مگر وہ کچھ بھی نہ بولا۔ آستین
 نے آنسو پونچھ کر سر جھکائے کھڑا رہا۔

”لڑنا بڑی بات ہے میرے بھیا۔“ عالیہ نے اسے لپٹا لیا۔

”دادی مجھ سے محبت کرتی ہیں، وہ کہتی ہیں کہ میں جھوٹے بچا کی طرح
 ہوں اس لئے مٹی مجھ سے جلتی ہے، پھر دادی اب تک مجھے کتابوں کے لئے

مٹی کو دادی کا کوئی کام یاد آگیا اور وہ جلدی سے نیچے بھاگ گئی۔ عالیہ
 جب اپنی کتابیں میز پر رکھ رہی تھی تو اسے یہ دیکھ کر خوش ہوئی کہ جمیل بھیا اس پر
 میز پوش بچھا گئے تھے۔ یہ وہ میز پوش تھا جو رات جمیل بھیا کی میز پر بچھا ہوا تھا
 چلو جمیل بھیا اس کی تو عزت کرتے ہیں۔

کتابیں ٹھیک کر کے وہ کھڑکی سے نیچے کھلی میں جھانکنے لگی۔ بجلی کے جھبے کے
 تلے روشنی کا گول دائرہ پڑا ہوا تھا اور کھلی کے دو سرے سرے سے کوئی پھیری والا
 آ رہا تھا۔ اس کے سر پر رکھے ہوئے تھال میں دو لوہوں والا چراغ جل رہا تھا۔
 ”نیچے آؤ عالیہ بیٹی۔“ بڑی چچی کی بھاری سی آواز سن کر وہ جلدی سے اٹھ
 پڑی۔

اماں نے دادی کے کمرے سے نکلے ہوئے کہا۔ ”رات کی بارش سے سردی
 بڑھ گئی تھی، اس لئے تمہاری دادی کی طبیعت زیادہ خراب ہے، سردی تو اس
 مرض کی دشمن ہوتی ہے۔“ وہ بھی دادی کے کمرے میں چلی گئی۔ مٹی اپنی مسری
 پر بیٹھی پرانے کپڑوں کی مرمت کر رہی تھی اور بڑے مزے میں کوئی پرانی غزل
 سناتنا رہی تھی۔

جگر کے کھڑے ہیں یہ ہمارے جو بن کے آنسو نکل رہے ہیں

عالیہ کو دیکھ کر وہ گنا بھول گئی اور پرانے کپڑوں کے ڈھیر کو لحاف کے اندر
 چھپانے لگی۔ ”اب تو دادی بالکل ٹھیک ہیں بھیا۔“

عالیہ دادی کی پٹی پر ٹک گئی۔ وہ آنکھیں بند کئے بے سدھ پڑی تھیں۔ ان
 کا سبز اب تک ابھر ابھر کر ڈوب رہا تھا۔ اسے بیچن میں دیکھی ہوئی لوبار کی
 دھونکی یاد آگئی، جانے یہ زندگی کی آگ کب بجھ جائے، مارے بھر ددی کے اس کی
 آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بڑے طاق میں رکھی ہوئی ہالٹین کی روشنی ایک دم مدھم
 کتنے لگی۔ عالیہ نے دادی کے کپلے ہوئے ہاتھ کو چپکے سے لحاف میں چھپا دیا۔

کریمین ہوا کٹھنڑھی کئے ہوئے کمرے میں آئیں اور جبکہ کر دادی کو دیکھنے
 لگیں۔ ”ماکن“ انہوں نے دھیرے سے پکارا اور جواب نہ پا کر وہ قدموں

پیسے دیتی رہیں۔ یہ بات بھی کو سب سے زیادہ بری لگتی ہے، آپ ہی بتائیے کہ میں کس سے مانگوں۔ ابا، جمیل، بھیا، اماں، سب چیزوں کے نام پر چٹختے لگتے ہیں۔ کلکیل نے معصوم بچوں کی طرح سسکی بھری۔

”میرے پاس دو روپے ہیں، لوگے؟“ عالیہ نے پوچھا تو کلکیل مارے غم کے اور زور سے لپٹ گیا ”مجھ سے روپے لے کر کتائیں لے آنا۔“

”اچھا بھیا۔“

ثات کا پردہ سرکا کر وہ دالان میں چلی گئی۔ اماں اور بڑی چچی تخت پر بیٹھیں، اماں بالکل چپ تھیں مگر بڑی چچی بڑی خندہ پیشانی سے باتیں کرتے ہوئے چھائیہ کاٹ رہی تھیں، کلکیل کو دیکھتے ہی اس کی طرف ہلٹیں۔ ”پڑھتا بھی ہے یا گھومتا پھرتا ہے؟“ امتحان میں لپٹ نہ ہو تو جب کی بات۔“

”کہاں گھومتا ہوں، پڑھتا ہوں اپنے دوس کے ساتھ، میرے پاس تو پورا کتنا بھی نہیں، خواہ خواہ نوکٹی رہتی ہیں۔“ کلکیل نے بھی سختی سے جواب دیا، عالیہ نے دیکھا کہ اماں حیرت اور نفرت سے کلکیل کو رہی ہیں۔

”بھیا جب میں ملل کرلوں گا تو اسی سامنے والے اسکول میں پڑھوں گا کا بڑا اسکول ہے۔“ کلکیل کریمین ہوا کے پاس چولے کے سامنے بیٹھ گیا۔

”بہت آنے والا ہے۔“ کریمین ہوا لائین جلا کر بیٹھک میں رکھنے کو چاہا، گئیں، پھر واپس آکر آٹا گوندھنے بیٹھ گئیں۔ ”اللہ سلامت رکھے بڑے سادہ کو، وہ ہوں نہ ہوں کمرے میں روشنی تو رہے۔“

”بڑے چٹاکب آئیں گے؟“ عالیہ نے پوچھا۔

”جب ان کا جلسہ ختم ہوگا۔“ بڑی چچی بے بسی سے نہیں۔

جمیل بھی آجاتا تو کرم روٹی کھا لیتا۔“

”اللہ کرے مظہر میاں کا جیل سے خیریت کا خط آجائے، مولا تو ہی اپنی اماں میں رکھنے والا ہے۔“ کریمین ہوا نے آٹا گوندھ کر تو اچولے پر رکھ دیا۔

عالیہ کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اسے ابا سے کتنی محبت تھی، حالانکہ ام نے اپنے گھر میں کبھی ہنسی کھاتی زندگی کو نہ دیکھی تھی وہ ابا کو اماں کی تلخ زندگی

اسے دار سمجھتی تھی، اسے سیاست سے نفرت ہو گئی تھی، ابا کے مقاصد اس کی نظر میں کتنے بھونڈے تھے، پھر بھی وہ انہیں بے تماشہ چاہتی تھی۔ ابا کی حفاظت میں کتنا کمون محسوس کرتی تھی، مگر اب وہ اس محبت کی حفاظت سے محروم ہو گئی تھی۔

”بھیا اب آپ کالج میں نہیں پڑھیں گی؟“ کلکیل دو روپوں کے تصور سے لقا خوش نظر آ رہا تھا۔ گھر کے سامنے، گلی کے اس پار بڑے سے میدان میں بنی ”لی اسکول کی لال عمارت اس کی تمناؤں کا مرکز تھی۔ اپنے گھٹیا سے ملل اسکول سے بھاگ جانے کی کتنی خواہش تھی۔

عالیہ چپ رہی، اماں نے اسے بڑی دھکی نظروں سے دیکھا مگر ایسی نظریں جن میں عزم بھی تھا۔

ابا کی یاد نے اسے اتنا بے کل کر دیا تھا کہ وہ کریمین ہوا اور بڑی چچی کے اصرار کے باوجود ابھی طرح کھانا بھی نہ کھا سکی اور جلدی سے اٹھ گئی۔ کریمین ہوا بڑبڑاتی رہ گئیں۔ ”گھر والوں کی تو یہ چیزیں جیسی خود اکیس رہ گئی ہیں اور اصرار مسئلہ اتنا کھائے کہ پکا پکا کر ہاتھ ٹوٹ جائیں، اور۔“

جیل بھیا کو انہوں نے ایک مفت کے پرائمری اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔
 ذیل بھیا نے لی۔ اسے تک کس طرح پڑھا اس کی انہیں کوئی خبر نہ تھی۔ ٹھیک
 بڑھنے کے لائق ہوا تو جیل بھیا نے اس کو بار مار کر اسی پرائمری اسکول میں
 پڑھنے کو بٹھا دیا جہاں خود پڑھا تھا۔

جیل بھیا کی اپنے باپ سے نہ بنتی تھی، وہ خالص عشتیہ تک بندی کرتے
 تھے۔ مشاعروں میں جاتے تھے اور رسالوں میں بھیجی ہوتی غزلیں واپس پا کر
 ایڈیٹروں کو برا بھلا کہتے تھے۔

بڑے چچا جب تک گھر میں رہتے بڑی چچی اور کریمین بوا مسمانوں کے کھانے
 کے انتظام میں سارا دن گزار دیتیں۔ بڑے سے تیلے میں بڑا گوشت سروس کے
 تیل میں پکایا جاتا، ہندوؤں کے لئے کاناں سے پوری ترکاری خریدی جاتی۔ کریمین
 بوا اڈھروں روٹیاں پکاتے ہوئے بڑواتی رہتیں، خالص گھی کی خوشبو یاد کر کے ان
 کی آنکھوں میں آنسو آتے رہتے پھر بھی یہ گھر چل رہا تھا، سب کو پیٹ بھر روٹی
 ضرور مل جاتی۔

بڑے چچا سے جب گھری ضرورتوں کا ذکر کیا جاتا تو وہ سرخ پڑ جاتے۔ جانے
 ایوں جینچ بھنچ کر سب کی طرف دیکھتے، اپنے بوسے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے
 اور پھر بڑی انگ سے سب کو سمجھاتا ہے۔ ”جب ملک آزاد ہو جائے گا تو سب
 ٹکفیں دور ہو جائیں گی، تم لوگ ذرا گمراہی میں جا کر سوچو۔“

”کہاں تک جائیں گمراہی میں؟“ بڑی چچی کبھی کبھی جھلا اٹھتیں۔

”بڑے چچا کا مطلب ہے کہ کنوئیں میں گر جاؤ۔“ بھی ایسی باتیں سن کر
 ضرور مذاق اڑاتی اور وہ اس کی باتیں اس طرح نظر انداز کر جاتے جیسے کچھ سنا ہی
 نہیں۔ جانے بڑے چچا میں اتنا مبر کہاں سے آئی تھا، وہ گھر میں ہوتے تو کوئی نہ کوئی
 نڈو نشتر بنا رہتا مگر وہ ہنس ہنس کر سستے یا پھر باہر بھٹک کر راہ لیتے۔

بڑی چچی اس گھر میں اسے عبرت کی لائق معلوم ہوتیں۔ ان کی آنکھوں میں
 جب صدیوں کا دکھ سما ہوا تھا۔ اتنی بہت سی جانوں کی فکر صرف ان کے کانڈھوں
 وار رہتی۔ اسرار میاں دکانوں سے کچھ کاٹ پیٹ کر بڑی چچی کی نگہوں کو بھی

تھوڑے دنوں میں عالیہ کو گھر کے سارے حالات معلوم ہو گئے۔ بڑے پا
 نے جاگیر بیچنے کے بعد کپڑے کی دو بڑی دکانیں کھول لی تھیں جن کی گمرانی کم
 زمانے میں وہ خود کرتے تھے۔ انہوں نے یہ خوبصورت سا گھر بڑے چاؤ سے بنا
 تھا۔ گھر میں مثالی خوشحالی تھی مگر جب وہ بڑی سرگرمی سے سیاست میں حصہ لینے
 لگے تو دکانیں اسرار میاں کی گمرانی میں منتقل ہو گئیں۔ وہ بھی ان کی آمدنی
 چندوں اور سیاسی ورکروں پر خرچ ہو جاتی۔ بڑے چچا کی بار جیل جاسکے تھے
 انہیں قید تھائی اور بیڑیاں پہننے کی سزا بھی مل چکی تھی۔ ان کے پیروں میں موٹے
 موٹے سیاہ گٹے پڑے ہوئے تھے۔ پاؤں دھوتے ہوئے وہ ان سیاہ گٹھوں کو بڑے فخر
 اور پیار سے دیکھا کرتے۔ وہ اس قدر کمز کا گھریسی تھے کہ خالص مسلمانوں کی کسی
 بھی جماعت کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ انہیں تو ان کے مسلمان ہونے پر بھی شبہ
 رہتا۔ کانگریس کے سوا ہر جماعت کے لوگ ان کی نظر میں ملک کے غدار تھے۔

بڑے چچا اپنی دنیا میں اس قدر ممکن رہے کہ اپنے گھر کی دنیا کو بھول چکے
 تھے۔ اپنی پہلو گھی کی اکھوتی بیٹی کو ایک معمولی سے لڑکے سے بیاہ دیا تھا۔ وہ بھی
 صرف اس لئے کہ لڑکا کانگریسی تھا، اس وقت سے اب تک ان کی بیٹی چار عدد
 بچوں کے ساتھ اپنے آگن میں گوبر تھاپ تھاپ کر زندگی گزار رہی تھی۔ بڑے چچا
 کو بھلا اتنی فرصت کہاں تھی کہ اپنی بیٹی کے مستقبل کی فکر کرتے یا کوئی کھانا پیچ
 گھرانہ تلاش کرتے۔ بڑی چچی نے جب بیٹی کی جوانی کی بہت دہائی دی تو انہیں اپنے
 سیاسی کارکن سے زیادہ بہتر آدمی نظر نہ آیا۔ مگر چند ہی دنوں بعد بڑے چچا کو اس
 بہتر آدمی سے بھی نفرت ہو گئی کیونکہ وہ سیاست سے الگ ہو کر اپنی چند نیکیوں میں
 اور بیوی بچوں میں کھو گیا تھا۔ بڑے چچا پھر بھی اپنی بیٹی کے گھر نہ گئے۔

نہا کا انجام اس کے سامنے تھا۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ کتنی سمجھ دار ہو گئی تھی۔ نگرہوں اور غلوں نے اس کا بچپن کتنی جلدی چھین لیا تھا۔

کبھی کم کر دیا کرتے مگر خود دیر دیر تک بیٹھک میں پڑے، سالوں کی طرح چند روٹیوں کے لئے آوازیں لگاتے رہتے۔

ان ساری باتوں کے باوجود عالیہ کو بڑے بچا بہت اچھے لگے تھے۔ بس بالکل اسی طرح جیسے اسے اپنے ابا سے شکایوں کے بعد بھی آفاقی سے محبت تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ گھروں کے دکھوں اور تپاہوں کے طبعدار اس کے دل میں محبت کی پھل کیوں چھاتے رہتے ہیں، یہ کیسا خلوص تھا، کیسی محبت تھی کہ وہ ذرا سی بات پر ان کے لئے تڑپ اٹھتی۔ بڑے بچا جب گھر میں آتے تو وہ سب کام چھوڑ کر ان کے ہاتھ منہ دھونے کے لئے چوکی پر پانی رکھ دیتی، جب وہ ہاتھ منہ دھو کر تھکے تھکے سے اپنے بستر پر لیٹ جاتے تو وہ ان کے سر ہانے بیٹھ کر ہولے ہولے ان کا سر سہلائے لگتی۔ بڑے بچا اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر اسے دعائیں دیتے اور پھر سکون سے آنکھیں بند کر لیتے اور ہمیشہ دوپٹے کے پلو کو منہ میں اڑس کر اپنی ہنسی روکنے لگتی۔ ”ہائے بڑے بچا بچا پارے تھک کر چور ہو جاتے ہیں، کام ہی ایسا ٹھہرا نا۔“

عالیہ کو اس گھر کی زندگی اپنے گھر سے زیادہ جھگڑا اور تھکی ہوئی معلوم ہوئی، مگر وہ کسی نہ کسی طرح خود کو بھلا رہی تھی۔ بڑے بچانے اس کو اپنی کتابوں کی الماریوں کی چابیاں دے دی تھیں کہ وہ انہیں پڑھے اور دل و دماغ روشن کرے۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ یہ چابی جمیل بیبا کے ہاتھ نہ لگنے پائے۔ اس بے کار تک بند کے لئے یہ کتابیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ دوپہر کے سٹائوں میں وہ بڑی احتیاط سے ایک ایک کتاب نکال کر لاتی اور پڑھتی۔ اس کا دل ان کتابوں کے ہر اس کردار سے ہر ردی رکھتا تھا جنہوں نے آزادی اور انسان کی فلاح و بہبود کے لئے گولیاں کھائیں، مگر وہ ان سے خوف بھی محسوس کرتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایسے لوگ کسی سے محبت نہیں کرتے، یہ لوگ شادیاں کرتے ہیں، بچے ہوتے ہیں اور انہیں تباہ کر دیتے ہیں۔ ان کا اپنا گھر دنیا کے کسی حصے میں شامل نہیں ہوتا۔ ان کے گھر والے انسان نہیں ہوتے، یہ محبت کے قدموں کے کانٹے ہوتے ہیں جو ذرا دیر میں لوملہاں کر دیتے ہیں۔ اماں، بڑی چچی، کم دیدی اور تینین

نیا ہے، 'ابا کو کم سے کم سزا دو گی۔'

'کیا پتہ' وہ افسر مرا تو نہیں مگر الزام تو قتل کا ہے، جانے وہ کب آئیں،
ہائے اگر ان میں ذرا بھی شرافت ہوتی تو اپنے گھر کا خیال کرتے۔' اماں کو
شاید جیتے ہوئے تلخ دن یاد آ رہے تھے۔ وہ جانے کیا سوچ رہی تھیں۔

"دلہن، اسے دلہن!" نیچے صحن میں کھڑی ہوئی بڑی چچی اماں کو آواز دے
رہی تھیں۔ ساتھ ہی کھیل اور مہمی کے تو تو میں میں کرنے کی آوازیں آ رہی
تھیں۔

"آتی ہوں! اللہ کس مصیبت میں پھنس گئے۔" اماں بڑبڑائیں۔

"ہم اس سے زیادہ روپے نہیں منگائیں گے، تمہارے بڑے بچا کا فرض ہے کہ وہ
اماری ہر ضرورت کو پورا کریں، آخر تو ان کے بھائی کا قصور ہے، ہم خود سے تو ان
لے گھر آ کر نہیں بیٹھ گئے۔" اماں جواب نے بغیر چلی گئیں۔

تیسرا پہر تھا۔ دھوپ لوٹ چکی تھی۔ وہ بڑی دیر تک اپنے بستر پر اوندھی
پڑی رہی۔ گلی میں کھلونے والا جھنجھنا بجاتا اور بڑی سریلی آواز میں صدا لگاتا جا رہا
تھا، "یہ ریڈ والا بوا" یہ مستانہ بوا۔" مہمی لانے بھرنے کے بعد اب کھسی ہوئی
دیکھوں گے گراموں فون ریکارڈ بجا رہی تھی۔ اس نے سوچا اس طرح تو سارے
ریکارڈ خراب ہو جائیں گے، وہ کھیل سے کہہ کر مہمی کے لئے سویوں کی ایک ڈبیا
ضرور منگا دی گئی۔

دھوپ بجلی پڑ چکی تھی۔ کریں بوا چائے پینے کا شور مچا رہی تھیں، مگر اس کا
دھی نہ چاہا کہ نیچے جائے۔ وہ کھلی چمت پر آ کر اس کمرے پر لٹ گئی جو سارا
دن دھوپ میں پڑا پستابا رہا تھا۔ آس پاس کی چٹوں پر بچوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا
اور مکانوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی دھند سے فضا سرخی ہو رہی تھی۔

چنگ اب تک ہلکا سا گرم تھا، وہ اٹھ کر ٹپٹلے گئی۔ کیسا بجا بجا سا دھی ہو رہا
تھا۔ اس وقت تو ہی دل چاہ رہا تھا کہ کمرے سے نکل کر کہیں ہو آئے، مگر کہاں، وہ تو
اب سے آتی تھی اس کمرے سے باہر قدم نہ نکالا تھا۔ مہمی کا جب جی چاہتا برق
اڑھ کر گھروں گھروں پھر آتی، وہ بھی صرف مسلمان گھروں میں، ہندوؤں سے

ماموں کا خط آیا تھا۔ انہوں نے اماں کو لکھا تھا کہ ان کی بھالی کے مشورہ۔
کے مطابق وہ سارا روپیہ اکٹھے نہیں بھیجیں گے بلکہ تیس روپیہ مہینہ عالیہ کی قلعہ
کے لئے بھیجے رہیں گے، جس سے کپڑا وغیرہ بھی بن جائے گا۔ برے وقت میں زیادہ
روپیہ پاس نہیں رکھنا چاہئے ہر ایک کی نظر پڑتی ہے۔

اماں یہ خط پا کر بہت خوش تھیں اور تین مہینے بعد مٹی آرڈر وصول کرنے
ہوئے ان کے ہاتھ خوشی سے کانپ رہے تھے مگر عالیہ کو غصہ آ رہا تھا کہ ایک تو تیرہ
مہینے بعد پوچھا ہے۔ اس پر سے صرف تیس روپے مہینہ بھیجے کا فیصلہ کیا وہ ان
خراب حالات میں بھی بڑے بچا پر بوجھ بنی رہے گی۔ اماں سے کچھ کہنا بیکار تھا۔
ماموں کے خلاف کچھ کہہ کر وہ اماں کا دل نہ دکھانا چاہتی تھی۔ وہ بڑی خاموشی سے
اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ماموں کے خط سے اس کی جان جل گئی تھی۔ جس کے خط
کا بے چینی سے انتظار تھا وہ نہ آیا۔ ان تین مہینوں میں اپانے صرف ایک خط لکھا
تھا جس میں بڑے بچا کے پاس آ جانے پر اظہار خوشی کیا تھا اور عالیہ کو تعلیم جاری
رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ اپنے لئے ایک لفظ بھی نہ لکھا تھا۔

انہی وہ سوچ رہی تھی کہ اماں اور آگئیں۔ میڑھیاں چرنے کی وجہ سے
وہ بانپ رہی تھیں مگر ان کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو رہا تھا۔ بھالی کتنی ہو شیراز
ہیں، انہیں تو معلوم ہی ہو گیا ہو گا کہ یہاں سب نئے بھوکے ہیں، لوٹ کھائیں گے
اماں سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ "میں سے کہہ کر تم ایک
ماسٹر کا انتظام کر لو اور گھر بیٹے امتحان دو۔"

"مگر اماں ان روپوں سے کیا ہوگا، ہمیں اپنے سارے اخراجات برداشت
کرنے چاہئیں، کچھ دن کی بات ہے پھر ابا آجائیں گے، بڑے بچے بہت اچھا دیکھتا

پہنچی بیوی نے ان پر مصیبتوں کا پھاڑ توڑ دیا تھا۔ تابو توڑ بیچے پیدا کر کے انہیں ایسا جکڑا کر دنیا کا نہ رکھا۔ ادھر بھی سب کے لئے آزار بنی ہوئی تھی، باپ نے محبت سے ہاتھ کھینچ کر اسے دکھوں کا پوٹ بنادیا تھا۔

”میں تو بالکل اکیلی ہوں بچیا، آپ کو تو سب چاہتے ہیں، جمیل بیسیا بھی آپ کو بہت چاہتے ہیں، باہر سے آکر آپ ہی کے ارد گرد بھرتے ہیں۔“ وہ فطرسے انہی۔

عالیہ نے کاپ کر بھی کر دیکھا، اس کے سامنے مندی کا لہلہتا پودا سوکھ کر سیاہ پڑ گیا اور پھر کمر دیدی کی سفید ساری سے پانی کی بو دینے لگی۔

لا حول ولا، وہ اتنی بدھو نہیں ہے، اس کے ساتھ یہ کچھ نہیں ہو سکتا، وہ بے وقوف آدمی! جسے بڑے بچا اپنی کتابوں کی الماری کی چابی تک نہیں دیتے۔ ”بھئی تم تو بالکل بچہ ہو بس، تم مجھے سمجھتی کیا ہو، ایسے ایسے دس جمیل بیسیا آجائیں تو میرا لیا بگاڑ لیں گے۔“

بھئی نے عالیہ کی آنکھوں میں غور سے جھانکا جیسے وہ چ کی تلاش میں ہو، پھر پتھر مٹھن سی ہو کر عالیہ کے پلٹ گئی۔ ”میں خود بھی سمجھتی ہوں کہ ہماری بچیا اپنی تجویزی ہو سکتی ہیں۔“ وہ بڑے فخر سے انہی۔ ”پر بچیا آپ یہ تو بتائیں کہ اب اتنے روپوں میں گزارہ کیسے ہوگا۔“

”مجھے تو کوئی دس روپے بھی بھیجنے والا نہیں بھئی۔“ اسے ابایا د آگئے۔
”واہ میرے دس روپے جو ہوں گے، وہ آپ کے نہیں ہوں گے بچیا؟“
بھئی نے روٹھ کر پیالی اٹھالی۔

”بس یہ ٹھیک ہے، میں تم کو اس میں سے ایک بیسہ نہ دوں گی۔“ عالیہ نے اسے خوش کرنے کو کہا۔

”ارے ہاں بچیا وہ کل ہمارے کمرے میں جلد ہوگا۔“ بھئی سب کچھ بھول پڑ گئی۔

”کیا جلد؟“ عالیہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔

اسے لمبی بغض تھا۔ اس گھر میں تو اس کی دنیا صرف کتابیں رہ گئی تھیں۔ بڑے بچا کی کتابوں کی الماری کی چابی اس نے سنبھال کر اپنے بستر میں چھپا دی تھی۔

کریمین بوا چائے پینے کے لئے پکار رہی تھیں، ”وہ مجبوراً“ بچے جاری تھی کہ بھئی اس کی چائے کی پیالی لئے آئی، اس وقت بھئی کا کول کول چہرہ بے وقوفی کی حد تک سنجیدہ ہو رہا تھا اور آنکھیں بالکی سرخ پڑی ہوئی تھیں۔

”کیا بات ہے بھئی؟“ پیالی لیتے ہوئے اس نے پوچھا۔
”کچھ نہیں، ابامیاں کا خط آیا ہے۔“

”پھر سب خیرت ہے نا؟“ وہ بھئی کی سنجیدگی سے ڈر رہی تھی۔

”نہیں بچیا، انہوں نے لکھا ہے کہ اب تم کو صرف دس روپے مینڈ ملا کرے گا کیونکہ تمہارا ایک بھائی اور پیدا ہو گیا ہے، اس کا خرچ بھی بوجھا ہے، انہوں نے پورے پانچ روپے کم کر دیئے ہیں۔“
”ارے یہ بات ہے، بھائی مبارک ہو بھئی۔“

”میرا بھائی کیوں ہونے لگا، اللہ کرے مر جائے وہ، میری اماں کے ساتھ میرے سارے بھائی بن مر گئے، میں اکیلی ہوں، میرا کوئی نہیں۔“ اس نے ہونٹ لٹکا لئے۔

”ایسی باتیں نہ کرو بھئی۔“

”پھر آپ ہی بتائیے تاکہ ہمارے ابا جتنی شادیاں کریں اور ان سے بچتے پلے ہوں، وہ سب میرے بھائی بن ہوں گے؟“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
اس وقت وہ کتنی معصوم نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی ساخت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ لڑتے بھڑتے اور غصے سے پاگل ہوتے وقت بھی معصوم ہی رہتی۔

عالیہ نے بھئی کو لپٹا لیا، اس وقت بھئی نے دنیا کے عظیم بے ورد نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے دنیا میں بیویاں بدلنے کے سوا کوئی کام نہ کیا۔ بھئی کی ماں کے انتقال کے بعد انہوں نے دو شادیاں کیں اور دونوں کو ذرا ذرا سی بات پر طلاق دے دی۔ ان کا طلاق دینے کا بھی عجیب طریقہ تھا۔ ہینک میں جا کر طلاق لکھتے اور بیوی کو اندر بھجوا دیتے، بس اسی وقت سے بیوی سے پردہ کرنے لگتے مگر

”ارے مسلم لیگ کا جلسہ ’بیجا۔“

”پر بڑے بچا جو ناراض ہوں گے، تم دل سے رہو نا مسلم لیگی۔“ عالیہ نے اسے سمجھانا چاہا۔

”وہ کون ہوتے ہیں ناراض ہونے والے، میں کیا انہیں منع کرتی ہوں کہ کافروں کے جلسوں میں نہ جایا کریں۔“

”مگر تمہارے مسلم لیگی ہونے سے کیا فائدہ ہوگا؟“ عالیہ کو دکھ ہو رہا تھا کہ یہاں تو سب پاگل ہیں۔

”کچھ نہیں ہوتا، بس میں مسلمان ہوں اس لئے مسلم لیگی ہوں۔“ وہ بڑے فخر سے کہتی۔ ”بیٹائے نہیں گے بیجا، فیک رہیں گے نا؟“

”مجھی اتنے سے روپے آئے ہیں اور تم کو پورا مینہ گزارنا ہے، کیوں خواہ مخواہ یہ حرکتیں کرتی ہو۔“ عالیہ نے اسے پھر سمجھانا چاہا۔

”واہ پیسے روپے کی کیا بات ہے، میں تو اپنی جان تک بچاؤ کر دوں مسلم لیگ پر، پھر ہمارے کافر بچا کو پتہ چلے۔“ وہ جیسے کچھ یاد کر کے تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی بیچنے چلی گئی۔

”اری مجھی کیوں اپنی جان کے لاگو ہو رہی ہے۔“ بچے سے بڑی چچی کی آواز آ رہی تھی۔ عالیہ جھٹ سے ہٹ کر بڑے کمرے کی اس کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی جس سے چلی منزل کا صحن نظر آتا تھا۔

”واقعی بڑی ہے کسی لڑکی ہے، ہم نے یہ نیا طریقہ دیکھا کہ عورتیں بھی طے جلوس کریں، مردوں نے کیا کم کھروں کا ستیا ناس کر رکھا ہے۔“ اماں صحن میں بیچے ہوئے پلنگ پر بیٹھی چھایہ کاٹ رہی تھیں۔

”ہمارا جو بی چاہتا ہے کرتے ہیں۔“ مجھی نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا اور ہاتھ پر پڑا ہوا برقع اوڑھ کر باہر چلی گئی۔

”میں کیا کروں اگر اس کے بڑے بچا اس پر ناراض ہوتے ہیں تو مجھی میرا ہی جی رکھتا ہے۔“ بڑی چچی بھی اماں کے پاس ٹک گئیں۔ وادی کے زور سے کھانسنے کی آواز آئی تو کریم بن ہوا جلدی سے ادھر بھاگیں۔

شام کو مجھی کے کمرے میں جگہ جگہ سے پھنی ہوئی لمبی سی درری بچھ گئی اور اس پر سارے محلے کے بچے آکر بیٹھنے لگے۔ صحن کے ایک کونے میں وادی کا بستر لگا ہوا تھا۔ ان کے چنگ کے آس پاس کریم بن بوانے پانی چھڑک دیا تھا۔ وہ منھ سی پنپیا ہاتھ میں لئے ہوئے ہلا رہی تھیں اور بڑی عبرت ناک خاموشی کے ساتھ مجھی اور بچوں کا شور سن رہی تھیں۔ ان کے چہرے سے کرب کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ عالیہ ان کے سرہانے بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ سے چٹکیا لے کر ہنسنے لگی۔

”چلئے نا بیجا آپ بھی میرے جلے میں۔“ مجھی نے عالیہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”میں نہیں جاؤں گی مجھی، مجھے یہ باتیں ذرا نہیں اچھی لگتیں۔“

”مت جائیے، آپ کے بغیر جلسہ تو موزی ختم ہو جائے گا۔“ وہ روٹھ گئی۔ ”مجھے پتہ ہے ناکہ آپ بڑے بچا کا ساتھ دیں گی۔“

”تم کو معلوم ہے تو ٹھیک ہے، عالیہ ایسی بے ہودہ باتوں میں نہیں جاتی۔“ اماں نے بھی مجھی کو گھڑکا، مگر مجھی نے کوئی جواب نہ دیا، اس کا منہ اتر گیا تھا، وہ ہلدی سے کمرے میں چلی گئی اور بچوں سے نعرے لگوانے لگی۔

”ہائے اب میں کیا کروں دلہن، اس کے بڑے بچا بیٹھک میں ہیں، وہ یہ نعرے سنیں گے تو کیا ہوگا، دس بار کہا کہ جب جلسہ کرو تو میلاد پڑھا کرو مگر نہیں سنتی۔“ بڑی چچی مجھی کے جلے سے بہت پریشان نظر آ رہی تھیں۔

ارے اس کے باوا کو ہوش ہی کہاں جو اس کے دو بول پڑھا کر ٹھکانے سے لگا دیں۔“

”جیسے شوق ہو وہ خود اپنے دو بول پڑھوالے۔“ مجھی نے کمرے کی دہلیز پر آ

”بھئی مار لینے دیجئے، دل کی حسرت تو نکل جائے۔“ مہمی ڈٹ کر کھڑی ہوئی۔

عالیہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے جانا چاہتی تھی مگر وہ اسے بھی دھکے مار رہی تھی۔ کریمین یو دم بخود کھڑی تھیں۔ کچھ کہنے کی کوشش میں دادی کی سانس چڑھ گئی تھی اور اماں متاثریوں کی طرح چنگ پر بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔

”مہمی اندر چلو میری بہن، میرا کتنا نہیں مانتیں؟“ عالیہ نے منت کی تو مہمی اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”میں کیا کروں، مجھے کس قدر عاجز کیا ہے سب نے“ عالیہ بیٹی تم ہی ان لوگوں کو سمجھایا کرو۔“ بڑے چچا کا غصہ روفو پکڑ ہو چکا تھا اور وہ بڑی بچکاری سے عالیہ کو دیکھ کر لاپٹی بے بسی کی داد چاہ رہے تھے۔ چند منٹ بعد وہ سر جھکائے بیشک میں پلے گئے اور زردا دیر کو سناٹا چھایا۔

”ہائے اپنے زمانے میں کاہے کو یہ سب کچھ دیکھا ہوگا۔“ کریمین بوا پڑے پر بیٹھ کر اپنے آپ سے کہہ رہی تھیں۔ ”یہ مالک مظفر مرحوم کا خاندان ہے“ انہیں تو قبریں بھی جین نہ ملتا ہوگا، مالک۔“

رات کا اندھیرا پڑنے لگا تو کریمین بوائے لائینش جلا کر ہر طرف رکھ دیں اور صحن میں بچے ہوئے کمرے چلتوں پر بستر لگا دیئے۔ مہمی کے کمرے سے اس کی ادھی دھیمی سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔

”مہمی کا کیا ہے؟“ دادی نے عالیہ کی طرف دیکھ کر دھیرے سے پوچھا۔ اب ان کی سانس قابو میں آچکی تھی۔ محبت نے دم اٹکا رکھا ہے۔“

عالیہ سے کچھ بھی نہ کما گیا، اس نے دادی کا ہاتھ تھام لیا۔ اس زندگی کے ہاتھ کتنے بکھیرے ہوتے ہیں۔ مہمی دادی کو کچھ بھی نہ سمجھتی تھی مگر وہ بستر پر بڑے اس کا سارا بتی ہوئی تھیں۔

”کیا ہوا ہے عالیہ بیگم؟“ جمیل بیما نے کمر میں داخل ہوتے ہی سوال کیا اور پھر لوہے کی زنگ آلود کرسی پر بیٹھ گئے۔ ”اس وقت بڑا سناٹا چھایا ہے۔“

کر جواب دیا اور پھر معروف ہو گئی۔

”ارے نکلیل اٹھ کر بیشک کا دروازہ بند کر دے تاکہ آواز نہ جائے۔“ بڑی چچی مہمی کی بات کا برا ماننے کے بجائے اس کی حفاظت کے سامان کر رہی تھیں۔

”میں کیوں بند کروں، اچھا ہے اب ایک دن اس کی ہڈیاں توڑیں۔“ نکلیل اپنے نپٹے میں بیٹھ نکلتے ہوئے بڑے مڑے میں لگا۔

”کجو اس کرتا ہے، کتنی بڑی ہے تجھ سے مہمی۔“ بڑی چچی نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور کریمین بوا کشتی میں چائے کے برتن رکھتے ہوئے اٹھ پڑیں۔ بیشک کے دروازے بند کر کے وہ بھر برتن لگاتے لگیں۔

نعرے لگانے کے بعد سارے بچے مہمی کے ساتھ گارے تھے۔

کاشی میں تلخی تو بوئی بکریاں سب چر رہیں

گاندھی جی ماتم کرو ہندو کی نانی مر گئیں

مہمی کے اس خود ساختہ گیت کو سن کر عالیہ ہنس پڑی مگر جیسے ہی اس نے دیکھا کہ بڑے چچا بیشک کے دروازے کے پاس کھڑے ہیں تو گھبرا کر مہمی کو پکارنے لگی۔ مہمی نے مڑ کر دیکھا اور پھر آرام سے بچوں میں بتائے ہانپنے لگی۔

”ارے اس پاگل، جاہل کو کوئی نہیں سمجھتا، میں ایک دن اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔“ بڑے چچا صحن میں آکر کھڑے ہو گئے۔ غصے سے ان کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

بچے بھرا مار کر بھاگ پڑے۔ ایک بچے کے بتائے مگر کر کھڑے کھڑے ہو گئے تھے اور وہ بڑے چچا کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ دیکھ کر انہیں جھن رہا تھا۔

”آپ تو بہت قائل ہیں نا، مجھے بہت پڑھایا لکھایا ہے جو جہالت کے طعنے دیتے ہیں۔“ مہمی بھلا کیوں چپ رہتی۔

بڑے چچا اس کی طرف لپکے تو بڑی چچی بیچ میں آگئیں۔ ”بہ کیا دیوانے ہو گئے ہو، جوان لڑکی پر ہاتھ اٹھاؤ گے؟“ بڑی چچی ہانپنے لگیں۔

جیل بھیا جب اسے عالیہ بیگم کہتے تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ زہرا گل رہے ہیں، وہ چپ رہی۔

مسلم لیگ کا جلسہ ہوا تھا یہاں، بڑے بھیا نے ڈانٹا تھا جس اتنی سی بات! اماں نے بڑے فسادی انداز میں کہا۔

”خوب! خوب!“ وہ زور سے ہنسنے لگا، ”پھر ہمارے ابا کی رگ جیت پھڑک اٹھی ہوگی، واہ کیا عظیم آدمی ہیں ہمارے ابا بھی، یہ گھر ان کی عظمت کا مثلاً نمونہ ہے۔ برسوں سے کانگرس کی غلامی کر رہے ہیں اور مجھے ایک نوکری نہ دلا سکے، حالانکہ اب کانگرس کی وزارت بھی بن گئی ہے۔“ جیل بھیا پھر ہنسنے لگا۔

”ہاں اب تم آگ لگاؤ، ذرا پاس لحاظ نہیں باپ کا“۔ بڑی چچی پھر ہنسنے لگی۔ ”کانگرس کی خدمت کرتے ہیں۔ تو کسی لالچ سے تھوڑی کرتے ہیں۔“ ”اماں آپ کیا جانتی ہیں، ارے مجھے سخت بھوک لگی ہے، اگر ابا کے مہمانوں سے کچھ بچا ہو تو مجھے بھی کھلا دیجئے۔“ جیل بھیا مذاق پر قہقہے مارتا تھا۔

”ہیں ہر دم نکلاؤں کرتا ہے، کہیں اور سے کھا کھا کر اتنا بڑا ہو گیا ہے، یہاں تو بھوکا مرنے لگا۔“ بڑی چچی چیخ پڑیں۔

”جیسی اماں تو خواہ مخواہ غرض ہوتی ہیں“۔ جیل بھیا ہنس پڑے۔ ”اچھا تم ہی بتاؤ عالیہ بیگم کہ ہمارے ابا یہاں جس دنیا کو بنانے کی فکر میں ہیں کیا ہم اس کے باشندے نہیں ہیں، آخر ہمیں کیوں تباہ کیا جائے؟ اور مظہر چچا جو ایک انگریز کا سربراہ کر جیل چلے گئے تو انہوں نے کون سا کارنامہ انجام دیا؟ کیا انہوں نے تم سب کو تباہ نہیں کیا؟ اب تم کو اس گھر میں کتنی تکلیف ہوگی، تم لوگوں نے کتنے ٹھٹھ کی زندگی گزار لی تھی، ابھی تو میں بھی کسی لائق نہیں ورنہ“۔ وہ ایک لمبے کو رک کر عالیہ کو دیکھنے لگے۔

”آپ ایسی باتیں نہ کیجئے جیل بھیا، دادی کہیں سوتے میں بھی نہ سن لیں۔“ وہ جلدی سے جیل بھیا کے پاس آکر آہستہ سے بولی۔

”جائے بھالی کس طرح یہ سب کچھ برداشت کرتی ہیں، میں تو ان سے لڑا کر تھک گئی تھی، بھلا کیا ملا انہیں انگریز دشمنی میں؟“ اماں نے ٹھنڈی آہ بھر کر پانچ

لی گھوری منہ میں رکھ لی۔

”کیا تم میرے ساتھ کھانا نہ کھاؤ گی، عالیہ بیگم؟“ جیل بھیا نے کہیں بولا۔

”نہایت سے کشتی لیتے ہوئے پوچھا۔“

”نہیں بھئی، ابھی ہمیں بھوک نہیں۔“

وہ اٹھ کر بھیجی کے کمرے میں چلی گئی۔ ”وہ اب تک اپنے بستر پر اوندھی پڑی سبک رہی تھی۔“

”چلو باہر بیٹیں بھئی، اندر تو بڑی گرمی ہے۔“ عالیہ نے اسے زبردستی اٹھایا۔

”چھت پر چل کر مٹلیں گے۔“

بھئی کمرے سے تو نکل آئی مگر جیل بھیا کو دیکھ کر وہیں بیٹھ گئی۔

”آپ جائے مٹلے۔“

بچے کے کھٹے ہوئے ماحول سے اوپر کی کھلی فضا میں آکر اسے بڑا سکون محسوس ہوا۔ گرمیوں کے غبار میں ڈوبی ہوئی چاندنی میں بھی بڑی میٹھی سی خشکی تھی۔ گلی میں بچے بڑے جوش و خروش سے ریل ریل کھیل رہے تھے۔ زیادہ خوش ہوئے تو مسلم لیگ زندہ باد اور کانگرس زندہ باد کے دو چار نعرے بھی لگا دیئے۔

اب وہ سٹیج پہنچے اور چمک چمک کرتے اور چلے جاتے تو ایک دم سناٹا چھا جاتا۔ چھت کی منڈیر کے پاس کھڑے ہو کر اس نے دیکھا کہ ہائی اسکول کی عمارت اور انٹوں کے کھٹے سائے کی وجہ سے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

وہ دیر تک اس عمارت کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ ایک دن لیل اسی اسکول میں پڑھے گا، اسے اپنے خواب کی تعبیر ضرور ملے گی۔ گھر اس کے مارے خواب اڑا دھم ہو گئے، اب وہ کسی کالج میں نہ پڑھ سکے گی، پھر بھی اسے ”منا ہے“ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے، ابا کب آئیں گے یہ کوئی نہ جانتا، بڑے چچا اسے کتنے مایوس نظر آتے۔ جب وہ ابا کے مقدمے کے سلسلے میں بات کرتی ہے تو وہ اصرار دھری باتیں چھیڑ دیتے۔

سوچتے سوچتے جب عالیہ نے آسمان کی طرف دیکھا تو چاند اسے بڑا مایوس معلوم ہوا۔

”عالیہ۔“

اس نے چونک کر دیکھا تو جیل بھیا اس کے پیچھے کمرے تھے۔ ”بھار اکیلے کیا کر رہی ہو؟“

”کچھ نہیں بھیا۔“ تنہائی میں بھیا کے وجود سے وہ گھبرا گئی۔ بھیا ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔

”یہاں گھبراتا ہوگی عالیہ، اگر تمہیں زندہ ہوتی تو شاید تم خوش رہتیں اور شاید ہماری شادی بھی ہو چکی ہوتی، یقین جانو کہ شادی میری انتہائی مخالفت کے باوجود ہو رہی تھی، پھر بھی جب وہ مری ہے تو ایک بار مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں زندہ ہو گیا ہوں۔“ جیل بھیا نے جیسے دکھ سے آنکھیں بند کر لیں۔

”مگر اب آپ ان باتوں کا ذکر کیوں کر رہے ہیں؟“

”وہی ہی مجھے اس سے ہمدردی تھی نا، مجھے سب کچھ معلوم تھا نا، اور مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ وہ اپنی موت نہیں مری۔“ جیل بھیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”اب تو میں آپ کے گھر میں ہوں، جو چاہے کہنے۔“ اس نے منہ پھیر لیا مگر جیل بھیا پھر اس کے سامنے آگئے۔ ”سنو تو عالیہ، میں اتنا برا تو نہیں ہوں بات یہ ہے کہ صفدر کا میرے پاس خط آیا تھا اس نے التجا کی تھی کہ تمہیں سے شادی نہ کرو، مجھے اس سے محبت ہے، پھر بھی میں اس شادی کو رکوانہ سکا۔ آپا ایک اپنے کو مجرم سمجھتا ہوں۔ اگر میرا بس چلتا تو صفدر اور تمہیں کی شادی کرا کے دم لیتا، مگر۔“ وہ ایک لمحے کو چپ ہو گئے۔ ”تم تو مجھے مجرم نہیں سمجھتیں؟“

”ارے یہ تو سب کچھ جانتے ہیں۔“ اس نے حیران ہو کر جیل بھیا کا طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ آپا کا راز افشا دیکھ کر اسے جیل بھیا کی صورت سے نفرت ہوئے لگی۔ ساری باتیں تھری طرح اس کے کلیجے میں چھد کر رہ گئی تھیں۔

”اگر میں چاہوں تو ابھی اپنے ماموں کے گھر جا سکتی ہوں۔“ ماموں کی حقیقت جانتے ہوئے بھی وہ اور کس کا نام لے کر دمکاتی۔

تم جا ہی نہیں سکتیں، مجھے تم سے محبت ہے، پھر میں کیا کروں گا۔“ جیل بھیا کا لپیٹا ہوا ٹھنڈا ہاتھ اس کے ہاتھ کو دبوچنے لگا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ جھٹ میں دھنس رہی ہے، مارے گزوری کے وہ اپنے کو بچا بھی نہیں سکتی۔ اس نے بڑی بے بسی سے جیل بھیا کے ٹھنڈے ہاتھ کی طرف دیکھا اور اسے ایک دم وہ مینڈک یاد آگیا جو برسات کے دنوں میں اس کے ہاتھ پر کود گیا تھا۔ اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں اور اس کے منہ سے جچ نکل گئی۔ پھر جانے اسے کیا ہوا کہ وہ بیچنی ہی چلی گئی۔ جب اس نے آنکھ کھولی تو سب لوگ اس کے پاس جمع تھے۔ اماں رو رہی تھی، اور بڑے چچا کوئی سمجھن چٹا رہے تھے مگر جیل بھیا وہاں نظر نہ آئے۔

”آپاں کبکنت ہندوؤں کے مکان ہیں، کوئی بھوت دکھائی دے گیا ہو گا۔“ مہمی نے اس کے آنکھ کھولنے ہی انگٹھا خیال کیا اور اماں بے تاب ہو کر اس کے ہاتھ چومنے لگی۔

”پھر وہی جہالت کی باتیں، کسی خیال سے ڈر مہمی ہوگی۔“ ذہنی بیماری ہے۔ تم یہ سمجھو روز کھانا، دماغ مضبوط ہو جائے گا بیٹی۔“ بڑے چچا مہمی کو پھٹکار کر عالیہ کو نصیحت کرنے لگے تھے، اس نے انہوں نے دیکھا بھی نہیں کہ مہمی اپنی جہالت کا بدلہ لینے کے لئے کس قدر بے چین تھی مگر جانے کیا سوچ کر چپ ہو رہی تھی۔

”آخر ہوا کیا تھا عالیہ؟“ بڑی چچی نے پوچھا تو اس نے گھبرا کر اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے سونا چاہتی ہو۔ اب بھلا وہ سب کو کیا بتاتی؟

ہے۔ اپنے مالک مرحوم تولوگوں کو بھانسی کے تختے سے اتروا لیتے تھے۔ حاکم ان کی دایوں پر بیٹے تھے، پر اب زمانہ گزرا گیا۔" گزرا زمانہ یاد کر کے کریمین ہوا کا منہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ روتی ہوئی اماں کو لپٹائے کرے میں لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"ہم اجڑ گئے، چاہ ہو گئے، انہیں مجھ سے کون سی دشمنی تھی جو یہ سب کر دیا۔" اماں بے قابو ہو کر اپنے کو چھڑا رہی تھیں۔

جب اماں کو زبردستی کرے میں لے جایا گیا تو وہ صحن میں تھاکڑی رہ گئی۔ اماں کی گریہ و زاری نے کسی کو بھی اس کی طرف متوجہ نہ کیا، کسی نے بھی نہ دیکھا کہ اس کے دل پر کیا گزر گئی۔ ایک بار تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے پیروں تلے کواں کھد گیا ہے، وہ دھیرے دھیرے گر رہی ہے۔ جانے کس طرح اس نے آگے بڑھ کر لوہے کی کرسی تھام لی۔ صحن میں کیسا نانا چھایا تھا۔

چند لمحوں بعد میزبجیوں کو ملے کرتے وہ اپنے کرے میں چلی گئی اور پھر اپنے بستر پر گر کر ایک دم سسکتے لگی۔

اچھی طرح رو پھینکنے کے بعد جب اس کا دل ٹھکانے آیا تو وہ بالکل خالی الذہن ہو رہی تھی۔ اس نے یوں ہی اپنے کورس کی کتابیں اٹھا کر پھرے رکھ دیں۔ پانچ بجے ماسٹر کو پڑھانے کے لئے آنا تھا۔ اس نے کتابوں پر تکیہ رکھ دیا جیسے آج تو وہ ان کتابوں کی صورت سے بھی بیزار ہو۔

آج کون سی تاریخ ہے۔ اس نے اپنی یاد کو کربلا۔ آج رات مزا کا ایک دن گزر جائے گا، شام تو ہونے والی ہے۔ اس نے بڑی امید سے ایک دن کو آگے دھکیل دیا۔

میزبجیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ ہو رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ بڑے بچا اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس نے بڑے مبر سے ان کا آڑا ہوا چہرہ دیکھا لیکن جب بڑے بچے نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ کانپ کر رہ گئی۔ آنسوؤں کے پردے کے اس پار سب کچھ دھندلا کر رہ گیا۔

ابا کا مقدمہ ختم ہو گیا۔ اقدام قتل کے سلسلے میں سات سال کی قید کا حکم سنا دیا گیا۔

دو پہر ڈھل چکی تھی۔ ہلکی سی ہوندا باندی کے بعد اب آسمان بالکل صاف ہو گیا تھا۔ جب بڑے بچا عذال سے گھر میں داخل ہوئے تو جیسے وہ بات کرنے کی طاقت کیں باہری چھوڑ آئے تھے۔ اماں ان کی کمرے پر پلٹ گئیں۔ "بڑے بچا مجھے اچھی خبر سنا"۔ اماں منہ اٹھائے انہیں بڑی امید و تم سے تک رہی تھیں۔ بڑے بچا صحن میں بھی ہوئی چوکی پر آہستہ سے بیٹھ گئے تو عالیہ نے نوٹے میں پانی بھر کر ان کے پاس رکھ دیا۔ کیسی دھول اڑ رہی تھی بڑے بچا کے منہ پر۔

بڑے بچا کٹھ پتلیوں کی طرح منہ پر پانی کے چھیننے دینے لگے۔ وہ سب سے نظریں بچا رہے تھے۔ اماں کا مبر جواب دے گیا۔ بری خبر تو بڑے بچا کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔ اماں ان کا منہ تکتے تکتے دھاڑ کر روئیں تو بڑی چچی اور کریمین ہوائے جلدی سے انہیں سنبھال لیا۔

"اماں لی کے کرے کے دروازے بند کر دو، کہیں وہ روئے کی آواز نہ سن لیں"۔ بڑے بچا نے عالیہ کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر اماں سے مخاطب ہو گئے۔ "منظر کی دلہن مبر سے کام لو، یہ سات سال بھی گزر جائیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے، منظر ایک سال بھی جیل میں نہ رہے، کیا پتہ ہم آزاد ہو جائیں۔"

"سب بیکار باتیں ہیں بڑے بچا، انہوں نے بھرا گاجا دیا، اب سات سال کون گزارے گا، ہائے سات سال نہیں گزرتے۔" اماں بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

"ارے حاکموں نے نہیں دیکھا اس گھر کا زمانہ، انہیں پتہ نہیں یہ کس کا بیٹا

”تمہیں اپنی ماں کو سنبھالنا ہے، تم ہمت سے کام لو، مجھے امید ہے کہ جیل کی دیواریں اسے زیادہ دن نہ روک سکیں گی، ٹھیک ہے نا؟“ بڑے چچا نے لمبی سانس بھری۔ کیا یقین تھا چچا کی آنکھوں میں کہ وہ سر جھکانے پر مجبور ہو گئی۔

بڑے چچا چلے گئے تو وہ آنسو پونچھ کر جیسے بڑے سکون سے لیٹ گئی۔

شام ہو رہی تھی، گلی میں موٹے کے ہار پیچنے والے صدا لگاتے زور رہے تھے۔ کمرے میں ہلکا سا اندھیرا چھا رہا تھا لیکن عالیہ منہ چھپانے بسز پر پڑی رہی۔ بڑی چچی، ”بھئی، کریمین بوا سبھی تو باری باری اس کے پاس آئیں“ اسے نیچے لے جانے کی ضدیں کیں مگر وہ کیسے جاتی، بھلا وہ اپنی ماں کو کس طرح دیکھتی۔ اماں جو ایک سال سے اس گھر میں مسافروں کی طرح بیٹھی تھیں، اب پایوسی نے ان کا سفر ختم کر دیا تھا، بندھا ہوا سامان کل گیا۔

گلی میں بجلی کا بلب روشن ہو گیا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر چھت پر آ گئی۔ آج تو اسے اندھیرا بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ پھر اندھیری رات میں تارے کتنے روشن ہو رہے تھے۔ جیسے دکھ کے اندھیرے میں غم دھک رہے ہوں۔ قریب قریب کی چھتوں سے شور کی آواز آ رہی تھی۔ بچے لا جھگڑ رہے تھے۔ گراموں فون ریکارڈ بوج رہے تھے، کوئی آواز بھین گ رہی تھی۔ ”میرا کے پر ہو، گھر و باکر۔“

”عالیہ میں تم سے بات کر سکتا ہوں، تم چیونکی تو نہیں؟“ جمیل بیما جانے کب بلیوں کی چال چل کر اس کے سر پر اکھڑے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت سخت بوکھلائے ہوئے لگ رہے تھے۔ اظہار محبت کے تلخ قصبے کے بعد آج وہ اس سے بات کر رہے تھے ورنہ کئی مہینے گزر گئے۔ انہوں نے اس سے بات نہ کی تھی۔ وہ گھر میں بھی کم ہی آتے، چپ چاپ رہتے۔ بڑی چچی اپنے بیٹے کو یوں دیکھ کر فکر مند رہتیں، ان کا خیال تھا کہ اچھی سی ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے یہ حالت ہے۔ چند نالائق لڑکیوں کی ٹیوشنوں پر ان کا گزارہ ہو رہا تھا۔

عالیہ اپنے حال میں گھن سی بیٹھی رہی۔

”کیا تم کو مجھ سے اتنی نفرت ہے کہ جواب تک نہ دو گی؟“ انہوں نے جیسے بے اعتیاری میں اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور پھر جبک کر کھینچ لیا۔ شاید انہیں

پہلا قصہ یاد آ گیا تھا۔ ”پٹھلے چچا سے ملنے جیل نہ چلو گی؟“

”میں ابا کو جیل میں نہیں دیکھ سکتی، بھلا میں انہیں مجرم کی حیثیت سے دیکھوں گی؟“ وہ دھیرے سے بولی۔

”واہ وہ مجرم کب ہیں، انگریزی حکمران کو مارنا جرم کہاں ہوتا ہے؟“

”ہوں!“ اس نے جیسے چونک کر جمیل بیما کی طرف دیکھا۔ وہ تو اسے اس اندھیرے میں بھی بڑے سرکش اور سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ وہ کچھ نہ بولی۔ بیٹی بیٹی ہوا کے ہلکے ہلکے جھوٹے آ رہے تھے اور اب پھر بادلوں کے چند ٹکڑے ادھر ادھر تھرتے پھر رہے تھے۔

”نیچے چلو بھئی، سب کے ساتھ بیٹھ کر بیٹھ جائے گا۔“ جمیل بیما نے اس طرح سے کہا جیسے پہلے کی بات سراسر جھوٹ ہو۔

”آپ جائے، میں تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی۔“

جمیل بیما کچھ دیر تک خاموش کھڑے رہے اور پھر چلے گئے۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئی اور میز پر لگ کے پاس کھینچ کر ابا کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ وہ بہت سوچ سوچ کر لکھ رہی تھی۔ جدائی کے یہ سات سال ملاپ کی چمک سے بیشہ کے لئے ماند پڑ جائیں گے۔ میں ہر وقت آپ کا انتظار کروں گی۔

خط ختم کرنے کے بعد اس نے وہیں میز پر سر ٹک دیا۔ اس وقت سات سال کتنے طویل معلوم ہو رہے تھے۔ ”اللہ، رام بی بی بن پاس کے چودہ سال کس طرح گزارے ہوں گے۔“

”کریمین بوا گھر میں کو کہ مظہر بھائی کے جیل کی خبر سے بہت افسوس ہوا، اگر بدلے میں کوئی مجھے جیل دے دے تو ابھی تیار ہوں۔ اپنی بیکار زندگی۔“

بغل کی دلیز سے اسرار میاں کی بھرائی ہوئی آواز گھر کے سانٹے کو چرتی ہوئی اسے صاف سنائی دے گئی۔ اس نے میز سے سر اٹھا کر خط لگانے میں بند کر دیا۔

اسرار میاں کے پیغام کا کوئی جواب نہ تھا، صرف کریمین بوا کے چٹا پٹختے کی آواز آ رہی تھی۔ اللہ کرے اسرار میاں بڑھاپے سے پہلے ہی وادی کی طرح اوتھا جائے۔

نہ لگیں، انہیں یہ شک تو رہے گا کہ جواب تو دیا گیا ہے مگر انہوں نے سنا نہیں۔

”وہ میں منہ چھپا کر سوتا تھا، جانے وہ کب۔۔۔“
 داوی کی سانس تیز ہونے لگی تو انہوں نے گھٹنے پیٹ میں اڑا لئے۔
 ”عالیہ، بھی کھانا کھانے آ جاؤ۔“ محن سے بڑی چچی کی آواز آئی تو عالیہ
 اٹھ کھڑی ہوئی۔ کرین بوا داوی کا کھانا لے اندر آ رہی تھیں۔

بڑے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر اس نے بچے دیکھا۔ محن میں بچے
 ہوئے پتکوں پر سب لوگ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ صرف بڑے بچا لیٹے ہوئے اپنے
 سینے پر ہاتھ پھیرا رہے تھے۔ بڑی چچی کا سروتہ ہولے ہولے چھالید کھڑ رہا تھا وہ
 کرین بوا بڑی پھرتی سے روٹیاں پکا رہی تھیں۔ جیل بھیا لوہے کی کرسی پر بیٹھے
 اٹھائیاں مروڑ رہے تھے۔ بھی کاپتہ نہ تھا۔ اس واقعہ کے بعد سے تو اس کی آواز
 بھی نہ سنائی دی تھی۔ سارا لڑنا بھڑنا بھول گئی تھی۔

وہ دیے قدموں بچے اتر آئی۔ لائین کی چلی روشنی میں اماں اسے بڑی بے
 بس نظر آ رہی تھیں۔ وہ جلدی سے بڑے بچا کے پاس بیٹھ گئی۔ آج تو اس نے
 بڑے بچا کا سر بھی نہ سہلایا تھا۔

”ماسٹر صاحب روز آتے ہیں نا؟“ آخر بڑے بچا نے بات کرنے کے لئے
 موضوع ڈھونڈ لی اور خاموشی کا ڈیرا اٹھ گیا۔

”آتے ہیں۔“ وہ کھسک کر بڑے بچا کا سر سلانے لگی۔

”اب اگر تم محنت سے نہ پڑھو گی تو ہم کیا کریں گے، میرا کون سا لڑکا بیٹھا
 ہے جو ان برسوں کو بتا دے گا۔“ اماں پر پھر سے رونے کے آثار طاری ہو رہے
 تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر داوی کے کمرے میں چلی گئی۔ جب سے رات کو خیم
 پڑتی شروع ہوئی تھی، داوی کا بستر کمرے میں چلا گیا تھا۔ مٹی جون کے سوا ان کا
 سارا زمانہ کمرے میں گزرتا۔

وہ وادی کی بیٹی سے تنگ گئی۔ بھی اپنی مسری پر منہ چھپائے پڑی تھی۔
 اس نے عالیہ کو دیکھا اور پھر منہ چھپا لیا۔

”منظر بیٹے کا کوئی خط آیا؟“ وادی نے بے چین سانس کو قابو میں کرتے
 ہوئے پوچھا۔ ادھر کچھ دنوں سے تو ان پر ہر وقت دے کا حملہ رہتا۔

”خط آیا تھا وادی، کام بہت ہے چھٹی نہیں ملتی۔“ اس کی آواز گھٹ رہی
 تھی۔ بھی نے ایک لمبے کو سر اٹھایا تو دو آنسو لڑکھ کر نیچے میں جذب ہو گئے۔

ایسا معلوم پڑتا ہے کہ اب زندگی ختم ہو رہی ہے، تمہارا چھوٹا بچا جانے
 کب واپس آئے گا، وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا، اٹھارہ سال کا ہو گیا تھا مگر میری

ان دنوں بڑے زور کی سردی ہو رہی تھی، پھر بھی وہ رات کو بارہ بارہ بیچ تک بڑھتی رہتی اور جب کھلیل آوارہ گردی کر کے ہوئے ہوئے صدر دروازہ کھٹکھٹاتا تو وہ دبے قدموں جا کر زنجیر کھول دیتی۔ کھلیل ہائی اسکول میں داخل ہو چکا تھا۔ فیس کے روپے اس نے اماں سے چمپا کر اسے دیئے تھے مگر اتنی بت سی کتابیں خریدنے کے لئے وہ کہاں سے روپے لاتی۔ کھلیل کے پاس بھی یہی بات تھی کہ دوستوں کے ساتھ مل کر پڑھتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں کیسی ڈھٹائی آگئی تھی۔ عالیہ دروازہ کھولتے ہوئے کبھی کبھی تنبیہ کرتی تو بڑی بے اعتنائی سے ہنس پڑتا۔

آج بھی رات کو جب وہ پڑھ رہی تھی تو دروازہ کھٹکا۔ وہ کتابیں رکھ کر جلدی سے میڑھیاں اترنے لگی اور جب دروازہ کھول رہی تھی تو جمیل بھیا کا نون پر منظر لیٹے اپنے کمرے سے باہر نکل آئے۔ عالیہ کو دیکھ کر ایک لمحے کو فٹکے اور پھر کھلیل کا بازو پکڑ کر اس کے منہ پر دو تین تھپڑ مار دیئے۔ ”لے یہ سبق بھی یاد کر لے۔“

کھلیل نے جمیل بھیا کو ایسی نظروں سے دیکھا جن میں مقابلے کی طاقت تھی مگر وہ جلدی سے بڑی چچی کے کمرے میں چلا گیا۔
”خواہ خواہ مارتے ہیں“ اسے کتابیں خرید دیجئے، پھر کیوں جائے گا دوستوں میں پڑھنے۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”کتابیں؟ مجھے بھی کسی نے کتابیں نہیں دی تھیں مگر میں ایسا نہ تھا۔ یہ اتنا برا اونٹ کا اونٹ کچھ نہیں سوچتا۔ گھٹنے دو گھٹنے پڑھ کر بھی آسکتا ہے اور پھر تم ایجتی نہیں ہو کہ اسے سلک کی قیض کس نے بنوا کر دی ہے۔ میرا تو کوئی ایسا“

”تو نہ تھا۔“
بھیا غصے سے ہاتھ مل رہے تھے اور وہ بے وقوفوں کی طرح انہیں دیکھ رہی تھی۔ ”پھر کیا ہو اجو کسی دوست نے قیض بنا دی۔“

بھیا سر جھکائے کھڑے تھے۔ اسے ان کی حالت پر رحم آنے لگا۔ بچا رہے وہ بچے کی قلت کی وجہ سے کوئی ٹریننگ بھی نہ لے سکے، ڈھنگ کی ملازمت نہیں

اماں نے وقت سے سمجھو کر لیا تھا۔ بہت اونچے پر بیٹھے بیٹھے وہ ذرا نیچے سرک آئی تھیں، پر اتنی بھی نہیں کہ چچی کے قریب بیٹھ سکی ہوں۔ ان کے چہرے پر اب بھی تئیں روپے مینے کا غور اور اس دولت کا سکون تھا جو ان کے بھائی کے پاس جمع تھی اور حفاظت کا وہ سایہ بھی ان کے ساتھ لگا ہوا تھا جسے اکلوتے بھائی کے اونچے عمدے اور انگریز بھائی نے جنم دیا تھا۔

مقدمے کے فیصلے کے بعد اماں نے ماموں کو کئی خط لکھے تھے جن میں اس گھر اور یہاں کی فضا کی برائیاں کی تھیں۔ ان کے پاس رہنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا مگر ماموں نے بڑی بے بسی سے جواب دیا تھا کہ اس طرح وہ بھی حکومت کی نظروں میں آجائیں گے اور ان کا عمدہ خطرے میں پڑ جائے گا۔

عالیہ نے اماں سے اس خط کا ذکر نہ کیا تھا جو انہوں نے اسے لکھا تھا اور بڑی صفائی سے اعتراض کیا تھا کہ ان کی بیوی آزاد فضا کی پروردہ ہے۔ اس کے ملک میں یہ رواج نہیں کہ خواہ خواہ خاندانی جھیلوں کو پال کر زندگی تلخ کی جائے اس لیے ضروری ہے کہ کسی بھانے وہ اپنی ماں کو وہیں رہنے پر مجبور کرے۔

اس نے یہ خط پڑھ کر پھاڑ دیا تھا۔ وہ اماں کا دل نڈھتوڑنا چاہتی تھی۔ آس ٹوٹنے کے بعد انسان کے پاس کیا بچ رہتا ہے۔ سارے چاہے دھوکا ہی کیوں نہ دے جائیں مگر کچھ دن تو کام آئی جاتے ہیں۔ اسے ماموں سے سخت نفرت ہو گئی تھی۔ یہ ہنس کی چال چلنے والا کو اپنی چال بھی بھول گیا۔ ماموں کا خط پا کر اس نے بڑی خفا سے سوچا تھا۔ جب وہ خود کسی قابل ہو جائے گی تو اماں کے اس سارے کو نوج کر دور پیٹھک دے گی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اور بھی محنت سے پڑھے گی۔

لتی۔ ٹوٹھنوں کے روپے بھی بڑی چچی کے ہاتھ میں نکا دیتے ہیں۔ اس پر یہ کلکلی
الونگ کرتا ہے، ”کنا نہیں سنا۔“

وہ اوپر جانے کے لئے مڑی تو جیل بھیا بھی ساتھ ہو لئے۔ ”میں بھی
تمہارے ساتھ چلوں ذرا دیر باتیں کریں گے؟“

”بھلا یہ کون سا وقت ہے باتوں کا“ سو رہے۔ ”اس نے جلدی سے کہا،
اور زینے پر قدم رکھ دیا۔“

”واہ یہ آپ اس وقت کیا کر رہی ہیں بھیا؟“ مہمی جانے کس کام سے اٹھ
تھی۔

”میں کلکلی کے لیے دروازہ کھولنے آئی تھی؟“

”خوب! آپ دونوں دروازہ کھولنے آئے تھے، ہے، کتنی سخت زنجیر تھی،
وہ بڑے طرے نہی۔“ ”سب کے سامنے بھیا سے بات کرتے آپ کو
شرم آتی ہے کیا؟“ اس نے بھیا سے پوچھا۔

”مہمی اتنی فضول باتیں تو نہ کرو۔“ جیل بھیا گولمزدائے۔

”ان کے دھوکے میں نہ آئیے گا بھیا، یہ پہلے مجھ سے عشق کرتے تھے اور
اب آپ سے۔“ مہمی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

عالیہ تیزی سے زینے پر قدم رکھتی اوپر اٹھی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی
— اللہ کیا مصیبت ہے، کیا اس لئے مہمی جیل بھیا کا سایہ بنی ہوئی تھی اور اب

جیل بھیا اسے چھوڑ کر ادھر لپک رہے ہیں۔ سردی اور نفرت سے وہ کانپنے لگی۔
خاف میں تھس کر اس نے پھرے کتاب اٹھالی مگر ایک لفظ نہ پڑھا گیا۔ ان چند

مہینوں میں جیل بھیا کی خاموشی اور تنہائی نے ان کی جتنی عزت بنائی تھی وہ
ساری کی ساری تباہ ہو کر رہ گئی۔

گلی میں کتنے اس زور سے بھونک بھونک کر رو رہے تھے کہ اسے رات سے
دہشت آنے لگی۔

صبح روز کی طرح مہمی اسے پیار سے جھانے نہ آئی۔ عالیہ بڑی دیر تک پڑی،
اس کا انتظار کرتی رہی۔ گلی میں اخبار فروش بیٹھے پھر رہے تھے۔ ”یورپ میں

لوہے سے لوہا بیچے گا، جنگ سر پر کھڑی ہے۔“ ”اُمیا، اُمیا آج کا اخبار۔“
جنگ کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔“ چودہ سال کی لڑکی کو اغواء کر لیا گیا۔“

وہ بہتر سے جھبلا کر اٹھ گئی۔ جنگ یورپ میں ہوگی تو اسے کیا، کون
سے اماں کی بھائی کے عزیز تک کر مر جائیں گے، اور لڑکیوں کا تو مصرف ہی مصرف

یہ ہے کہ کہ وہ محبت کریں، بھاگیں یا اغوا کر لی جائیں، سب بھڑا میں جائیں۔
بڑھیاں ملے کرتے ہوئے وہ بڑے دکھ سے سوچ رہی تھی۔ مگر مہمی اس پر

کیوں شبہ کرتی ہے۔ ارے بے وقوف پاگل۔

مہمی تخت پر بیٹھی ہوئی تھی اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے پرائے کو دانٹوں
سے کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سوچی ہوئی تھیں۔ عالیہ کو دیکھ

کر اس نے منہ پھیر لیا اور پیالی کی ساری چائے ایک ہی سانس میں پی گئی۔

اسے مہمی کی یہ بوقونی پر ہنسی آ رہی تھی۔ وہ مہمی کے پاس ٹھس کر بیٹھ گئی
تو اس نے بڑے کرب سے ہلو بولا اور ایک طرف سرک گئی۔ پھر اٹھ کر اپنے

نرے میں چلی گئی۔

”رات کلکلی کس وقت آیا تھا عالیہ؟“ بڑی چچی نے پوچھا۔

”کوئی بارہ کے قریب، جیل بھیا بھی جاگ گئے تھے، انہوں نے اس کے دو
ہاتھ بھی جڑ دیئے تھے۔“

”اس لڑکے کے پھنسن ایجنے نہیں دکھائی دے رہے۔“ اماں نفرت سے
بولیں۔

”میں کیا کروں مظہر کی دلہن، میں پاگل ہو جاؤں گی۔“ بڑی چچی نے ٹھنڈی
سانس بھری۔

”بڑے بھیا سنہالیں نا اپنی اولاد کو۔“ اماں نے بھڑکایا مگر بڑی چچی بھلا کا ہے
اُسی کے بھڑکانے میں آتیں، ان کا غوڑ جب جی چاہتا تو بڑے بچا سے لڑا کرتیں۔

”زمانے زمانے کی بات ہے، ایک زمانہ تھا کہ بڑے سرکار کے سب بیٹے
بات بیچے کے بعد گھر سے قدم نہ نکالتے۔“ ”مزدرا زمانہ کرکین بوا کا سایہ بنا ہوا تھا۔

چائے پی کر وہ مہمی کے کمرے میں چلی گئی۔ دادی اس وقت سو رہی

تھیں۔ رات کو تو سانس انہیں ایک منٹ کو آنکھ نہ جھپکانے دیتی۔ وہ دے دے قد سوں جا کر مچھی کے پاس بیٹھ گئی۔ مچھی سر سے پاؤں تک لٹاف اوڑھے پڑی تھی۔ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا لٹاف فیکری گدڑی معلوم ہو رہا تھا۔

”چلو اوپر دھوپ میں بیٹھیں مچھی۔“ عالیہ نے اس کے منہ پر سے لٹاف سرکا دیا۔

”ہم آپ سے نہیں بولتے۔“

”اوپر تو چلو بنگل پھر باتیں ہوں گی۔“

مچھی اٹھ کر اس کے ساتھ ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا کرب تھا۔

”صبح سے تم مجھ سے بولیں کیوں نہیں؟“ مچھی کو اپنے لٹاف میں بٹھا کر اس نے پوچھا۔

”وہ مجھے کیا پڑی ہے جو آپ سے بول چال بند کروں! کوئی میں اس گدھے سے محبت کرتی ہوں جو آپ سے جلوں گی۔“ مچھی نے برا سا منہ بنایا۔

”تم نے آپ ہی آپ یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ جمیل بیٹا مجھ سے محبت کرتے ہیں“ میں نے تو پہلے ہی تم سے کہا تھا کہ مجھے ایسی باتوں سے سخت نفرت ہے اور پھر جمیل بیٹا نے بھی کبھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔“ وہ صاف جھوٹ بول گئی۔

جمیل بیٹا خود ہی مجھ سے محبت کرتے تھے، مجھے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے، مگر اب وہ بدل گئے تو بدل جائیں میں کب اس الو سے محبت کرتی ہوں۔“

”تم محبت کرو یا نہ کرو، مگر مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی تھیں۔“ اس نے بڑی ملامت سے مچھی کو دیکھا تو وہ ایک دم اس سے لپٹ گئی۔

”بھلا میں اپنی بچیا پر شہر توڑی کر رہی ہوں، مجھے تو بس رنج تھا ایک بات کا۔“

مچھی کی معصومیت پر اس کا جی چاہا کہ بس اسے کیچے میں دھر لے۔ پھر مچھی وہ اس سے روٹھی رہی۔

”ارے سننے تو میں آپ کو سب کچھ بتاتی ہوں۔“ مچھی نے عالیہ کا منہ

بہی طرف کر لیا۔ ”جس سال بیٹا ایف اے کا امتحان دے رہے تھے تو انہوں نے مجھ سے روپے مانگے۔ میں نے انکار کر دیا تو انہوں نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں نے سارے جمع روپے انہیں دے دیے اور انہوں نے مجھے زور سے لپٹا لیا مجھے بڑا اچھا لگا ان کا لپٹانا۔“ وہ مارے شرم کے سرخ پڑ گئی۔

”پھر کیا ہوا؟“

”پھر بچیا جمیل بیٹا مجھے کلتے لگے۔ اپنے کھانے کے پانچ روپے بڑی چچی کو دے دیتی، باقی سارے جمیل بیٹا کو۔ میں نے ان تین برسوں میں ایک کپڑا بھی نہیں بنوایا، دیکھا ہے نا آپ نے، میرے سارے کپڑے پھینے ہوئے ہیں؟“ وہ ایک لمبے کو کچھ سوچنے لگی۔ ”جب آپ نہیں آتی تھیں تو جمیل بیٹا اسی کمرے میں رہتے تھے۔ میں رات کو ان کے پاس آ جاتی تھی پر بچیا اللہ قسم انہوں نے کبھی بد تیزی نہیں کی۔ ایک بار میں ان کے پاس لیٹ گئی تھی تو وہ خود ہی اٹھ کر بیٹھ گئے، انہوں نے صرف پتہ لکھا تھا۔“ مچھی کا منہ چندر ہو رہا تھا۔

”پھر کیا ہوا مچھی؟“

”پھر بچیا، بڑی چچی نے بیٹا کی شادی طے کر دی۔ بڑی چچی کا خیال تھا کہ اگر جمیل بیٹا منظر چچا کے داماد بن گئے تو وہ آپ ہی ایم اے کرا دیں گے اور زینک بھی دلا دیں گے، ویسے میں چپکے سے آپ کو بتا دوں کہ بڑی چچی آپ کی اماں سے بہت ڈرتی ہیں، بس اسی لئے بغیر رشتے کے کیسے کہیں کہ آگے پڑھا دو، میرا سہاں تو کٹھا ہے۔ بڑی چچی نے بڑے ڈرتے ڈرتے تمہیں آپا کار شدہ مانگا تھا اور جس دن تمہیں چچی نے منظور کا خط بھیجا تھا اس دن بڑی چچی خوشی سے روتی رہی تھیں اور میں صدمے سے رو رہی تھی۔ بھلا میں کیسے کہتی کہ میں نے بی اے کرا دیا ہے تو ایم اے بھی کرا دوں گی۔ کسی کو کیا پتہ کہ میں نے کتنے دکھ بھیلے۔“ وہ سر ہٹا کر کچھ سوچنے لگی۔

”پھر مچھی؟“

”یہ دنیا ج ج بڑی بری ہے بچیا، جمیل بیٹا بھی تو بی اے کرنے کے بعد بدلے نظر آنے لگے۔ میں اگر ان کے پاس زیادہ تنہی تو بہانوں سے اٹھا

دیتے۔ سب کچھ بھول گئے تے اور اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہا انہیں! سب کے سامنے میرا مذاق اڑاتے ہیں، الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں۔ خیر کرتے رہیں، میں بھی تو کوئی کتیا نہیں ہوں جو ان کے پیچھے پھروں۔“ بھیگی نے کھٹی کھٹی آہ بھر کر اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ اس کا جی دکھ کر رہ گیا۔ اسے تمیز نہ آیا یاد آگئیں، کہیں یہ بھیگی بھی کوئی بے وقوفی نہ کر بیٹھے، پھر کیا ہوگا۔

”کیا پتہ بھیگی، جمیل تم سے محبت کرتے ہی ہوں“ اور نہ بھی کرتے ہوں تو کیا محبت کے بغیر انسان خوش نہیں رہ سکتا؟“

”تو تو کیا میں ان پر پٹھانوں ہوتی پھروں گی، بھیگی جو ہم سے محبت کرے گا، ہم اس سے کریں گے، یہ تو بدلہ ہے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔“ وہ ہنستی ہوئی اٹھ گئی۔ ”رات دادی کی طبیعت بڑی خراب رہی تھی بچیا، میں سو نہیں سکی۔“

بھیگی کے جانے کے بعد وہ دیر تک یوں ہی لحاف میں بیٹھی جھومتی رہی اور پھر کتاہیں اٹھا کر دھوپ میں جا بیٹھی۔ ہائے کیا مل گیا جمیل بھیا کو اس بچاری سے کھیل کر۔ مگر یہ عورتیں محبت کی اتنی بھوک کیوں ہیں اللہ؟

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اب وہ پڑھتے پڑھتے تھک چکی تھی۔ اس نے کتابیں میز پر رکھ دیں۔ وہ سونا چاہتی تھی کہ مگر سونہ سکی۔ اور جب نیند نہ آئے تو لقمی بہت سی باتیں ذہن میں کھلانا لگتی ہیں۔ ابا کا خط کیوں نہیں آیا۔ آپا تمیز نے عشق کے پیچھے جان منوا دی اور اب وہ بالکل تنہا ہے، کسی کی رفاقت نصیب نہیں۔ اماں اپنے دکھوں میں جھلا ہیں، انہوں نے کبھی اپنی اس اولاد کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھا، اس کے لئے کچھ نہیں سوچا اور جمیل بھیا خواہ نواز اس کی راہ کا روڑا بن رہے ہیں، کیا انہیں زندگی میں اور کوئی کام نہیں۔ لاجل و لا مگر وہ ان کے لئے سوچ ہی کیوں رہی ہے؟ کھڑکی سے روشنی اندر آرہی ہے، اس نے نیند نہیں آتی، اس نے دنوں پٹ بھیر دیئے۔

چلی منزل میں اچانک سب کے باتیں کرنے کی آواز آئے گی۔ وہ دم سادھ کر باتیں سننے کی کوشش کرنے لگی۔ بارہ بجے ہیں، شاید ٹکلیل آیا ہوگا اور اب اس کی تاک میں ہوں گے۔

زیوں پر قدموں کی چاپ ہوئی تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ جمیل بھیا اس کی طرف آ رہے تھے۔

”عالیہ، دادی کی طبیعت سخت خراب ہے، ذرا دیر کو نیچے چلو۔“ وہ تنہیہ ہو رہے تھے۔ ”تم گھبراؤ گی تو نہیں، ایک دن سب پر یہ آتا ہے۔“ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ سب سمجھ گئی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس نے پاؤں کانپ رہے ہیں مگر وہ بڑی ہمت سے جمیل بھیا کے ساتھ ہوئی۔ جمیل بھیا اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے مگر اسے تو پتہ ہی نہ چل رہا تھا کہ یہ ہاتھ اس کا ہے یا

دادی کی مسمری کھینچ کر ان کا منہ قلعے کی طرف کروایا گیا تھا۔ اماں، بڑی چچی اور بڑے چچا مسمری کے ارد گرد خاموشی سے کھڑے ہوئے تھے۔ دادی کی وہ جھگڑاؤ سانس جانے لگتی پر سکون ہو گئی تھی۔ دور دور زندگی کی آہٹ بھی نہ محسوس ہوتی۔ دادی کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ ابھی ان میں انتظار کا نور باقی تھا۔ شاید وہ اس وقت بھی اپنے سب سے لاڈلے چھوٹے بیٹے کا انتظار کر رہی تھیں۔ اور، ”بھئی“ دادی کے قدموں سے لپٹی گھٹی سکیاں بھر رہی تھیں۔ ظالم چھوٹے چچا—— عالیہ کی نظروں میں ان دیکھے چھوٹے چچا کا بھیا نکہ نقشہ پھر گیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ پیچ کر کے—— دادی اب تو ایسی ہے کہ اولاد کا انتظار نہ کر دے۔

کریم بوا بڑی بے تابی سے مسمری کے چاروں طرف گھوم گھوم کر دعائیں کر رہی تھیں—— ”مولا مالکن کو صحت دے دے اور بدلے میں مجھے اٹھالے۔ مولا، مولا۔“

بابر نے بھی تو اسی طرح ہمایوں کی جان کی امان چاہی تھی—— ہے کریموں بوا یہ کون سی محبت ہے جو تمہارے دل میں غمناک مار رہی ہے—— عالیہ نے بڑھ کر کریم بوا کو بٹھانا چاہا، ”اُمیں لپٹانا چاہا مگر وہ اپنے کو چھڑا کر پھر دعائیں کرنے لگیں،—— ”مولا، مولا۔“

ایک بیگنی کے ساتھ دادی کو داغی سکون مل گیا۔ کریم بوا ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں، ان کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔ بڑے چچا نے نبض پر سے ہاتھ ہٹا کر دادی کے ہاتھ سینے پر باندھ دیئے اور لحاف سے منہ چھپا دیا۔ کریم بوا سر جھکائے کمرے سے نکل گئیں۔

”بھئی“ اب اٹھ جا، بیٹی۔“ بڑی چچی نے بھئی کو اٹھایا تو دادی کا ڈھکا ہوا منہ دیکھ کر وہ بے قابو ہو گئی۔ بڑے چچا کا منہ ضبط کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا اور ان کی آنکھوں سے ماں کی محبت بھری کمانوں کی یادیں جھانک رہی تھیں اور داغی جدائی کا صدمہ لرز رہا تھا۔

بڑے چچا سر جھکائے بیٹھک میں چلے گئے شاید اسرار میاں کو اطلاع دیئے۔

اماں اور بڑی چچی بھئی کو چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر وہ ہاتھوں سے نکل جاتی۔ پھر جب جمیل بیٹا نے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا تو بھئی کا سر پیسے خود بخود ان کے سینے پر آٹکا اور وہ اس طرح چپ ہو گئی جیسے کبھی روٹی نہ تھی۔

وہ کمرے سے باہر آگئی۔ کریم بوا صحن میں اینٹوں کا چولہا بنا کر بڑے سے تیلے میں پانی گرم کر رہی تھیں اور وہ جو اب تک دادی کی موت پر ایک آنسو بھی نہ بہا سکتی تھی اندھیرے میں آگ کے لرزتے شعلوں کو دیکھ کر سسک اٹھی۔ کریم بوا نے اس کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

رات دادی کی مسمری کے پاس بیٹھ کر کٹ گئی۔ اماں اور بڑی چچی آج دادی کے سارے ظلم و ستم بھول کر انہیں اس طرح بلک بلک کر یاد کر رہی تھیں جیسے ان کے بپھر دنیا سوئی ہو گئی ہو، ”ب تک دادی زندہ رہیں، ان کے ظلم و ستم نے سب کے کلیجے چھلنی رکھے۔ بڑھاپے کے آتے ہی سب نے انتقام لے لیا۔ بیکار چیز کی طرح اٹھا کر ایک طرف ڈال دیا اور پھر زندگی کی مصروفیتوں کے اتنے دورے پڑے کہ دادی کو کلر کلر منہ تھکنے کے سوا کچھ نہ کر سکیں۔

عالیہ کا جی چاہا کہ وہ اپنے کانوں میں روٹی ٹھونس لے۔ اماں اور بڑی چچی کی محبت کی داستانیں اس سے نہ سنی جا رہی تھیں۔ آخر اس وقت سب کو ان کے ظلم و ستم کیوں نہیں یاد آتے؟ اسے تو صرف بھئی اچھی لگ رہی تھی جو کوئی بات نہ کر رہی تھی بلکہ تھوڑی دیر رو لینے کے بعد درے کے ایک کونے پر لیٹی بڑے سکون سے سو رہی تھی، جیسے اب بھی اس کا سر جمیل بیٹا کے سینے سے لگا ہو—— اور کریم بوا جو سامنے ٹھنڈی ہوا میں بیٹھی گلی لکڑیاں پھونک رہی تھیں اور گود میں رکھے ہوئے قرآن پاک کو گل بل کر پڑھ جا رہی تھیں۔ کتنے صبر اور خاموشی سے انہوں نے دادی کی موت کو برداشت کر لیا تھا۔ چھ سال سے تنہا دادی کی خدمت کرنے والی کریم بوا نے ایک آنسو بھی نہ بہایا تھا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی درے کے ایک کونے پر سکر کر سو رہے۔ اسے اداری سے تو نہ شدید محبت تھی اور نہ کوئی شکایت، بس وہ اس کی دادی تھیں۔

— پھر بھی وہ لیٹ نہ سکی کیونکہ اماں نے بھی کے سو جانے پر بڑی نفرت سے کتہ چینی کی تھی۔

آخر صبح ہو گئی۔ کریمین بوائے صحن میں درہی بچا دی تھی اور محلے کی عورتیں آکر جمع ہو رہی تھیں۔ وہ سب اپنے اپنے دکھوں کو یاد کر کے آنسو بہا رہی تھیں اور بھی انہیں دیکھ دیکھ کر اپنی جان ہلکان کر رہی تھی۔

جب دادی کو تنہا دھلا کر آخری سڑک کے لئے تیار کر دیا گیا تو تمام عورتیں برآمدے میں ٹاٹ کے پردے کے پیچھے چھپ گئیں۔ صرف کریمین بوا ہاتھ جوڑے لاش کے پاس کھڑی جانے کیا کہہ رہی تھیں۔

جب میت اٹھانے کے لئے مرد اندر آئے تو اسرار میاں سب سے آگے تھے۔

”خبردار! زندگی میں کبھی مالکن نے منہ نہ لگایا، اب ان کی لاش خراب کرنے آئے ہو۔“ کریمین بوا اسرار میاں کے سامنے آگئیں اور وہ چوروں کی طرح جمیل بھیا کے پیچھے چھپنے لگے۔ تمام لوگوں کی نظریں سوائیلہ نشان بن کر اسرار میاں کا تعاقب کر رہی تھیں۔

”ارے ٹھیکر کماں ہے، اپنی دادی کو قبر تک تو پہنچا آتا۔“ بڑی بچی ٹاٹ کے سوراخ سے ٹھیکر کو تلاش کر رہی تھیں مگر وہ کماں تھا۔

”اندرا جاؤ کریمین بوا۔“ بڑے بچانے کریمین بوا کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”اللہ کو سونپنا مالکن، اللہ کو سونپنا۔“ کریمین بوا صحن سے ہٹ کر برآمدے میں آگئیں۔

دادی کی لاش جب صدر دروازے سے پار ہو رہی تھی تو ایک بار سب جمع کر دو پردے مگر کریمین بوا سر جھکائے صحن میں کھرا ہوا سامان بٹور رہی تھیں۔

ذرا دیر بعد سب مسمان چلے گئے تو جیسے گھبراہٹ دم ویران ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔

رات نو بجے بڑے بچا کسی کام سے کانپور چلے گئے۔ عدم تعاون کی تحریک زوروں پر تھی اور وہ بہت دن سے مصروف تھے۔ بڑے بچا کا اسی دن چلے جانا

اسے سخت برا لگا۔ کیا وہ دونوں گھر میں بیٹھ کر اپنی ماں کا سوگ بھی نہیں مناسکتے تھے۔ کیا ان کی سیاست بازی انہیں اتنا بھی وقت نہیں دے سکتی۔

مگر جب اماں نے ان کے جانے پر اعتراض کیا تو وہ چپ چاپ سستی رہی۔ جانے کیوں وہ بڑے بچا کے خلاف ایک لفظ بھی نہ بول سکی تھی۔

جمیل بھیا نے مجھے چھو بھی، ابا اور بھی کے ابا کو تار کر دیئے تھے اور اب سب لوگ ان کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

دوسرے دن سے سب کام اس طرح ہونے لگے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو، صرف اس وقت دادی کی موت کا احساس شدید ہو جاتا جب کریمین بوا کام سے

فارغ ہو کر قرآن شریف پڑھتے بیٹھ جاتیں اور تو گھر میں کسی نے ایک آیت بھی نہ پڑھی۔ عالیہ کو کریمین بوا کی محبت پر دھک آئے لگا تھا۔ اس نے کتنی بار چاہا تھا کہ

ایک آدھ پارہ پڑھ کر دادی کی روح کو بخش دے، مگر اسے فرصت ہی نہ ملتی۔ امتحان کی تیاری سر پر سوار تھی، وہ اب پھر دھیان سے پڑھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنا

ایک سال دادی کو بخشنے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ کریمین بوا کی محبت کے مقابلے میں خود کو کمتر سمجھ کر صبر کر لیتی۔

بھی چند دن تک اپنے کمرے میں جانے سے گھبراتی رہی۔ پرانے رفیق کا ساتھ چھوٹنے کے بعد وہ کمرہ شاید اس کے لئے جھگ بن گیا تھا۔ وہ ادھر ادھر ماری

ماری پھرتی یا پھر صحن میں چوکی پر بیٹھ کر پھینے ہوئے کپڑوں کی مرمت کرتی رہتی یا پھولوں پانی بھر کر کیا دیر میں ڈالنے لگتی اور جب اس سے بھی آگیا جاتی تو برقع

اؤٹھ کر محلے کے گھروں گھروں پھرا کرتی۔

پھر ایک دن اس نے جھاڑو اٹھا کر اپنا کمرہ صاف کرنا شروع کر دیا۔ سارے جانے چھڑا دیئے۔ محمد علی جوہر کی تصویر سے گرد جھاڑی گئی۔ اس نے سفید کڑھی

ہوئی پرانی چادر دوں پر بیٹھ لگا کر انہیں دونوں مسروں پر بچھا دی اور صاف ستھرے بستر پر لیٹ کر پیشہ کی طرح گانے لگی۔

مال سوز غم ہائے نمانی دیکھتے جاؤ

بھی کو کر امو فون ریکارڈوں کے سارے گانے اور فقیروں کی گائی ہوئی

ساری غزلیں یاد تھیں۔ اسے ہر موقع کی غزل اور گیت گانے میں ملکہ حاصل تھا۔ آج جب مجھی بڑے اسٹاکس سے لٹیجی جا رہی تھی تو عالیہ کا بھی ہا ہا کر کے چاکر اسے لپٹا لے کر مجھی تو اب تک اس سے سیدھے منہ نہ بولتی تھی۔ سب کچھ بتانے کے باوجود اس کے دل میں کوئی چٹائیں رہ گئی تھی جسے نکالنا عالیہ کے بس میں نہ تھا۔

نجنہ چو بھی اور مجھی کے ابا کا خط آیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ جب اماں رخصت ہو گئیں تو پھر آنے سے کیا فائدہ۔ کاش انہیں کوئی پہلے سے اطلاع کر دیتا۔

مجھی اپنے ابا کا خط پڑھ کر آپے سے باہر ہو گئی۔ ”ہاں اب آنے کا کیا فائدہ۔ ایک دن کے لئے بیوی کے پھلو سے الگ ہو کر انہیں کب قرار آتا۔ میرا بس چلے تو اپنے والد صاحب قبلہ کا گلہ اپنے ہاتھوں گھونٹ دوں۔“

”مجھی کس تو زبان کو لگام بھی دیا کرو۔“ عالیہ کی اماں نے گھر کا تو مجھی ایک دم گھٹ گھٹ کر روئے گئی۔ جانے کیوں وہ اتنے دن گزرنے کے بعد بھی اماں کو جواب دینے سے چوک جاتی تھی۔

ابا کو بھی دادی کی موت کی اطلاع مل گئی تھی۔ ان کا خط آیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ تصور کی دنیا کو کوئی جیل بند نہیں کر سکتا۔ اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ میں نے اپنی ماں کو کاندھا دیا تھا، میں نے انہیں قبر میں اتارا تھا۔ خیر تم رنج نہ کرنا میری بیٹی۔ تم کو دل شکستہ نہ ہونا چاہیے۔ موت بھی زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ محنت سے بڑھو اور اپنے پاس ہونے کی خوش خبری سناؤ۔

خط پڑھ کر عالیہ بڑی دیر تک سر جھٹکائے بیٹھی رہی۔ دوپہر ہو گئی مگر اس کا پڑھنے میں جی نہ لگا۔ ایک تو ابا کے خط نے اسے رنجیدہ کر دیا تھا۔ اس پر سے دوپہر کے سنانے میں کریمین بوا کے ہولے ہولے قرآن پاک پڑھنے کی آواز جیسے فریاد کرتی معلوم ہو رہی تھی۔

اپنے کمرے سے نکل کر وہ نیچے اتر گئی اور تخت پر کریمین بوا کے پاس جا بیٹھی۔ اماں اور بڑی چچی شاید سو رہی تھیں کیونکہ ان کے باتیں کرنے کی آواز نہ آ رہی تھی۔

کریمین بوا جب تک پڑھتی رہیں وہ ان کے پاس سر جھٹکائے بیٹھی رہی اور

جب وہ قرآن شریف بند کر کے دعا کرنے لگیں تو عالیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کریمین بوا محبت کی کیسی مثال پیش کر رہی ہیں۔ کام سے تھک کر وہ بھی تو دن میں سو سکتی ہیں۔

”تم سوئی نہیں عالیہ بیٹی؟“ دعا ختم کر کے کریمین بوا نے پوچھا۔

”نہیں نہیں آئی کریمین بوا اور۔“ وہ چپ ہو گئی۔

”کیا بھوک لگی ہے بیا کو؟ ایک دونی الٹ دوں آگ جلا کر؟“

”نہیں کریمین بوا، تمہارے پڑھنے کی آواز سے جی بھر رہا تھا۔“

”نچلے میاں کو اور نجنہ بیا کو ضرور آنا چاہیے تھا۔ مجھی بھی اپنے باپ کو دیکھ لیتی اور پھر کچھ نہیں تو اس مسمری کا دیدار کر لیتے جس پر ان کی ماں نے دم توڑا تھا۔ زمانے زمانے کی بات ہے کبھی ماں کے بغیر چین نہ پڑتا تھا۔“ کریمین بوا کے لہجے میں شکایت تھی۔

”تم کو وادی سے کتنی محبت تھی کریمین بوا، شاید وادی بھی تم کو اتنا ہی چاہتی ہوں گی۔“

”کیا ماکن مجھے چاہتی تھیں؟“ کریمین بوا نے التماس کر دیا۔

”تم نے اپنی وادی کا زمانہ نہیں دیکھا بیا؟“ نہیں وہ کسی کو چاہتی بھی تھیں یا نہیں۔ ہاں صرف چھوٹے میاں کو چاہتی تھیں جو پتہ نہیں کہاں کھو گئے، انہیں خلافت کے طبع لے گئے، ہم تو نوکر لوگ تھے عالیہ بیا، ہماری کیا حیثیت۔“ کریمین بوا نے اپنی قیض پیٹھ پر سے سر کا دی اور اس کی طرف گھوم کر بیٹھ گئیں۔ ان کی پیٹھ پر سیاہ نشان تھے اور ایک جگہ سے سفید سفید چربی سی نکلی ہوئی تھی۔

”یہ کیا ہوا تھا کریمین بوا؟“ اس نے جلدی سے قیض نیچے کھینچ دی۔

”میری اماں ماکن کے جہیز میں آئی تھیں، میرے ابا مر گئے تھے، میں چھوٹی تھی، پھر جب ذرا بڑی ہوئی تو ماکن نے اپنے گھر کے ایک نوکر سے میری شادی کر دی۔ نئی بٹی شادی ہوئی تھی۔ اسے لئے ماکن کی خدمت میں ذرا سی کوٹائی لگئی، بس یہ اسی کی سزا تھی۔“ کریمین بوا سر جھٹکا کچھ سوچنے لگیں۔

اللہ، یہ کریمین بوا بھی کیسی معہ ہیں۔ اتنے تم سننے کے بعد بھی جب تک

دادی زندہ رہیں ان پر ٹھانور ہوتی رہیں اور اب بھی انہیں نہیں بھولتیں۔ وہ حیران ہو کر ان کا منہ تک رہی تھی۔

”میں نے ساری زندگی ان کا نمک کھایا تھا اور اب بھی ان کی اولاد کا نمک کھا رہی ہوں۔ نمک کا بڑا حق ہوتا ہے بیٹا عالیہ، میری اماں، اللہ انہیں جنت نصیب کرے، کتنی تھیں کہ جس نے نمک کا حق نہ ادا کیا وہ خدا کے ہاں بھی معاف نہ کیا جائے گا۔ ماکن کوئی غلطی ہوگئی تو معاف کر دیتا مجھے، دوسری دنیا میں تو سکھ کی سانس لے سکوں۔“

کریمین بوا اٹھ کر بھونٹے برتن سیٹھے گئیں اور عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ کریمین بوا نے نمک کا سارا ڈبہ اس کے منہ میں انڈیل دیا ہے جو اسے زہر سے زیادہ کڑوا لگ رہا تھا۔

سورج ڈوب رہا تھا اور اس وقت گلی میں سووے والوں نے جیسے دھاوا بول دیا تھا۔ سب ایک دوسرے سے بڑھ کر آواز لگا رہے تھے اور چھتوں سے کھلی کھڑکیوں سے بچوں اور مردوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ روزہ افطار کرنے کے لئے سب اپنی پسند کے سووے والے کو آواز دے رہے تھے۔

کھڑکی کھول کر وہ ایک منٹ کے لئے گلی میں بھاگی۔ سامنے ہائی اسکول کا سیاہ پھانک بند پڑا تھا اور درختوں کے جھنڈ سے کوئل کے کوکے کی آواز آرہی تھی۔ جانے کیل اسکول جاتا بھی ہے کہ نہیں۔ اس نے سوچا۔ کون ہے جو یہ سب کچھ معلوم کرے۔ اگر بڑے بچا گھر پر ذرا سی بھی توجہ دے دیں تو سب کچھ ٹھیک نہ ہو جائے، مگر۔ اسے ایک دم ابایا یاد آگئے۔ اس بار وہ انہیں عید کا روضہ ضرور بیچے گی۔ کھڑکی بند کر کے وہ چھت پر آگئی تو اسے ہلکی سی سردی محسوس ہونے لگی پھر بھی وہ غلطی نہ کی۔ چھتوں سے بچے چنگیں اڑا رہے تھے اور شور ہو رہا تھا۔ عالیہ کو یاد آیا کہ ایک بار بچپن میں اس نے بھی بھتی کے لڑکے کے ساتھ چنگ اڑانے کی کوشش کی تھی اور ابا نے اسے سختی سے ڈانٹا تھا مگر آج تک اسے چنگ بڑی اچھی لگتی۔

”عالیہ۔“ بڑی چچی ہانپتی ہوئی اوپر آکر اس کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ ان کا منہ سرخ ہو رہا تھا جیسے بڑی مشقت کی ہو۔ ایسی ہی مجبوری ہوتی جو وہ بیڑھیاں چڑھتیں، انہیں تو اوپر چڑھنے کے خیال ہی سے اشتیاق ہونے لگتا۔ ”یہ لو اپنے کپڑے۔“ انہوں نے سانس درست کرتے ہوئے جس کر ایک ہینڈل اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”دوپہ رنگ کر چن لو اور پاجامہ بھی مشین پر مکھنلاؤ، بہرہ تو تمہارے پاس ہیں ہی۔“

اس نے بڑے ہاؤس سے بڈل کھول کر دیکھا۔ ڈھاکہ کی طبل کا دوپٹہ اور نیلی ساٹن چمک رہی تھی۔

”مگر بڑی چچی اس کی کیا۔۔۔“

”بس بس، تم آج رات ضرور سی ڈالو اور ہنسی خوشی عید مناؤ۔۔۔“ وہ جانے کے لئے مڑیں۔۔۔ ”روزہ کھولنے کا وقت ہو رہا ہے، تم نیچے نہیں آئیں۔“

اللہ یہ کپڑے کہاں سے آگئے، کون لے آیا۔۔۔ عید کے لئے کسی کے بھی تو کپڑے نہ بنے تھے۔ بڑی چچی نے تو کئی بار بڑے چچا سے کپڑوں کے لئے کہا تھا مگر وہ ہر بار شرمندہ سے ہو کر بیٹھک میں چلے گئے تھے۔ پھر اس کے کپڑے کس نے خریدے ہیں؟ کیا جیل بھیا نے اپنی ٹوشن کے روپے اس پر خرچ کر دیئے ہیں؟ یا پھر بڑے چچا نے ابا کی جگہ کو پر کیا ہے؟ مارے خوشی کے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ ضرور بڑے چچا نے خریدے ہوں گے۔

مگر ذرا ہی دیر میں اسے معلوم ہو گیا کہ کپڑے کس نے خریدے ہیں۔ نیچے سے ٹکلیل کی آواز بڑی صاف سنائی دے رہی تھی۔۔۔ ”جیل بھیا نے بچیا کے کپڑے بنوا دیئے، میرے لئے کچھ نہیں آیا، کیا دوست عید بھی منادیں؟“

”کو اس نہ کر نامراد۔۔۔ بڑی چچی اسے ڈانٹ رہی تھیں۔۔۔“ کیا وہ تیری بہن نہیں، تو خود اس کے کپڑے بنا، ارے تیرے بھنے لڑکے تو ایک کنبے کا بیٹہ بھرتے ہیں۔“

”ہاں جب تم باہر رہتے ہو تو وہیں کپڑے بھی پہنو، جیل تو بہت شریف لڑکا ہے۔“ اماں بھی ٹکلیل کا کلیجہ جلا رہی تھیں۔

”مجھے اس گھر سے ملائی کیا ہے کبھی؟ کپڑے بھی دوست ہی دے دیں گے۔“ ٹکلیل نے بڑے بچے پہن سے جواب دیا۔

”تم بھی اگر بچیا کی طرح بن جاؤ تو اللہ قسم جیل بھیا تمہارے دس جوڑے بنا دیں ویسے تم کو کون پڑھتے۔“ مگھی بھی تیرا سرا رہی تھی، جو سیدھے عالیہ کے کلیجے میں اتر رہے تھے۔

اس نے کپڑے چنگ پر ڈال دیئے۔ ایک لمحے کو اسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ کپڑے جیل بھیا کی انتہائی محبت کا تحفہ ہیں مگر دوسرے ہی لمحے یہ کپڑے ٹھنڈے اور کفن کی طرح محسوس ہونے لگے۔ ان کپڑوں میں لپٹا ہوا نیلے ہونٹوں والا ایک چہرہ جھانک رہا تھا۔ اس نے کانپ کر کپڑوں کو سیٹھ لیا اور اپنے کمرے میں جا کر انہیں یکس میں ٹھونس کر تالا لگا دیا۔۔۔ لاجول ولا، کیا وہ بھی کبھی بے وقوف ہو سکتی ہے۔ یہ سب اسی حیل کی چٹے بٹے ہیں، مرنو کی فطرت تو پارے کی طرح ہے۔ ذرا سی گرمی ملی اور چڑھ گیا۔ کل مگھی تھی آج وہ منظور نظر ہے۔ پھر کسی اور کی باری ہوگی۔

جب وہ نیچے مگھی تو سب لوگ افطاری کے نشے میں مست سے بیٹھے تھے۔ کریم بنوا روٹیاں پکانے میں لگی ہوئی تھیں۔ برآمدے میں بیچے ہوئے پتلون پر بیٹھی ہوئی بڑی چچی اور اماں پاں بنا بنا کر کھا رہی تھیں اور جیل بھیا اس سردی میں اپنی لوہے کی کرسی پر بیٹھے، اسٹول پر رکھی ہوئی لائین کی روشنی میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ جب زور کی سردی ہوتی تو شام کو یہ کرسی بڑی سوئی سوئی لگتی، دوپہر میں مگھی اس کرسی پر بیٹھ کر دھوپ سیتکی، جاڑا گرمی، برسات، یہ کرسی ہمیشہ کیاری کے پاس اسی طرح پڑی رہتی، اسے کوئی بھی نہ اٹھاتا۔

عالیہ کو ایک لمحے کو خیال آیا کہ کیس جیل بھیا کو سردی نہ لگ جائے۔ اب تو اچھی خاصی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

”اب تمہاری پڑھائی کا کیا حال ہے؟ امتحان کے تو بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔“ جیل بھیا نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا اور اس کے ساتھ برآمدے میں چلے آئے۔

”بس ٹھیک ہی ہے۔“ وہ اماں کے پاس بیٹھ گئی۔ اسے تو ڈر ہی لگتا کہ کیس ذیل بھیا امتحان نہ لینے لگیں۔ بڑے چچا لاکھ انہیں اپنی لائبریری کی چابی نہ دیتے، چر بھی وہ جیل بھیا کی ذہانت کی قائل تھیں۔

”میاں تم بھی ذرا عالیہ کی پڑھائی دیکھ لیا کرو۔“ اماں نے کہا۔

”ہاں میں ضرور دیکھوں گا، ویسے تو آج کل میں بھی ایم اے کی تیاری کر

رہا ہوں۔" جمیل بھیا نے خوش ہو کر بتایا اور پھر ہنسیوں سے عالیہ کی طرف دیکھا۔
 ممی جانے کس وقت اپنے کمرے کی دہلیز پر آکر بیٹھ گئی تھی۔
 "ہیماں آ جاؤ ممی، سردی ہے، ادھر برآمدے میں بیٹھو۔" بڑی چچی نے
 کہا۔

"میں ٹھیک بیٹھی ہوں۔" ممی نے سختی سے جواب دیا۔
 "پہلے بھی جب جگ ہوئی تھی تو ہیماں منگائی ہو گئی تھی، مگر وہ تو اور ہی
 زمانہ تھا ہمارے گھروں میں تو پتہ بھی نہ چلا۔ بس چلا پہنچا تو اس وقت جب میرا
 بھائی۔۔۔ بڑی چچی چپ ہو گئیں اور پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولنے لگیں۔
 "ان دنوں یہ جمیل پیدا ہوا تھا۔ جب اس کے ماموں کے مرنے کی خبر آئی تھی"
 بڑی چچی نے سب کی طرف دیکھا مگر سب نظریں جھکائے خاموش رہے
 ۔۔۔ "مگر اب کی تو منگائی کا پتہ چل رہا ہے۔ اب تو وہ حالت بھی۔۔۔ بڑی
 چچی چپ ہو گئیں کیونکہ اماں کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ جب بھی بڑی چچی
 منگائی کی بات کرتیں تو اماں کے ماتھے کی شکنیں گہری ہو جاتیں۔
 "سب لوگ کھانا کھا لو، نہیں تو ٹھنڈا ہو جائے گا۔" کریمین ہوائے تخت پر
 دسترخوان بچھا دیا۔

ممی جیسے جھٹ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور پلیٹ میں اپنا کھانا نکال کر تیزی
 سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عالیہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ ہائے یہ ممی یوں
 ہی ناراض ہو گئی، کوئی بات ہوتی تو پھر ٹھیک تھا، اس کا کیسا جی چاہتا کہ ممی ایک
 بار پھر پہلے جیسی ہو جائے، اب اتنے پیار سے کوئی بھی تو بچا کھنے والا نہ تھا۔
 اس نے بڑی ملامت بھری نظروں سے جمیل بھیا کی طرف دیکھا مگر وہ تو جیسے اسی کو
 تک رہے تھے۔ اس نے گہرا کر نظریں نیچی کر لیں۔ ایک جوڑا کپڑے کا لاکر
 شاید وہ اسے اپنی ملکیت سمجھنے لگے ہیں۔ اس کا جی چاہا کہ کوئی بہت سخت سی
 بات بھیا کے منہ پر پہنچا دے۔

"آخر یہ جنگ ہوتی کیوں ہے؟" بڑی چچی نے جمیل کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
 ہرجیز میں جو دھیلے پیسے کافرن پڑا تھا اس سے کھانے کا معیار اور بھی گر گیا تھا۔

"وہی تو آپ اب کی بڑی حامی ہیں مگر کبھی کبھی لڑکیوں پڑتی ہیں؟" جمیل بھیا
 نے الٹا سوال کر دیا۔

"اور تم تو اپنے ابا کے دشمن ہو!" بڑی چچی نے الٹی جھوٹ دی۔
 "پہلے بات صاف ہو گئی، جب بھی فائدے پر چوٹ پڑتی ہے یا ہوس میں
 آگ لگتی ہے تو جنگ ہوتی ہے۔" جمیل بھیا نے جواب دیا، وہ تو بالکل اس
 طرح بات کر رہے تھے جیسے بڑی چچی دو سال کی بچہ ہوں۔
 "چل ہٹ، بڑا آیا، یوں ہی کبواس کرتا ہے، کبھی ڈھٹک سے بات نہ کی،
 ایسی مذاق کی عادت پڑی ہے۔" بڑی چچی ہنسنے لگیں۔
 "فائدے دانہ کے کیا بات ہے جمیل میاں، بس زمانے زمانے کی بات
 ہے سب بدل گیا۔" کریمین ہوا بھلائیوں چپ رہیں۔

"یہ سب ہمارے ابا اور عالیہ کے ابا جیسے لوگوں کے کام ہیں۔ یہی گڑبڑ
 کرتے ہیں جو جنگ ہوتی ہے، ابا جو انگریزوں کے خلاف ہو رہے ہیں تو جنگ نہ
 ہوگی؟" اماں نے بھی اپنی رائے ظاہر ہی کر دی اور جمیل بھیا بڑے زور سے ہنسنے
 لگے۔ "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں منجھلی چچی۔"

"سب کھا چکے ہوں تو مجھے بھی کھانا بھجوا دو کریمین ہوا۔" منسان بیٹھک
 سے اسرار میاں کی مری ہوئی آواز آئی۔

بڑے چچا کی کہیں دعوت تھی، اس لئے وہ اپنے مہمانوں کے ساتھ جا چکے
 تھے اور اب اسرار میاں تین کی دو پھٹکیوں سے روزہ کھول کر کھانے کے انتظار
 میں مکمل رہے تھے۔

"ذرا صبر سے بھی کام لیا کرو اسرار میاں صاحب، کیا گھر والوں سے پہلے
 تمہاری کشتی جاکر پہنچ دیا کروں۔" کریمین ہوا نے جھلا کر جواب دیا۔

اس "اسرار میاں" میں کتنا فطرت چھا تھا۔ کیسا مذاق قہقہے لگا رہا تھا مگر جب
 اسے چچا انیس اسرار میاں کتنے تو کتنا خلوص اور کتنی برابری کا درجہ ہوتا۔ جانے
 ۔۔۔ سب لوگ اسرار میاں کے لئے کچھ سوچتے کیوں نہیں۔

"ہے اسرار میاں اگر میرا بس چنے تو سب سے پہلے تمہاری کشتی جاکر لے

آؤں۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا اور کھانا ختم کر کے جلدی سے اوپر چلی گئی۔
جیل بیا ایک ساں الٹی چلی نظروں سے دیکھتے جاتے، اس کا جی دب رہا تھا۔ سکون
سے کھانا بھی نہ کھانے دیا۔

اپنے بستر پر آکر اس نے بڑے سکون سے کتابیں سمیٹ لیں اور نیکری سرکا
کر اس طرح لیٹ گئی کہ کھلی کے بلب کی روشنی سیدھی کتاب پر پڑ رہی تھی۔
بیڑیوں پر چاپ ہوئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ جیل بیا چلے آ رہے تھے
”میں نے سوچا کہ آج تمہارا امتحان ڈالوں۔“ وہ اس کے قریب بیٹھ
گئے۔

”مجھے سب آتا ہے، آپ اپنا وقت نہ خراب کریں۔ ٹل ہو گئی تو فکر نہیں،
اگلے سال پھر سی۔“ عالیہ نے بڑی روکھاٹی سے کہا۔ جیل بیا کی آنکھیں وہ سبق
فر فر سنا رہی تھیں جو وہ پڑھانے آئے تھے۔

”تم کو پڑھا کر میرا وقت خراب ہو گا عالیہ؟ کچھ تو سوچو، ایسی باتیں کر کے تم
مجھے کتاب پریشان کر دیتی ہو، اگر تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتیں تو دکھ تو نہ دو۔“

”جیل بیا۔“ آج تو وہ بھی انہیں جھاڑنے پر تل گئی۔ ”جب
آپ ایسی باتیں کرتے ہیں تو آپ کو شرم نہیں آتی؟ کیا آپ ممی کو بھول گئے، وہ
آپ کے ساتھ آپ کے گھر رہتی ہے۔ مجھے سب معلوم ہے۔“

”ممی!“ جیل بیا نے گردن جھکا لی۔ ”تم کو معلوم ہے تو اچھا ہی ہے
مگر میں ٹھیک ٹھیک بتا دوں کہ مجھے ممی سے کبھی بھی دینی محبت نہ تھی، میں اسے
چاہتا ہوں مگر بہن کی طرح۔ تم کو معلوم ہے کہ ابا نے سیاست کے پیچھے اس گھر کو لٹا
دیا مگر میں اپنے کو لٹانے کے لئے تیار نہ تھا۔ میں نے جانے کس کس طرح پڑھا۔
کچھ اسرار میاں میرے لئے بچت کر لیتے اور کچھ دادی کے چوری چھپے کے روپے
کام آتے۔ مگر ایف اے کرنے تک گھر کی حالت بگڑ چکی تھی۔ یہ سارے اخراجات
ممی نے برداشت کئے۔ میں کبھی نہیں بھولوں گا، مگر وہ مجھے غلط سمجھنے لگی اور میں
ڈر کر وجہ سے اسے سمجھا بھی نہ سکا اور۔“

”اور پھر اچانک بی اے کرنے کے بعد آپ اس کا مذاق اڑا ڈالا اسے۔“

سمجھانے لگے، ”ایں نا؟“ جیل بیا پر ترس آنے کے باوجود وہ چوکی نہیں۔
”میں اب کیا کر سکتا ہوں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”اس سے شادی کر لیجئے جیل بیا، وہ آپ سے محبت کرتی ہے!“

”شادی؟“ وہ جیسے اچھل پڑے۔ ”مجھے معلوم نہ تھا کہ تم مجھ سے اتنی
نفرت کرتی ہو، عالیہ، میں نے تمہارے سوا کسی سے محبت نہیں کی، اور دیکھو
عالیہ۔“ انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور پھر اس کی گود میں سر رکھ
دیا۔

”میں آج ہی اپنے ماموں کے گھر جا سکتی ہوں، سمجھے آپ جیل صاحب
قبلہ؟“ دھونس جمانے کے لئے اور کس کا نام لیجی۔ سخت بے بسی کا عالم تھا۔
”تم کہاں جا سکتی ہو عالیہ بیگم، آج اماں، کریمین بوا اور منجلی چچی سے کہہ
دی تھیں کہ تم بیٹھ اسی گھر میں رہو گی۔“

”کون کہہ رہا تھا، کون ہوئے ہیں وہ سب کہنے والے؟“ عالیہ نے
دیوانوں کی طرح جیل بیا کو دکھا دے کر پنگ سے اٹھا دیا۔ ”مجھے کون مجبور کر سکتا
ہے، میں تمہیں آپا نہیں ہوں، بڑے آئے سب لوگ۔“
جیل بیا نے حیرت سے اس کے لال بھوکا چہرے کو دیکھا اور پھر کھپانے
سے ہو کر چپکے سے مزگئے۔

جب وہ بیڑیاں اتر رہے تھے تو عالیہ بڑبڑا رہی تھی۔ ”بیچارہ تک بند
نہ بڑے بچا اپنی لائبریری کی کبھی تک نہیں دیتے۔“

کی اشرفیاں اور گنیاں، کوئی انہیں پھاڑتا تو دیکھتے۔“

کریمین بوا بیڑائی رہیں اور عالیہ والان کے محراب کے سچ بیٹھی چپ چاپ
بٹنی رہی۔ وہ بار بار بھی کے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی جواب خود کو ایذا
پہنچانے کے لئے اسنے لقمہ و دق کمرے میں تھاپ دی جائے کیا کر رہی تھی۔

عالیہ کو تو اس کمرے سے ہول آتا۔ دادی کے انتقال کو کتنے بہت سے دن
گزر گئے محراب سے تو آج تک دادی کی منتظر نظریں کمرے میں ڈوبی ابھرتی نظر
آئیں۔ ان کی تیز تیز سانس اب بھی سانس سانس کرتی محسوس ہوتی۔ اب بھلا
بہمی کو کس طرح بنایا جائے وہ سخت ہزار ہو رہی تھی۔ ارے غلظت کیا یہ
بہمی آپ کی بیٹی نہیں؟ کیا بیوی کے ساتھ اولاد بھی میراثی ہے؟

وہ اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی اور اپنے کورس کی کتابیں اٹھنے بیٹنے لگی۔
اکہ سرمارا دھڑکنے میں جی نہ لگا۔ بس اسے بار بار بھی کا خیال ستا رہا تھا۔ بہمی
ایک دن خود کو ایذا پہنچا پھینکا کہ ختم کر لے گی۔

کھڑکی سے باہر اسکول کی عمارت کے پیچھے سورج ڈوب رہا تھا۔ نیچے کی منزل
میں اب بڑی گھما گھمی تھی۔ روزہ اظہار نے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ عالیہ نے
اتابیں سیٹ کر تپائی پر رکھ دیں اور کھڑکی میں اکڑوں بیٹھ کر باہر دیکھنے لگی۔
کنڈیریوں والے کے سر پر رکھے ہوئے جیل کے تھال میں پھولوں کے سبجے سجے
دئے تھے۔ وہ کاگا گرنڈریاں سچ رہا تھا۔ عالیہ کو اس کی اس قدر بھونڈی آواز
بھی جانے کیوں بڑی اچھی لگ رہی تھی اور اس نے ایک دم محسوس کیا کہ وہ
اداس ہو رہی ہے۔ شامیں اسے بیٹھ اداس کر دیتیں، جانے کیسی نامعلوم سی کیفیت
ٹھاری ہو جاتی۔

وہ کھڑکی سے کود کر نیچے آگئی۔ روزہ کھلنے کا وقت اب بالکل قریب آ گیا
تھا۔ وہ کریمین بوا کا ہاتھ بنانے کے خیال سے نیچے چلی گئی۔ کریمین بوا پر اسے کتنا
رہنم آتا، سارا دن چولے کی کھوکھ میں بیٹھے بیٹھے ان کی کمر ٹیڑھی ہو جاتی۔ اس نے
بٹنی بار سوجھا تھا کہ یہ کریمین بوا یہاں سے بھاگ کیوں نہیں جاتیں۔ یہاں صرف
پرانے کپڑے اور روٹی اور حق نمک پر زندگی تھانے دیتی ہیں۔ اتنی مشقت تو

کل عید تھی۔ آج بہمی کے ابا کا منی آؤر آیا تھا۔ بہمی بڑے چاؤ سے
بھاگ کر دھڑکا کرنے آئی مگر جب پانچ روپے دیکھے تو اس کا منہ سرخ ہو گیا۔ کوہن
پر کھسا تھا کہ ان روپوں سے عید کے کپڑے بنوائے۔ بہمی نے پانچ کا نوٹ وصول
کیا اور سچ محن میں کھڑے ہو کر نوٹ کے پرزے پرزے کر کے پھینک دیا۔ سب
ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے۔

”اتنے روپوں سے تو ہمارے ابا کی تیسری بیوی صاحبہ کا کفن تک نہ آئے
گا۔ جانے لوگ بچے پیدا ہی کیوں کرتے ہیں، اس سے تو کتے کے پلے پال لیں۔“
بہمی پنگ پر بیٹھ گئی۔

”ارے بہمی تم پاگل ہو گئی ہو، پانچ روپے میں کتنا اچھا جوڑا بنتا۔“ بڑی
چچی نے لپک کر نوٹ کے پرزے اٹھا لیے اور اس طرح ہیلی پر رکھنے لگیں جیسے
جوڑ رہی ہوں۔

”آپ سے کس نے کہا ہے بولنے کو۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”اگر
میرے جوڑے کی فکر ہوتی تو پہلے سے منی آرڈر نہ کرتے؟ اب کیا راتوں رات
پریاں آکر میرے کپڑے سی دیں گی؟“ بہمی پاؤں پٹختی اپنے کمرے میں چلا
گئی۔

بڑی چچی نے پھونک مار کر نوٹ کے پرزے اڑا دیے اور چوکی پر بیٹھ کر
پاندان کھول لیا۔

کریمین بوا چلتی مانجھے مانجھے ہاتھ دھو کر اٹھیں اور نوٹ کے پرزے جن کر
آجکل میں باندھ لئے، پھر چپٹوں کی کالک صاف کرنے بیٹھ گئیں۔ ”اللہ مارے
یہ کاغذ کس کام کے، وہ ہوتے تھے اپنے زمانے میں کھری چاندی کے روپے، سوئے

’نہیں کسی بھی گھر میں دس پندرہ روپے مینے کی نوکری مل جائے گی۔ محنت کا بدلہ روپیہ ہی تو ہوتا ہے مگر شاید کرکین ہوانے تو کبھی خواب میں بھی ایسی باتیں نہ سوچتی ہوں گی۔ کرکین ہوا کس قدر غر سے کہیں کہ میری ماں باکس کے جیز کے ساتھ آئی تھیں۔ باکس کی خدمت کرتے کرتے خدا کو پیاری ہو گئیں اور اب خدا مجھے بھی بڑے میاں کے ہاتھوں سوار کرے۔‘

عالیہ کسی حیران ہوتی ان باتوں پر، اس نے کبھی کرکین ہوا کو اس گھر سے بیزار ہونے نہ دیکھا۔ وہ کام سے کبھی نہ پھٹکتیں۔ مجبورے ہوئے وقت کے ساتھ ان کا احترام کرنے کا طریقہ بھی نہ بگڑا۔ کیا خیال تھی جو کبھی اونچی آواز سے بات کی ہو۔

تخت پر دسترخوان بچھا کر افطاری کا سامان چنا چکا تھا۔ بڑی چچی تلے ہوئے جنوں پر لیوٹو نچوڑی تھیں۔ کرکین ہوا کو شاید روزہ لگ رہا تھا، اس لئے مڈحالا ہی بیٹھی تھیں۔ بڑے بچا برآمدے میں بیچے ہوئے کمرے پر بیٹھے تھے۔ جیسے سے نکلی ہوئی گھڑی سینے پر لٹک رہی تھی اور ان کے پاس بیٹھا ہوا ٹکلیل بار بار جھک کر گھڑی دیکھ رہا تھا۔ کچھ دن سے جمیل بھیا نے اس پر سختی شروع کر دی تھی اس لئے وہ گھر سے زیادہ دیر غائب نہ رہ پاتا۔

’معمی اپنے کمرے کی دہلیز پر گھڑی تھی۔ پاجامے کی پہنی ہوئی میلی موٹ سے اس کے گئے نظر آ رہے تھے۔ جب اس نے عالیہ کو دیکھا تو آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پاس آگئی اور بغیر کچھ بولے ٹکلیل کے پاس بیٹھ گئی۔‘

باہر بیٹھک میں بڑے بچا کے کئی مہمان براجمان تھے اور اسرار میاں بیٹھک کے دروازے سے کئی بار سر نکال کر جھانک چکے تھے۔

’کرکین ہوا ذرا جلدی سے باہر افطاری بھیج دو‘ روزہ کھانے میں صرف دم منٹ رہ گئے ہیں۔“ بڑے بچا نے سینے پر لٹکتی ہوئی گھڑی کو دیکھ کر کہا اور کرکین ہوا کر بیڑھے کئے انھیں اور تخت پر رکھی ہوئی دوپٹیں اٹھا کر بیٹھک کی طرف لپکیں۔ اسرار میاں تو پیسے ناک ہی میں تھے، جب مہمان ہوتے تو ان کے مزے جاتے ورنہ وہ غریب تو روزہ بھی اس وقت ہی کھولے جب کمرہ ہو چکا ہوتا۔

اماں تخت پر ایک کونے میں اس طرح بیٹھی جمالیہ کاٹ زئی تھیں جیسے افطاری پر پیر دے رہی ہوں۔ گھنٹیا کام تو انہوں نے کبھی کئے ہی نہ تھے۔ بس یہی کہ کھانے پینے کی چیزوں کے حصے بخرے کر دینے یا اسرار میاں کا لالیا ہوا سودا سلف دیکھ کر اعتراضات کر لئے، ٹٹک وشبہ کے ساتھ حساب جوڑ لیا۔

قریب کی مسجد میں گولا جھوٹا اور پھر تھارہ بیٹنے کی تیز آواز آنے لگی تو اماں نے ہالینوں میں رکھا ہوا سب کا حصہ ہانپنا شروع کر دیا۔ عالیہ نے تانبے کا منقش بک اٹھا کر سب کے گھاسوں میں لیوٹوں کا شربت بھر دیا۔

’معمی کی پیٹ یوں ہی پڑی تھی۔ اس نے صرف شربت کے گھونٹ سے روزہ کھول لیا تھا۔‘

’معمی کچھ تو کھاو، خالی پیٹ میں شربت لگے گا۔“ بڑی چچی نے پیٹ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں پکڑنا چاہی تو اس نے بڑی چچی کا ہاتھ جھٹک دیا۔

’جب بھوک لگے گی تو خود ہی کھا لے گی۔“ اماں نے کہا، مگر معمی خاموش رہی۔

’اپنے نوٹ کا دکھ ہو گانا، مٹھیلے چچا نے بھیجا تھا۔ انہوں نے پھاڑ کر پیسہ دیا۔ ہمیں کو دے دیتیں۔“ ٹکلیل روزہ کھول کر ترک میں آچکا تھا۔

’تم جیسے فقیروں کو نہیں دیتی۔“ معمی نے ترے جواب دیا۔

’بھئی یہ تو سخت بد زبان لڑکی ہے۔“ بڑے چچا نے گھور کر معمی کو دیکھا۔

— ’کسی دن زبان کھینچ لوں گا۔‘

’آپ کو تو میں اپنی زبان چھونے بھی نہ دوں۔ ہر وقت کا فردوس کی جماعت میں رہتے ہیں اور دنیا کو دکھانے کے لئے روزے رکھتے ہیں، بس حد ہے۔“ معمی نے نفرت سے ہونٹ سکڑ لئے۔

’شرم نہیں آتی، کوئی اپنے بڑے چچا سے یوں بات کرتا ہے، کوئی لحاظ پاس نہیں۔“ بڑی چچی نے فوراً ڈانٹا۔ مارے غصے کے منہ سرخ ہو رہا تھا۔ یعنی ان کے سامنے معمی ان کے شوہر سے اس طرح بات کرے۔

’میرے کوئی پچاڑ چا نہیں۔“ معمی نے سخت بے اشتنائی سے کہا۔

”بھی تم چپ رہو کیوں اس جاہل کے منہ لگتی ہو۔“ بڑے چچا کاؤ نکلتے سے تک کر نیم دراز ہو گئے۔

”ہاں ہمارے کوئی منہ نہ لگے، ہم جاہل ہیں، ساروں کی ڈگریاں کھا جائیں گے اور ڈکار بھی نہ لیں گے۔“ بھی پاؤں بچتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”چودھویں صدی ہے، گائے سینک بدلے گی اور قیامت آ جائے گی۔“ کریم بوا کی کو کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں، اس لئے انہیں قیامت یاد آ رہی تھی۔

”بھئی حد ہے بد زبانی کی، گھر میں سامنے پالا ہے تم نے بھالی۔“ اماں نے فوراً بڑی چچی پر حملہ کر دیا۔

”اب دیکھو نا دلن، یہ تو اس کے باپ کا قصور ہے، اب کیا پنے گی یہ بچی۔“ جب کوئی بھی کے پیچھے پڑنے لگتا تو بڑی چچی فوراً ”اڑے آ جاتیں۔“

ذرا دیر کو سب خاموش ہو گئے۔ بڑے چچا نے آنکھیں موند لیں۔ کلید اپنے اسکول کے کام میں جٹ گیا۔ کریم بوا لائینوں کی چٹیاں صاف کرنے لگیں۔ مگر بھی کیسے چپ رہتی، کپڑے نہ بننے کا انتقام ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے اندھیرے کمرے میں اپنی تکی بند کی کو لٹک لٹک کر گانے لگتی۔

کاشی میں تسمی ہوئی سب بکریاں چر گئیں

گاندھی سیرو ماتم کرو کاشی کی سیا مر گئیں

بڑے چچا ایک دم چونک پڑے۔ ”دیکھو اسے منع کر لو، باہر مولانا صاحب وغیرہ بیٹھے ہیں، سب کیا کہیں گے، ساری آواز باہر جائے گی۔“ بڑے چچا غصے سے سرخ ہو رہے تھے۔

”بھئی خدا کے لئے کچھ تو سوچا کر، باہر مسمان بیٹھے ہیں۔“ بڑی چچی بھی کے کمرے کی طرف نکلیں۔

”آپ کو کیا، ہم اپنے کمرے میں گا رہے ہیں، یہ کمرہ ہمارا ہے، جب آپ کے کمرے میں آکر گائیں تو منع کیجئے گا، باہر سننے ہوں تو سنیں، ذرا انہیں بھی تو معلوم ہو کہ یہاں سب کافر نہیں رہتے۔“ وہ بڑے چچا کو چرانے کے لئے پھر

کہنے لگی۔ کاشی میں تسمی۔

”اری جاہل پاگل، میں کچھ بولتا نہیں اور تو آپے سے باہر ہے، اب گا بھی طرح۔“ بڑے چچا تیزی سے کمرے کی طرف لپکے۔ بیٹھک کا دروازہ بند کر دو

کلید۔“ انہوں نے مڑ کر کہا اور پھر پورے جوش سے بڑے چچا نے بھی کے منہ پر

کئی تھپڑ جڑ دیئے۔ کلید دروازہ بند کر کے اس طرح کھڑا تھا جیسے تماشہ دیکھ رہا ہو۔

”کاشی میں تسمی ہوئی۔“ بھی زور سے چیخی۔ ”میں گاؤں گی گاؤں کی۔“

”چپ! بڑے چچا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دبا دیا۔

بڑی چچی ہانپ ہانپ کر اپنے شوہر کو انگ ہٹا رہی تھیں اور عالیہ کمرے کی

دبلیز پر کھڑی آنکھیں پھاڑے ہوئے چچا کو دیکھ رہی تھی۔ بڑے چچا آج کتنے عجیب

طریقے سے اس گھر میں اپنی اہمیت جتا رہے تھے اور وہ بھی صرف اس لئے کہ ان کے سیاسی عقائد کو نہیں لگ رہی تھی، اس وقت بڑے چچا اسے سیاسی ڈاکو معلوم

ہو رہے تھے۔

”غضب خدا کا، جوان لڑکی پر ہاتھ اٹھاتے ہو، بن ماں کی بچی پر۔“

بڑی چچی کی آواز بھرا رہی تھی۔ وہ بڑے چچا کو کھینچتے ہوئی کمرے سے باہر لے گئیں

تو عالیہ دوڑ کر بھی کے پٹ تکی جو پرانی سسری پر پڑی سسک سسک کر رو رہی

تھی۔

”بچا باہر بھاگ جائے۔“ روتے روتے بھی ایک دم چپ ہو کر جیسے بڑے

سکون سے چٹ لیٹ گی۔

عالیہ باہر آکر آئے کے خراب سے تک کر کھڑی ہو گئی۔

بڑی چچی زار و قطار رو رہی تھیں۔ ”اب اگر کبھی ہاتھ

لگایا تو یاد رکھنا اپنی جان دے دوں گی، میرا تو کلیجہ پھٹ گیا، بن ماں کی بچی، میں نے

اسے پالا ہے، میرے دل میں اس کی ماسٹا ہے۔“ اس وقت انہیں یہ احساس ہی نہ

رہا تھا کہ بھی غریب تو خود سے بل گئی۔ بڑی چچی اسے پالنا تو چاہتی تھیں مگر

ڈیروں کاموں کے لیے میں دہنے کے بعد انہیں فرمت ہی کہاں ملتی جو بھی کو بھی اس کا پیدائشی حق دے سکتیں۔

”میں تو خود گھر میں کسی سے نہیں بولتا مگر یہ لڑکی عذاب ہے، کل ہی ظفر میاں کو خط لکھا ہوں کہ کسی کے ساتھ اس کے دو بول پڑھا کر اس گھر سے یہ لعنت دور کر دو۔“ بڑے بچانے کوٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں اور بڑی چیخ آنسو پونچھ کر بان بنانے لگیں۔ اماں ایسے آرام سے بیٹھی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

ہنگامے کے بعد کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بڑے بچا کا چہرہ تنہا ہوا تھا۔ وہ بار بار آنکھیں کھولتے اور بند کر لیتے۔ اسی وقت جمیل بھی آ گئے۔

”سب چپ کیوں ہیں، کل عید ہے بھی۔“ جمیل بھیانے عالیہ کی طرف دیکھا جو اوجھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

”پٹائی ہوئی ہے۔“ نکلیل نے جمیل بھیانے کی طرف جھک کر کہا۔

”کس کی پٹائی ہوئی ہے؟“

”ارے کچھ بھی نہیں، وہی بھی، کاشی میں تلمی ہوئی، کی رٹ لگا رہی تھی۔ باہر مسمان بیٹھے تھے، تمہارے اماں نے ایک تھپڑ لگا دیا۔“ بڑی چیخ نے بات کو بالکل ہلکا بھلکا بنا کر کہا اور پھر جلدی سے ایک بالگے میں ٹھونس لیا۔

”مگر آپ نے اسے مارا کیوں، آپ اسے سمجھا سکتے تھے، اس کی بد تمیزی کو روک سکتے تھے، مگر مارنا کہاں کا انصاف ہے، وہ اپنے خیال کا اظہار کرتی ہے تو آپ چرتے کیوں ہیں۔ جب آپ لوگوں کو نظریے کی آزادی نہیں دیتے تو اپنا ملک کس طرح آزاد کرانیں گے اور اگر آپ کا ملک آزاد بھی ہو گیا تو اس آزادی کو کیسے برقرار رکھیں گے؟“ جمیل بھیانے بڑے جوش سے ایک ہی سانس میں اتنا کچھ کہہ ڈالا۔

”ساجزادے تم گھریلو باتوں کو ملکی معاملات سے مت نکرایا کرو اور نہ زیادہ قابلیت بھاڑا کرو، تم کچھ نہیں جانتے۔“ بڑے بچانے سخت تحارت سے دیکھ کر پھر آنکھیں موند لیں۔

”آپ میری قابلیت کی بات نہ کیا کریں، آپ نے تو مجھے صرف پرائمری تک“

پڑھا کر کھلی ڈنڈا کھینچنے کو چھوڑ دیا تھا اور پھر ملک آزاد کرانے لگے تھے، جیسے میں تو آپ کے ملک کا باشندہ تھا ہی نہیں، جیسے مجھے تو ابھی زندگی گزارنے کا کوئی حق ہی نہ تھا۔ میں نے بی اے نہیں کیا ہے، لوہے کے پتے چبائے ہیں۔ ذرا آپ یہ تو بتائیں کہ جب آپ کو ایک گھر کا خیال نہیں تو اتنے بڑے ملک کے اتنے بت سے گھروں کا کس طرح خیال کریں گے۔ یہ بھی خوب رہی کہ ایک گھر کو قریان کر کے دو گھروں کو بچاؤ۔“

”لاحول ولا، کیا ہے نکلی تقریر کر کے دماغ چاٹ رہے ہو، میاں آزادی اور قربانی کا مفہوم تمہاری سمجھ سے بالا ہے، اس اپنی شاعری کرو اور داد پاؤ، رگ مگل سے بلبل کے پر باندھو اور خوش رہو۔“ بڑے بچانے کوٹ لے لی۔

”جی بالکل درست ہے مگر۔“ جمیل بھیانے عالیہ کے سامنے کس طرح بار مانتے۔ وہ پھر کچھ کہنا چاہتے تھے کہ بڑی چیخ مٹا بیٹھے تھیں۔ ”ہائے میں کہتی ہوں کہ اس گھر کا آواہی بگڑ گیا ہے، حد ہے کہ بیٹے صاحب اپنے باپ سے بحث کر رہے ہیں، خدا کی قسم ایک دن زہر کھالوں گی۔“ بڑی چیخ پر رقت طاری ہونے لگی۔

”بھی ٹھیک تو کہتا ہے جمیل۔“ اماں نے جمیل کی حمایت کی مگر وہ تو چپ ہو کر بڑی بے بسی سے اپنی لوہے کی کرسی پر جا بیٹھے تھے اور ہاتھ مل کر کچھ سوچ رہے تھے۔

”دونوں وقت مل رہے ہیں اور یہ لڑائی جھگڑے، اس ملک کے دکھ نے تو سب کچھ تباہ کر دیا۔“ کرکین ہوا پر طرف جلی ہوئی لائٹنیں رکھتی پھر رہی تھیں۔

”بڑے آئے ہمدردی کرنے والے۔“ مہمی چھپاکے سے باہر نکل آئی اور بڑے بچا کے پلک کے پاس کھڑی ہو گئی۔ ”ہمیں کون روک سکتا ہے، ہاں کاشی میں تلمی ہوئی سب بکریاں چر گئیں۔“ وہ زور سے چیخیں۔

”لاحول ولا۔“ بڑے بچا بے ساختہ ہنس پڑے۔ ”تعلیق بالکل

ہے۔“

بڑے بچا کے ہنسنے ہی نکلیل، اماں، بڑی چیخ اور جمیل بھیانے ہنسنے لگے۔

”ہاں، اب ٹھیک ہے۔“ بھی جمیل بھیا کی طرف بڑھی — تم ہنسو، تم سے کس نے کہا تھا کہ میری حمایت کرو، میں تم جیسوں کو منہ نہیں لگاتی، اب میں ان جیسوں سے محبت کروں گی۔ خواہ خواہ ہی اے کرنے کے لئے میرے سامنے ناک رگڑتے تھے۔“ بھی پھر اپنے کمرے میں جانے کے لئے مڑ گئی مگر کمرے کی دبلہز پر ہی بیٹھ رہی۔ چند لمحوں کے لئے کیسا سناہ چھا گیا۔

سب نے جیسے چونک کر جمیل بھیا کی طرف دیکھا، سب سے زیادہ مہری نظریں اماں کی تھیں مگر جمیل بھیا بڑی سنجیدگی سے نظریں جھکائے کھیل کی کتاب کے ورق الٹ رہے تھے اور اس سانے میں بڑے بچا اس طرح کھار رہے تھے جیسے گلے میں یکہ پھنس گیا ہو۔

”آج انہوں نے اپنا پانچ روپے کا نوٹ بھی بھاڑ ڈالا، مجھے دے دیتیں تو میں منوں میں اپنے عید کے کپڑے سلا لیتا۔ اب میں ان کے خط نہیں لے جاؤں گا۔“ کھیل نے نوٹ پھینکے کی اطلاع کے ساتھ ایک اور اعتراف کر دیا۔

”کہاں لے جاتے تھے خط؟“ اماں نے گہرا کرپ چھا۔
”تھانیدار کے بیٹے منظور صاحب کو دیتا تھا۔“ کھیل نے بھیگی کی طرف دیکھا کہ بڑی معصومیت سے کہا۔

”ارے ارے۔“ اماں اور بڑی چچی اس دھماکے سے خائف ہو کر رہ گئیں۔ سب خاموش تھے۔ کوئی کسی کی طرف نہ دیکھ رہا تھا۔ کتنی مہری خاموشی چھا گئی تھی۔

بھی اٹھی اور بڑی بے نیازی سے سب کے احساسات پر دراتی زینے پر ہوئی۔

عالیہ نظریں مڑ دگڑ کر کھیل کو دیکھ رہی تھی، وہ ڈر رہی تھی کہ اب بڑے بچا بھی کا برا حشر کریں گے۔ گیارہ بارہ سال کا کھیل اسے باجی مرد نظر آ رہا تھا۔

بڑے بچا نے کوٹ بدلی تو عالیہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی، اسے ایسا محسوس ہوا کہ بڑے بچا بھی پر حملہ کرنے کے لئے اٹھ رہے ہیں۔ مگر بڑے بچا کوٹ لے کر کم سم پڑے رہے تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔

”بھئی حد ہے بڑے بھیا“ — اماں نے پھر کر بڑے بچا کی طرف دیکھا — ”کیا پیسے کے ساتھ ساتھ اس گھر کی حیا بھی اڑ گئی۔ پہلے بھی اس خاندان میں کیا کچھ نہیں ہو چکا جو اب بھی کسر پوری کرے گی۔ مار مار کر اس کا بھر کس نکال دیجئے، نہ کہ چپ چاپ لیٹے ہیں۔“

بڑے بچا اٹھ کر بیٹھ گئے — ”کھیل بیٹھک سے قلم کاغذ لے آؤ، میں ظفر میاں کو خط لکھ دوں، وہ شادی کی اجازت دے دیں تو پھر کوئی لڑکا ڈھونڈ لوں گا۔“

کھیل بھاگ کر قلم کاغذ لے آیا اور بڑے بچا خط لکھنے بیٹھ گئے۔
کیا بڑے بچا اپنی بیٹی کی طرح بھی کو بھی کیس دھکیل دیں گے۔ عالیہ نے دکھے دکھے جی سے پوچھا اور آسوس ضبط کرنے کی کوشش میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔
”میرا بس چلے تو ہڈیاں تو زردوں، کیا مزے سے چھلاوہ اوپر چلی گئی۔“
اماں برابر بھڑکے جا رہی تھیں۔

”واہ سب لوگ عید کا چاند دیکھنا تو بھول ہی گئے۔“ کھیل بڑ برا کر ہنگ سے کودا اور اسی بہانے باہر بھاگ گیا۔ جمیل بھیا اس کی طرف سے بالکل بے خبر بیٹھے تھے۔

دروازہ زور سے کھڑکا۔ نچر پھو بھی کا تار تھا۔ وہ کل صبح پہنچ رہی تھیں۔

— ”اور تم جیل میاں کیا کر رہے ہو؟“ انہوں نے جیل بھیا سے پوچھا۔

”بس بی اے کر کے بیٹھ رہا ہوں۔“ جیل بھیا نے جواب دیا۔

”واہ صرف بی اے سے کیا ہوتا ہے؟“ آدمی جاہل ہی رہ جاتا ہے، تھوڑی تعلیم خطرناک ہوتی ہے۔ کرنا ہے تو ایم اے بی بی کر دو، اب مجھے دیکھو جس کالج میں جاؤں گا توں ہاتھ لی جاتی ہوں مگر ایم اے بھی کرو تو انگلش میں، اردو ایم اے تو ہر جاہل کر سکتا ہے۔“

”درست ہے، میں بھی انگریزی ہی میں ایم اے کر لوں گا کبھی۔“

”منظر بھیا نے بھی جیل جاکر جانے کون سا تیر مار لیا، بس حد ہے بھی، کوئی خط و طبع بھی آیا ان کا کہ نہیں؟ یا شرمندگی کے مارے چپ ہیں؟ مجھے تو ایک خط بھی نہ لکھا۔“ نجمہ پھوپھی اماں سے مخاطب تھیں مگر اماں اس طرح بان بانی رہیں جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

عالیہ کاجی کڑھ گیا۔ یعنی کہ اباجی بن بھی انہیں مجرم سمجھتی ہیں، اس کاجی چاہا کہ نجمہ پھوپھی کی زبان کاٹ لے۔ اچھا ہی ہوا جو اماں نے ان کی بات کا جواب نہ دیا۔

”ارے بھی ممی، تم نے بھی کچھ پڑھا لکھا یا نہیں؟“ ممی کے انتہائی عشق کے اظہار پر انہوں نے اس کی بیٹھ پر تھکی دی۔ ممی نے شرما کر سر جھکا لیا۔ جہالت کے احساس سے وہ سخت شرمندہ نظر آ رہی تھیں۔

”اب تو تیس نوکری کتنی ہے؟ اس نے بس کل سے ممی کو پڑھانا شروع کر دوں۔ گی ہے بچاری جاہل ہی رہ گئی اور کسی نے توجہ نہ دی۔ اس خاندان کی بی تو بدھنسی ہے کہ کوئی لڑکی پڑھی لکھی نہ تھی۔“ نجمہ پھوپھی نے عالیہ کو بھی جالوں میں شمار کر لیا۔ ”تو اب ممی تم میری تولیہ صابن وغیرہ غسل خانے میں تو رکھ آؤ، ذرا ہاتھ منہ دھو کر عید منانے کی سوچو۔“

نجمہ پھوپھی انھیں تو ممی چاہاے کی گوث سے ابھی غسل خانے کی طرف بھاگی۔ آج بن ٹھن کر تو اس نے جیل بھیا کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا۔ اس نے ایک بار بھی ان کی طرف نہ دیکھا۔ جیسے ظاہر کر رہی ہو کہ یہ سنگھار تھمارے لئے

نجمہ پھوپھی اپنے ڈھیروں سامان کے ساتھ آگئیں۔ وہ صرف بڑی چچی سے گلے ملیں اور سب کو نظر انداز کر دیا۔

عالیہ نے اپنے ہوش میں انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ نچی ہوئی ہمنویں پہلی تاریخ کے چاند کی طرح ٹلکی ہو رہی تھیں، بپے بکھرے ہوئے تھے اور میک اپ کے مارے اصلی صورت پہچانی نہ جاتی تھی۔

ممی سب کچھ بھول گئی تھی اور صبح مع سنگھار کر کے اپنی اماں مرحومہ کے جہیز کا لگا ہوا جوڑا پہن کر بڑی خوب صورت لگ رہی تھی۔ نجمہ پھوپھی نے اسے لفت نہ دی تھی مگر وہ تھی کہ ان کے پاس کھسی جاری تھی۔ اسے پتہ تھا کہ اماں اور بڑی چچی نجمہ پھوپھی سے کد رکھتی ہیں۔

جیل بھیا اپنی لوہے کی کرسی پر خاموش بیٹھے تھے، وہی تو انہیں اسٹیشن لینے گئے تھے۔ بڑے چچا صبح ہی صبح نماز کے بعد ادھر سے کیس چلے گئے تھے۔

”نجمہ پھوپھی، گھر میں اور لوگ بھی ہیں۔“ جیل بھیا نے انہیں یاد دلایا۔ شاید انہیں برا لگا تھا کہ انہوں نے عالیہ اور ان کی اماں سے ایک بات بھی نہ کی تھی۔

”دیکھ رہی ہوں بھی، اتنے لمبے سفر سے تھک گئی ہوں، بڑے بھیا کہاں ہیں؟ وہ اپنی سیاست بگھار گئے ہوں گے کیس۔ اور تم عالیہ، کچھ پڑھ رہی ہو کہ نہیں؟“

”جی ایف اے کا امتحان دینے والی ہوں۔“ عالیہ نے دھیرے سے جواب دیا۔

”خوب! خوب!“ نجمہ پھوپھی کے چہرے پر سخت ناگواری کے آثار تھے

نہیں، جنکو کے لئے ہے۔

کریمین ہوا نے نگر پھر بھی کے لئے چائے بنا کر بڑے سیلے سے تخت پر رکھا دی اور پھر سویاں پکانے میں متنبک ہو گئیں۔ ”عید میں منوں کے حساب سے سویاں پکتی تھیں، مگر اب تو وہ دن نہیں رہ گئے۔ اللہ بڑے مہاں کو محل دے، سب لٹا بیٹھے۔“ دو سر سویوں کا زورہ پکاتے ہوئے کریمین ہوا بیدار رہی تھی۔

بڑی چچی بولیں ”تم بھی کپڑے بدل لو عالیہ میری پٹی، پھر مکھلے والیاں آنے جانے لگیں گی تو دیکھ کر کیا کہیں گی۔ تم نے نئے کپڑے بھی تو نہیں پہنے۔“

فرصت ہی نہیں ملی بڑی چچی۔ ”اس نے آہستہ سے کہا۔ جیل بیا اے بڑی شاکی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔“ میں ابھی کپڑے بدل لوں گی۔“

وہ اپنے کمرے میں جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نگر پھر بھی غسل خانے سے آکر چائے پینے بیٹھی تھیں۔

نزعوں پر چڑھتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا کہ کھیل بان کھائے اور گلے میں ہار ڈالے گھر میں داخل ہو رہا تھا مگر سامنے ہی جیل بیا کو دیکھ کر اس نے ہار گلے سے نوج کر مٹھی میں چمپا لے۔

کپڑے تبدیل کر کے عالیہ اپنے کمرے میں چپ چاپ بیٹھی رہی۔ جیل میں اب ایک عید کس طرح آئی ہوگی۔ اس کا جی دکھ رہا تھا۔

”مجھ سے عید نہیں ملو گی عالیہ؟“ جیل بیا بھی اوپر آگئے۔

گلیاں بچوں اور سوسے والوں نے کتنا اودھم ڈھار کھا تھا۔ اس نے کھڑکی کے پٹ بھیڑ دیئے۔

”پھر؟“

”پھر کیا؟ عید نہ ملو گی؟ آج کے دن تو دشمن بھی دشمن سے مل لیتا ہے، پھر میں دشمن تو نہیں ہوں۔“

”میں تو آپ کو کچھ بھی نہیں سمجھتی۔“

”کچھ نہ سمجھتا تو انتہائی ہنگامی بات ہے۔“

”خدا کے لئے جیل بیا یہ ٹیڑھی ٹیڑھی باتیں نہ کیا کیجئے، اچھے بھلے انسان

ہیں جائیے۔ مجھے محبت و جنت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جو مرد عورت ایک دوسرے کو محبت کے دھوکے دیتے رہتے ہیں ان سے مجھے خنت چڑ ہے۔“

”کیا ابائی لا بیری سے اس موضوع پر کوئی کتاب مل گئی ہے؟“ جیل بیا نے بڑے طرے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں اس لا بیری سے مل گئی تھی جس کی کتبھی آپ کو نہیں دی جاتی۔“ وہ زور سے ہنسی، جیل بیا ایک دم سنجیدہ ہو رہے تھے۔

”عالیہ تم مجھے جتنا فکرا رہی ہو، اتنا ہی تم سے قریب ہوتا جا رہا ہوں، اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو میں دنیا میں کچھ نہ کر سکتا گا۔“ جیل بیا کا نہ ہمتا کیا، ان کی آنکھوں سے دکھ چھلکا پڑا۔ عالیہ نے سر ہٹا دیا۔ اس وقت اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اسے جیل بیا کی نظروں سے بھانہ نہ ملی تو جانے کیا ہو جائے گا۔

”اگر میں کسی اور سے محبت کروں تو آپ کسے گا۔“

”جب جھوٹ، عورت مرد سے محبت کئے بغیر وہ ہی نہیں سکتی، روایت کے مطابق پیدا بھی مرد کی پہلی سے ہوئی ہے۔“ جیل بیا جوش میں آگئے۔

”اچھا اب میں سمجھی۔“ وہ ایک دم ہنس پڑی۔ ”یہ مرد اسی لئے تو عورت کو فریب دیتا ہے کہ اسے حضرت آدم کی پہلی کا درد یاد آتا ہو گا۔“

جیل بیا بھی اس کے ساتھ بے ساختہ ہنس پڑے مگر پھر سنجیدہ ہو گئے۔ ”تم میری ہو عالیہ، میں جانتا ہوں کہ میں زندگی میں سب کچھ کروں گا، میں صفر نہیں ہوں جس نے تہیز کو ختم کر دیا۔“ پھر وہ جیسے سرگوشی کرتے لگے۔ صفر یہی میں ہے۔ وہ کیونٹ پارٹی کا ممبر ہے، آج کل جیل میں ہے۔“

عالیہ ذرا دیر کو بالکل چپ ہو گئی۔ وہ خالی خالی نظروں سے جیل بیا کا نہ

تک رہی تھی۔ جتنی ہوئی باتیں کس تیزی سے انسان کے دماغ پر بھٹ پڑتی ہیں۔

”عالیہ، میں اپنی ساری زندگی تمہارے لئے وقف کر دوں گا، یقین کرو عالیہ کہ میں تمہارے لئے سب کچھ کروں گا لیکن اگر تم نے زندگی کے سفر میں میرا

ساتھ نہ دیا تو میں تمہک جاؤں گا میں تو کچھ بھی نہ کر سکتا گا۔“

اس نے غور سے جیل بیا کی طرف دیکھا۔ ”کیسی سزی بی باتیں

ہیں، وہی باتیں جو آپا حیمہ کمائیوں میں پڑھ کر مر گئیں۔ یہ عاشق کس قدر کٹھنی صفت ہوتے ہیں۔ اس نے نظرس جھاکیں، بھیا کی آنکھوں کی کمرائی سے کیا عجیب سا لگتا۔

”تو پھر جیل بھیا آپ آج ہی تھک جائیے، چائے وغیرہ کا انتظام کراؤں؟“ وہ زور سے ہنسی۔ بات مذاق میں اڑ جائے تو شاید جان چھوٹے مگر جیل بھیا پر تو تنبیہ کی کامیابیت نازل تھا۔

”دیکھو عالیہ۔“ وہ اس کی طرف جھپٹے اور پھر جم کر کھڑے ہو گئے۔

”یہ لیجئے اپنا خط، مسلم لیگ کے دفتر کانپور سے آیا ہے، میں نے بڑی چچی کی نظرس بھا کر اڑا لیا ہے، ارے ہاں خواہ مخواہ بے چاری بڑی چچی اس صدمے سے بھی دو چار ہوتیں۔“ عالیہ نے کاپی کے سچ سے لغاتہ نکال کر اس طرح جیل کے ہاتھ میں نکا دیا جیسے کہ بات ختم ہو گئی ہو۔

جیل بھیا بحرہوں کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے۔ جس بات کو اتنے دنوں سے چھپائے تھے وہ دراکر سامنے آگئی تھی۔ ”اچھا بھائی عید مبارک ہو، اماں سے خط کا ذکر نہ کرنا۔“ وہ جلدی سے چلے گئے۔

”ممی، نجمہ پھوپھی کا بستر بند کھینچ کر اوپر بڑے کمرے میں لا رہی تھی اور اس مشقت میں اس کی اماں مرحومہ کے بری کے جوڑے کی گوٹ پھٹ گئی تھی۔“

”ممی، نجمہ پھوپھی تمہاری اس محبت کی کیا قدر کریں گی، تم مجھ سے کیوں روٹھ گئیں۔“ عالیہ نے بڑے پیار سے ممی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے کپڑے تبدیل کرنے لگی۔

عید گاہ سے واپس آتے ہوئے بیچ کھلی میں بڑے زور سے اودھم مچا رہے تھے۔

”کریمین ہوا،“ مٹھلی بھابی اور بڑی بھابی کو میرا سلام کہو اور عید مبارک بھی۔“

سیڑھیوں کو طے کرتے ہوئے عالیہ نے اسرار میاں کا خوشی سے لرزتا ہوا پیغام سنا۔ کیسا جی چاہا کہ آج تو وہ بھی اسرار میاں کو سلام کر لے۔ عید کا دن ہے

آخر۔

”ممبر کرو، تم کو بھی سویاں بھجوا دوں گی۔“ کریمین ہوانے اس طرح جواب دیا جیسے مذاق اڑا رہی ہوں۔

نجمہ پھوپھی، کریمین ہوا کو تھواری کا ایک روپیہ دے رہی تھیں۔ انہوں نے عالیہ کی طرف دیکھا تو وہ الٹے پیروں اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

”ن۔“

”تمہارے جیسے ذہن کی لڑکی کے لئے یہ کتابیں پڑھنا ضروری ہیں۔“ بڑے بچا جب خوش ہوتے تو اپنی لائبریری کی کتابیں پڑھنے کی صیحت شروع کر دیتے۔

”بڑے بچا جب آزادی مل جائے گی تو پھر کیا ہو گا؟“ اس نے سخت بے وقوفی کے ساتھ بڑے بچا کی دل پسند باتیں پھینکنا چاہیں۔ بڑے بچا کے سامنے اس نے سیاست سے نفرت کا بھی اظہار نہ کیا تھا۔

”آزادی مل جائے تو پھر کیا رہ جاتا ہے۔ مرنا اور جینا دونوں آسان ہو جاتے ہیں۔ دعا کرو کہ میں غلامی کے دور میں نہ مرؤں۔“

”بڑے بچا خدا آپ کو بیش سلامت رکھے۔“ اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔ گھروں کی اتنی ساری کتابیں اور برادریوں کو دیکھنے کے بعد بھی وہ اپنے ابا اور بڑے بچا سے نفرت نہ کر سکتی تھی۔

صدر دروازے کی زنجیر بڑے زور سے کھڑکی کو ایک دم کھڑی ہو گئی۔

”نھر جاؤ، تم مت جاؤ میں دیکھ لوں گا۔“ بڑے بچا باہر جا کر فوراً ہی پلٹ آئے۔ بڑی چچی برآمدے میں تخت پر بیٹھی ڈایا سامنے رکھے پانک کے پتے چن رہی تھیں۔ بڑے بچا ان کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ ”میرا بلادا آگیا ہے۔“ ان کی پیشانی پر ہلکی سی ٹھکری تھی۔

”کہاں آ؟“

”انگریز بادور کا“ چار چھ مہینے بعد والہاں آجاؤں گا، تم میرا سامان ٹھیک کر دو۔“

عالیہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ بڑی چچی ڈایا پیٹیکر کا ایک دم اٹھ پڑیں۔ کمر بن بوا میلے برتنوں کے ڈمیرے ابھریں اور ٹکر ٹکر سب کا منہ ٹکٹے لگیں۔

بڑی چچی کمرے میں جا کر بڑے بچا کے کپڑے کس میں ٹھونسنے لگیں۔ ”بھلا ان حرام زاولوں کا کیا بگاڑا ہے کسی نے جو روز روز پکڑتے ہیں، کیا کر لیں گے پکڑ لے، بھلا کسی کی زبان بھی بند کی ہے کسی نے۔“ بڑی چچی اماں کی طرف دیکھ کر کہہ

اتوار کا دن تھا۔ چائے پینے کے بعد بڑے بچا بیٹھک میں جانے کے لئے اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ کچھ بچے بچے سے نظر آ رہے تھے۔ عالیہ ان کے پاس جا بیٹھی۔ بڑے بچا کو اس طرح دیکھ کر بے چہن ہو گئی تھی۔ ”ہے، بچا رہے بڑے بچا“ کوئی ان کی پروا نہیں کرتا۔ اگر بڑی چچی اس گھر میں نہ ہوتیں تو سب انہیں بھون کھاتے جو اٹھتا ہے اپنی ٹکلیوں کا رونا روتا ہے۔ کوئی ان کی ٹکلیوں کو نہیں پوچھتا اور یہ ہیں کہ سب کچھ سے جاتے ہیں، اپنی سگی بہن کس طرح شرمندہ کرتی ہے، صرف اس لئے کہ اپنے کھانے کے روپے دینا پڑتے ہیں۔ وہ یہ بھول گئیں کہ کبھی بڑے بچا کے روپوں سے ہی تعلیم حاصل کی تھی۔

”پڑھائی کا کیا حال ہے بیٹا؟“

”ٹھیک ہے بڑے بچا“ آپ کی طبیعت تو خراب نہیں؟“ وہ بھرے بھرے جی سے بولتی چلی گئی۔ ”آپ اپنی صحت کی ذرا فکر نہیں کرتے۔ آپ کتنے کمزور ہو رہے ہیں“ انسان کچھ اپنے لئے بھی تو کرتا ہے۔“

”ایں“ بیٹا میں تو ٹھیک ہوں۔“ بڑے بچا حیران ہو کر عالیہ کا منہ تک رہے تھے۔ ”ارے کیا کوئی میری فکر کرنے والا بھی ہے، کیا کسی کو مجھ سے بھی ہمدردی ہو سکتی ہے۔ میں تو اس گھر کا بھوت ہوں جو سب کچھ کھا گیا۔“

بڑے بچا کی آنکھوں میں اس نے دکھ کی وہ دم گم سی تحریر پڑھ لی جسے چھپانے کے لئے وہ خواہ مخواہ بند رہے تھے۔

”واہ ری بچی، مجھے آرام کی کیا ضرورت ہے، ہٹا کٹا ہوں، خواہ مخواہ فکر کرتی ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ میری لائبریری سے کتابیں پڑھتی ہو کہ نہیں؟“

”پڑھتی تھی بڑے بچا مگر اب امتحان سر پر ہے نا اس لئے سب چھوڑ بیٹھی

ہندی سے اوپر چلی گئی۔ اماں اور کریم بوا کی موجودگی میں وہ اسرار میاں کے لئے چائے تو بنا نہیں سکتی تھی، پھر میاں بیٹھے کا کیا فائدہ۔
چار دن بعد امتحان شروع ہونے والے تھے مگر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کس طرح پڑے۔

دن کے دو بج گئے، گلی کے اس پار ایک اجڑے سے درخت سے الو کے بولنے کی آواز آ رہی تھی اور یہ آواز اس کے ذہن کے سانے کو اور بھی بدھاٹے چلی جا رہی تھی مگر خالم بھوک تھی کہ دراتی چلی آ رہی تھی۔ چاہے صدمے سے وارغ پھٹ جائے مگر بھوک نہیں رکتی۔ یعنی کہ آج وہ بڑے چچا کے جیل جانے کے غم میں صدمے سے جواب نہیں پاسکتی۔

وہ بستر سے اٹھ کر نیچے چلی گئی۔ تخت پر پلٹیں گلی ہوئی تھیں۔ اماں قس کے پاس بیٹھی پان تھوک کر سرخ کیاں کر رہی تھیں اور بڑی چچی دسترخوان کے پاس بیٹھی پیسے اوتگھ رہی تھیں۔ مہمی اور نجر پھو بھی صبح سے بازار گئی تھیں اور اب تک واپس نہ آئی تھیں۔

کھالو، سب کا کماں تک انتظار کروں؟“ بڑی چچی نے کہا اور وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ اسنے میں جیل بھیا بھی کھیل کر کھینچے آگئے اور جیسے ہر گھر میں داخل ہوئے، کھیل پر تھپڑ برسانے لگے۔

”یہ کچھ نہیں پڑتا لکھتا“ سارا دن آوارہ گھومتا رہتا ہے، میں نے ابھی ابھی اسے سخت لٹکوں کے ساتھ گھومتے دیکھا ہے۔“

”اور مارو بد ذات کو“ بڑی چچی نے جمل کر کہا۔ ”جب یہ حالت ہے تو اس گھر کو کون سنبھالے گا۔“

”انہیں کی کتابوں سے تو پڑھتا ہوں“ کھیل بھیا کے وار روکنے کے لئے اوہرا دھر چ رہا تھا اور عالیہ کو نجات طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”بس بھی کیجیے جیل بھیا، اب نہیں گھوے گا۔“ عالیہ نے سفارش کی تو جیل بھیا الگ ہو گئے اور قس کے نیچے ہاتھ دھوئے لگے۔

”ارے اسے کیوں بچاتی ہو، یہ کبھی نہیں ٹھیک ہوگا، میں یوں ہی ترب

ترب کر مر جاؤں گی“ ان کا ٹھکانہ تو جیل میں ہے۔“
”کیا اب پھر گئے؟“ جیل بھیا ہاتھ دھو رہا بھول گئے۔
”اور نہیں تو کیا، آج نو بجے کے قریب پولیس آکر لے گئی، اللہ سے توبہ ہے بس۔“ اماں نے فوراً جواب دیا۔

”خوب!“ جیل بھیا پھر ہاتھ دھوئے لگے۔ ”یہ کاٹھری لینڈر تو جیسے جیل جانے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتے، خالص ہندوؤں کی جماعت کے لئے اتنی قربانیاں دے کر جانے انہیں کیا مل جائے گا، کس قدر ہندو طبیعت ہے ان صاحب کی بھی، کیسے کیسے ہندو مسلم فساد ہوئے مگر ان پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔“

”شرم نہیں آتی اپنے باپ کو ہندو کہتے، وہ ہندو تھے تو تم کہاں سے مسلمان پیدا ہو گئے۔“ بڑی چچی مارے فیسے کے آپے سے باہر ہو گئیں۔ یعنی ان کے شوہر کو ہندو کہا جائے جب کہ انہوں نے ہندوؤں کے تہواروں میں آئے ہوئے حصوں کو پکھا تک نہیں۔ کبھی بھلا ایسی عورت کا شوہر ہندو ہو سکتا ہے؟

”اچھا بھی کڑ ہندو نہ سہی مسلمان سہی مگر۔“ جیل بھیا کھیا کر ہنسنے لگے۔ کھانا یوں ہی پڑا غصہ اہو رہا تھا۔

”اب تم سنبھالو تا گھر کو کیا میری موت کا انتظار کر رہے ہو؟“ بڑی چچی کھانا بھی چین سے نہ کھا رہی تھیں۔

”میں۔۔۔ میں۔۔۔ بس اب یہی سوچ رہا ہوں۔“ جیل بھیا بولکلا گئے تھے۔ ”دو چار دن میں لاور جا رہا ہوں، وہاں سے آکر نوکری کر لوں گا۔“ وہ کچھ سوچ سوچ کر کھارہے تھے۔ ذرا دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔

نجر پھو بھی اور مہمی بندلوں سے لدی پھندی اندر داخل ہوئیں تو خاموشی ٹوٹ گئی۔

”ارے کھیل ذرا آتکے والے کو یہ روپیہ تزا کر دوے دو“ نجر پھو بھی نے پرس سے روپیہ نکال اس کی طرف بدھا دیا۔ کھیل اب تک صحن میں لوہے کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اسے کمانے کے لئے بھی کسی نے نہ پوچھا تھا۔

”پہلے ہاتھ دھو کر کھانا کھا لو۔“ بڑی چچی نے کہا، مگر نجر پھو بھی تو بیٹل

کھول کر سب کو دکھانے کے لئے بے تاب تھیں۔

”عدہ بھی ہر کپڑے پر دام بڑھا دیئے ہیں۔ اب بھلا کوئی بتائے کہ یہ ریٹی کپڑا کیا گوروں کے کفن کے لئے جاتا ہے؟“ نجمہ پوچھی نے داد طلب نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔ مگر میاں تو سب اپنے غم میں مبتلا تھے۔ ہمچی کو ان کی بات پر بڑے زور سے ہنسی آئی۔

”تم لاہور جا کر کیا کرو گے؟ کیا وہاں ملازمت کرنے کا ارادہ ہے؟“ بڑی چچی نے جیل بمیا کی طرف دیکھا۔

”وہاں مسلم لیگ کا ایک بڑا زبردست جلسہ ہے“ ذرا اس میں شریک ہوں گا۔“ جیل بمیا جانے کیا سوچتے ہوئے بولے۔

”کیا کماء؟ جلسہ؟“ بڑی چچی اپنی جگہ سے اچھل پڑیں۔ ”ارے تو بھی؟“ تجھ پر جو گسادھا تھا تو اب تو بھی؟“ بڑی چچی دیوانوں کی طرح جیل بمیا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا کہ اچھل کر گردن دیوچ لیں گی۔

”بس عدہ ہے“ اس گھر کا خدای مالک ہے۔“ اماں نے بھی ہاتھ کا نوالہ رکھ دیا تھا۔ عالیہ کو ٹھکانے لگانے کی امید نہ توڑ دیا تھا اور جیل بمیا تھتے کر چپ چاپ بیٹھے گردن جھکانے لگے جا رہے تھے۔ تیر جو کمان سے نکل چکا تھا۔

”اگر تو نے اس سیاست بازی کو اپنایا تو جان دے دوں گی“ دہر کھالوں کی ایک دن، میری زندگی تپ تپ کر گزری ہے، اب میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے سب کچھ چاہئے باؤلے، تو سیاست میں نہیں جاسکتا۔ بڑی چچی کی دیوانگی کم ہو رہی تھی۔ جیل بمیا کھانا دانا بھول کر اپنی اماں کے گلے میں ہاتھ ڈالنے ہنس رہے تھے ”بھئی بس بھی کیجئے اماں۔“

نجمہ پوچھی نے کپڑے کے بنڈل سمیٹ کر پٹنگ پر ڈال دیئے۔ کوئی کبکھٹ دیکھتا ہی نہ تھا، جان بھل کر رہ گئی۔ کریمین ہوانے بیٹی میں کھانا لگا کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا، وہیں بنڈلوں کے ڈمیر کے پاس بیٹھ کر بڑی بے دلی سے کھاتے لگیں۔ ان کے چہرے سے نفرت برس رہی تھی مگر ہمچی آج بڑی مدت بعد جیل بمیا کو

بڑے اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔

”میں نہ کہتی تھی مگر مسلمان مسلم لیگ میں شامل ہو، مسلم لیگ زندہ باد۔“ ہمچی نے نعرہ بھی لگا دیا مگر اس وقت کسی نے اس کی خوشی اور نعرے کی پروا نہ کی، بڑی چچی جو ہاتھوں سے نگلی جا رہی تھیں۔ رو رو کر ان کی آنکھیں سرخ پڑ گئی تھیں۔ جیل بمیا انہیں تھپک رہے تھے، پانی پلا رہے تھے مگر ان کی دیوانی آنکھوں میں ذرا بھی ٹھنڈ نہ پیدا ہو رہا تھا۔

عالیہ حیران نظروں سے بڑی چچی کو دیکھ رہی تھی۔ ارے کیا یہ وہی بڑی چچی جنہوں نے اتنے برسوں تک بڑے چچا کی سیاسی زندگی میں ساتھ دیا تھا۔ بڑے چچا کی حمایت میں سب سے آگے آگے رہیں، جب اپنا ہی جلا تو انہیں چلی کئی سنا ڈالیں مگر کسی دوسرے کی زبان سے ایک لفظ نہ سنا۔ بڑے چچا جو بھی کرتے رہے اسے اپنے سر سے گزارتی رہیں اور آج صبح تک وہ جھٹکنے کے بجائے گرفتار کرنے والوں کو کوس رہی تھیں۔ کیا یہ صبر ضبط اس لئے تھا کہ انہوں نے اپنی ساری امیدیں اور آرزوئیں جیل بمیا کے گلے میں ہار بنا کر ڈال دی تھیں۔

”اماں اب آپ دیکھیے گاکہ میں کیسی ٹھٹ کی نوکری کرتا ہوں“ آپ کو چاندی کے تخت پر بٹھا دوں گا اور بس آپ کا بھی کام ہو گا کہ پان کھاتی رہیں اور میری دلہن آپ کے پان دھو دھو کر لاتی رہے۔“ جیل بمیا خدمت کے وعدوں کے ساتھ ساتھ اپنی اماں کو ہنسانے کی کوشش کر رہے تھے مگر جانے کیوں عالیہ نے دلہن کے نام پر ان کی آنکھوں کو اپنی طرف اٹھادیکھ کر نظریں جھکا لی تھیں۔

”واہ، کوئی یوں نوکری مل جاتی ہے، چاندی کے تخت ایسے نہیں ملا کرتے، نہ کوئی ٹریننگ، نہ انگریزی ایم اے۔“ نجمہ پوچھی بڑی حقارت سے بولیں اور ہمچی کو پھر ہنسی آنے لگی۔ وہ نجمہ پوچھی کے ساتھ بڑے غر سے کھانا کھا رہی تھی۔

”ہو نہ! مجھے تو مارتے تھے، اب دیکھئے کہ بیٹا بھی لگی ہو گیا۔“ ہمچی کو بڑے چچا کی ماریاد آگئی تھی۔ اس وقت کسی کو بڑی چچی سے ہمدردی نہ ہو رہی تھی۔

”ایم اے پاس کچھ نہیں جانتے اماں، مجھے بڑی ٹھٹ کی نوکری ملے گی۔“

جیل بمیانے سیدھا وار کیا۔

نجد پھو بھی بلبل اٹھیں۔ ”خدا کی شان ہے“ اب ایسے ایسے لوگ ایم اے پاس کو جا مل گئیں۔ سچ ہے توڑی تعلیم خطرناک ہوتی ہے۔ اب ایسے لوگ بھارے سیاست میں حصہ نہ لیں تو کیا کریں؟ بڑے بمیانے بھی تو تیر مار لیا اور بھارے کرتے بھی کیا۔ ”نجد پھو بھی نے کھانا چھوڑ کر بڈل سمیٹ لئے۔ وہ جانے کتنی بار بڑے بچا پر طہر کر چکی تھیں۔ ان کے لیے عربی اور فارسی دان ہونے کی پہچنی اڑائی تھی۔ کئی بار کہا تھا کہ جب کوئی ڈگری لینے کی صلاحیت نہ ہو تو لوگ عربی فارسی پڑھتے ہیں۔

”نجد پھو بھی“ ان صبح نوبے آپ کے بڑے بمیا جیل جا چکے ہیں۔ جب وہ آئیں تو ان سے پوچھ لیجئے گا کہ مارا ہوا تیر کہاں لگا ہے۔ ”جیل بمیانے مڑ کر نجد پھو بھی کو دیکھا۔ ایک لمبے کو ان کا رنگ فق پڑ گیا تھا۔ ”ہے بڑے بمیا پھر چلے گئے!“ ”نجد پھو بھی نے سر قہام لیا۔ ”اس گھر کی کیسی بدنامی ہو رہی ہے“ جسے دیکھو جیل کاٹ رہا ہے۔

جیل بمیا کی چٹیلیاں بڑی چچی کو پر سکون کر چکی تھیں اور اب وہ مکر کر نجد پھو بھی اور جیل بمیا کو لڑتے دیکھ رہی تھیں۔

اب کسی نے بھی نجد پھو بھی کو جواب نہ دیا۔ وہ اپنے کپڑوں کے بڈل ممی پر لدوا کر اوپر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

نجد پھو بھی کے جاتے ہی ایک بار پھر سنانا جھامیا۔ عالیہ نے دیکھا کہ جیل بمیا اپنی اماں سے اپٹ کر بیٹھے ہوئے بڑے اچھے لگ رہے تھے اور ٹکیل اب تک تانگے کا کرایہ ادا کر کے نہ آیا تھا۔ عالیہ اس سنانے میں چپکے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

جیل بمیا کو لاہور گئے چو تھا دن تھا۔ ان کے جانے سے پہلے بڑی چچی کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ بس جیسے ان سے کچھ بن نہ پڑا تھا کہ اس مصیبت سے کس طرح خود کو بچالیں۔ پر جیل بمیا چلے گئے اور وہ کچھ بھی نہ کر سکیں۔ جیل بمیا کے جاتے ہی اخباروں کی خبریں آنکھیں دکھانے لگیں۔ اخبار فروش کلیجہ بھاڑ بھاڑ کر پیچھے رہے۔ ”پولیس اور خاکساروں کے درمیان تصادم“۔ کتنے ہی خاکسار گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ ”مسلم لیگ کے اجلاس میں راکٹ کا امکان۔“

بڑی چچی اخبار فروشوں کی آواز پر دل قہام قہام لیتیں۔ عالیہ انہیں ہر طرح تسلی دیتی، لاکھ سمجھاتی کہ جیل بمیا تو بلی ہیں، خاکسار نہیں، مگر بڑی چچی کسی طرح یمن نہ لیتیں۔ ممی بھی ایک دم خاموش رہنے لگی تھی۔ وہ صبح صبح جا کر کھلے سے اخبار مانگ لاتی اور بڑے اسماک سے پڑھ کر گھنٹوں اپنے بستر پر اوندھی پڑی رہتی۔ جب سے بڑے بچے گئے تھے اخبار آنا تو بند ہو گیا تھا۔ اب اس مد پر خرچ کرنے کے لئے کس کے پاس پیسے رکھے تھے۔ ممی اگر مہربانی کے موڈ میں ہوتی تو مانگا ہوا اخبار پڑھنے کو دے دیتی اور بڑی چچی سوئے بیٹھوں کی ٹیک لگا کر پڑھ لیا کرتیں۔ ویسے تو وہ کسی کو بھی اخبار پھونے تک نہ دیتی۔ ”پر ایسا ہے پھٹ جائے گا۔“

ان دنوں ممی نے پڑھنا لکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ نجد پھو بھی لاکھ کہتیں مگر وہ آٹاب اٹھا کر نہ دیکھتی، ورنہ اس سے پہلے تو یہ حال تھا کہ نجد پھو بھی کا دیا ہوا سبق گھنٹوں مثل مثل کر یاد کیا کرتی اور عالیہ کو اس طرح دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو کہ تم سے آگے نکل کر نہ دکھاؤں تو میرا نام ممی نہیں۔

کالج سے آنے کے بعد نجم پھوپھی بڑے غمزے سے چند لفظ پڑھائیں اور بدلے میں اسے ڈیمروں کام بتا دیتیں۔ سبق یاد کرنے کے بعد بس یہی کام رہ جاتے۔ ابھی کپڑوں پر استری ہو رہی ہے تو ابھی سینڈلیں پالش سے چمکانی جا رہی ہیں۔ دوپٹے رنگ رنگ کر اسنے ہارایک چھتی کہ انگوٹھے اور انگلیاں چمک کر رہ جاتیں۔

’میں اب ایک لونڈا کام کے لئے رکھ لوں گی۔‘ نجم پھوپھی اسے اتنا کام کرتے دیکھ کر اوپر ہی دل سے کہا کرتیں۔

’بیجے، بھلا میں کس کام کے لئے ہوں‘ واہ‘ اب میں آپ سے نہیں بولوں گی۔‘ عجمی مارے غلوں کے نجم پھوپھی کے پٹ جاتی اور وہ نمال ہو کر اسی وقت کوئی اور کام بتا دیتیں۔

چھ دن گزر گئے، جیل بھیا نہیں آئے۔ بڑی چچی تڑپ تڑپ پھر رہی تھیں اور اماں ان کی اس بے چینی پر پھر پھر اٹھتیں۔ ”ارے بڑی بھائی کیوں اپنی جان جلاتی ہیں، بیٹا بھی باپ کے نقش قدم پر چلے گا، بس اب اس سے بھی ہاتھ دھو لیں۔“

’مجھے تو اسی کے سامنے میں بیٹھنا ہے۔‘ بڑی چچی سے زندگی کی چیلپاتی ہوئی دھوپ اب برداشت نہ ہو رہی تھی۔

بڑی چچی نے یہ چھ راتیں چھالیہ کاکر گزاری تھیں۔ جب برآمدے سے کڑکڑکی آوازیں آئیں تو عالیہ اپنے بستر پر کودیں بدلے لگتی۔ رات کا سناٹا اور گہرا ہو جاتا۔ بڑی چچی کے لئے اس کا دل بھرنے لگتا۔ یہ سب کیا ہے، یہ کون سا جذبہ ہے جو اپنے پیاروں کو دکھ کی بھٹی میں جھلنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

قرار داد لاہور منظور ہو گئی، آٹھ کروڑ مسلمان اپنا حق لے کر رہیں گے۔ مسیح تڑکے تڑکے اخبار فروش چہنچہاگا جا رہا تھا۔ اخبار والے، اخبار والے۔ کھڑکیوں اور دروازوں سے بھانک بھانک کر لوگ آوازیں دے رہے تھے۔ آج اخبار خریدنے میں سارا محلہ پیش پیش تھا۔

عالیہ نے کھڑکی سے بھانک کر دیکھا۔ مسیح کیسی کھری ہوئی تھی۔ کان میں جیو

’اے اور ہاتھ میں بیٹل کی چھمچائی لٹیا پکڑے کوئی شخص سڑک کے ق پر نمائے کے لئے جا رہا تھا۔ اب یہ نما کر پوجا کرے گا، ہاتھ جوڑ کر بھگوان کی مورتی کے سامنے جھک جائے گا۔ یہ ہندو پوجا کرتے ہوئے اسنے خوبصورت کیوں معلوم ہوتے ہیں۔ اسے ایک دم کسم دیدی یاد آئیں۔‘

چلی منزل میں جانے کے لئے جب اس نے نجم پھوپھی کے کمرے کو طے کیا تو کسی نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ نجم پھوپھی کالج جانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں اور عجمی بانڈیوں کی طرح انہیں چیزیں اٹھا اٹھا کر دے رہی تھی۔ ”اللہ کرے نجم پھوپھی تم کو پڑھائی دیں عجمی۔“ عالیہ نے دل ہی دل میں دعا کی۔ چند لفظ پڑھنے کا کتنا سخت معاوضہ ادا کرنا پڑتا ہے غریب عجمی کو۔

چائے تیار تھی۔ کریمین ہوا گرم گرم کھجی چڑی روٹیاں تو سے اتار رہی تھیں۔ وہ اماں اور بڑی چچی کے پاس تخت پر بیٹھ کر چائے پینے لگی۔ ٹکیل اب تک سو رہا تھا۔ اسکو جانے سے چند منٹ پہلے اٹھا، وہ بھی ادھر کچھ دنوں سے بڑی چچی اسے زبردستی اٹھاتیں۔ ابھی چائے ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ صدر دروازے کی زنجیر زور سے کھڑکی اور کریمین ہوا بولکھا کر ادھر لگیں۔

جیل بھیا کا تار تھا۔ وہ خیریت سے تھے اور جلد آرہے تھے۔ بڑی چچی نے تار کے کاغذ کو جھٹ کر پاندان کی کھلیا میں چسپایا اور مارے خوشی کے چائے کی دوسری پیالی بنالی۔

اس وقت کریمین ہوا کسی ان دیکھی طاقت کی بلاتیں لے کر پھر سے روٹیاں پکانے لگیں۔ اس گھر کی ہر خوشی اور ہر غم ان کا اپنا تھا۔

عالیہ ٹاشٹر کے بیٹھک میں آئی۔ جب سے بڑے چچا جیل گئے تھے، اس نے پہلی بار بیٹھک میں قدم رکھا تھا۔ میز کرسیوں اور کتابوں کی الماریوں کے شیشے دھول میں آئے ہوئے تھے۔ گاندھی جی کی بڑی سی تصویر دھندلی ہو رہی تھی۔ تخت کی چاندنی اور گاؤں کیوں کے خلاف مبلے ہو گئے تھے۔ اسرار میاں کی بیڑیوں کے بلے ہوئے کھلے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ ساری کالو کمر میں کھوس کر وہ کمرہ صاف کرنے لگی اور پھر فرش جھاڑ کر وہ گاؤں کیے سے تک کر تخت پر بیٹھ گئی۔ اسے

بار بار ایسا لگتا جیسے ابھی ابھی دروازہ کھلے گا اور بڑے چچا اندر آجائیں گے۔

بڑے چچا نے جیل جانے کے بعد اسے خط بھی لکھا تھا کہ وہ بہت خوش ہیں۔

سرکار کی رونٹوں میں ایسا مزہ ہے جیسے کریمیں بوا کے ہاتھ کے پرائے کھا رہا ہوں

— بڑے چچا کا مزے دار خط یاد کرنے کے باوجود اسے بیشک بڑی سونی لگ

رہی تھی۔ وہ الماری سے ایک کتاب نکال کر باہر آگئی۔

نجمہ پھوپھی کالج جا چکی تھیں اور ممی آج بھی دن بعد اپنا سبق یاد کرتے

ہوئے پورے صحن میں ٹہل رہی تھی۔

بڑی چچی نے دن چمک کر مزارا۔ رات کو بھی بڑی چچی کے سروسے کی

آواز جلدی سے سو گئی۔ عالیہ بڑے سکون سے رات کے ایک بجے تک پڑھا کرتی۔

امتحان ختم ہو گئے تھے۔ اب وہ کچھ عرصے چھٹی منانا چاہتی تھی۔ وہ کس قدر
تھک گئی تھی۔ نصاب کی کتابوں سے جی آگیا تھا۔ اب وہ راتوں اور دوپہروں کو
بڑے چچا کی لائبریری سے لائی ہوئی کتابیں پڑھتی رہتی۔ سارا دن گرم گرم چوٹی
رہتی اور اسکول کے درختوں سے الو کے بولنے کی آواز آتی رہتی۔ اتنی لمبی لمبی
دوپہرس کاٹنے نہ کشتیں۔ چتا ہوا ماحول کسی طرح چین نہ لینے دیتا۔ اگر بڑے چچا
کی کتابیں نہ ہوتیں تو اتنی لمبی دوپہروں میں پٹنگ پر پڑ کر ادھر ادھر کی باتیں سوچتے
سوچتے دماغ خراب ہو جاتا۔ ادھر امتحان کے نتیجے کی فکر۔ اسے تو قیل ہونے کے
خیال ہی سے خوف آتا۔ اگر وہ ٹہل ہو گئی تو نجمہ پھوپھی کو اس کی دائمی جہالت پر
ذرا بھی شک نہ رہے گا۔ ویسے بھی وہ اس پر ابھکر بھیجی رہتیں۔ ”گھر بیٹھ کر
امتحان دینا بھی کس قدر آسان بنالیا ہے لوگوں نے۔ ہم جیسوں نے تو کالجوں اور
یونیورسٹیوں میں جگ ماری تھی۔ بس ایک پندرہ روپے مینے کا ماسٹر رکھ کر کام کی
باتیں رٹ لیں۔

ان ساری شاندار باتوں کے بعد بھی وہ ممی کو گھر میں پڑھائے چلی جاتی
تھیں اور کئی مینے مگزنے کے بعد بھی ممی کا دوسرا قاعدہ ختم نہ ہوا تھا۔

جیل بمیانے ان دنوں ایک معمولی سی ملازمت کر لی تھی۔ وہ سارے کے
سارے روپے بڑی چچی کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے اور گھر میں بس جینے کا سارا ہو گیا
تھا۔ جیل بمیا کا باقی وقت مسلم لیگ کی حمایت میں گزر جاتا۔ عالیہ تو اب ان کے
ساتے سے بھی بھاگتی مگر وہ سایہ تو لہا ہوتا جا رہا تھا۔ محبت کی دھوپ چڑھتی جا رہی
تھی۔

آج ابا کا خط آیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ وہ اسکے نتیجے کے منتظر ہیں۔ ابھی

اور بٹے گئے ہیں۔ کبھی کبھی اختلاج کی تکلیف ہو جاتی ہے جو شاید گرمی کی وجہ سے شروع ہوئی ہے۔ جیل کا ڈاکٹر دو دے رہا ہے جس سے قطعی فائدہ ہو گیا ہے۔

اماں اس خط کو سن کر ذرا دیر کے لئے فکر مند ہو گئی تھیں اور وہ تو اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے بڑی دیر تک روتی رہی تھی۔ وہ تو اپنے ابا کی بیماری کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی نہ کہ وہ حقیقتاً بیمار پڑ جائیں اور وہ بھی اس کی نظروں سے دور، جیل کی کوٹھری میں۔

جون کے آخری دن کس قدر گرم تھے۔ دوپہروں میں غضب کا سناٹا چھایا رہتا۔ سووے والوں تک کی آواز نہ سنائی دیتی مگر بھی پران دوپہروں میں پڑھنے کا بھوت سوار تھا۔ جیسے اس نے اپنے جی میں ٹھان لی کہ تو پڑھ لکھ کر فاضل بن گئے یا پھر جاہل رہ گئے۔ اتنی محنت کے بعد بھی اس کا دوسرا قاعدہ ختم ہونے کو نہ آ رہا تھا۔ لکھنے لکھنے اگلیاں بندھ جاتیں۔ سارا سبق ایک ہی سانس میں اگلے بغیر سنا، جی، پر نجمہ پھوپھی کے اعتراض ختم نہ ہوتے۔

اس وقت بھی پھوپھی کو جمابہوں پر جمابیاں آ رہی تھیں مگر وہ ذہیت بنی زور زور سے سبق یاد کرنے چلی جا رہی تھی۔ کسی کسی وقت ادھ بھرنے دروازوں سے عالیہ کی طرف بھی دیکھ لیتی۔

پڑھتے پڑھتے تھک کر پھوپھی نے کتاب میز پر رکھ دی۔ ”نجمہ پھوپھی، سارا قاعدہ تو یاد ہو گیا ہے، اب تیرا شروع کرادیں نا؟“

ابھی نہیں میں جس طرح پڑھاؤں اسی طرح پڑھ، یہ اردو نہیں کہ ہر جاہل پڑھ لیتا ہے، یہ انگریزی ہے۔ ”نجمہ پھوپھی ایک دم برہم ہو گئیں۔

”اب ہمیں نہیں پڑھنا، یہ قاعدہ کبھی نہ ختم ہوگا، ہونہ! بڑی آئیں پڑھانے والی۔ جیسے ہم بے وقوف ہیں، اپنے کام کے لئے نوکر رکھ لیجئے۔ نجمہ پھوپھی ہمیں تو اللہ میاں نے پیدا ہی جاہل کیا ہے۔“ پھوپھی نے کتاب، کاپی اور قلم اوپر اچھال دیئے۔

”اری کیا بکواس کرتی ہے پھوپھی، ہمیں جاہلوں کو سمجھنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ اگر پہلا دوسرا قاعدہ مکرر رو گیا تو پھر آگے پڑھنا مشکل ہو تا ہے۔ جلدی ہے۔

پڑھو، کل تمہارے لئے تیرا قاعدہ لے آؤں گی۔“ نجمہ پھوپھی گڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ بے دام کا غلام ہاتھوں سے لٹکا رہا تھا۔

”بس بھی اگر ہم قاتل ہو گئے تو آپ جاہل کسے کہیں گی۔“ پھوپھی پاؤں پٹختی نیچے چلی گئی۔

حد ہے پھوپھی، اس خاندان کی جہالت کبھی نہ جائے گی، کوئی بھی تو اس لائق نہیں کہ بات کر کے جی خوش ہو۔“ نجمہ پھوپھی اپنے آپ سے کہہ رہی تھیں۔

عالیہ نے اٹھ کر اپنے کمرے کے دروازے زور سے بند کر لئے۔ ”ارے نجمہ پھوپھی، میں آپ کو خوب جانتی ہوں۔“ وہ بیڑائی اور پھر کتاب لے کر لیٹ گئی۔

آج تو ایک دم آسمان پر بادل چھانے لگے تھے۔ کڑی سے ہوا کا ایک بیگ بیگ اٹھنا بھونکا آیا، تو وہ کتاب رکھ کر سو گئی۔ گرمیوں کی ساری دوپہرں جاگ کر اور تڑپ کر گزار دی تھیں۔ میاں تو چھتوں پر کپڑے اور چٹائیوں کا پتھا بھی نہ لگا تھا۔ پھر میاں کون سے نوکر لگے تھے جو ساری دوپہر پتھا کھینچتے۔

پھوپھی نے جب سے پڑھنا چھوڑا تھا اپنے اصل روپ میں آگئی تھی۔ گھر میں طوفان برپا رہتا۔ ہر ایک سے لڑتی یا پھر برقع اوڈھ کر محلے میں غائب رہتی۔ سب اس سے تالاں تھے مگر اماں کو تو اس کی صورت سے نفرت ہو گئی تھی۔ ”اللہ جانے شادی کا پیغام دینے والے کہاں مر گئے۔“

”پھوپھی میں تم کو پڑھایا کروں؟“ بہت دن بعد عالیہ اس کے کمرے میں گئی تھی۔ داری کی سوتی مسمری پر نظر پڑتے ہی اس کا جی دکھنے لگا تھا۔

”جیل صاحب آپ سے ناراض ہو جائیں گے پھر۔“ پھوپھی نے زور سے تہہ لگایا۔ ”خدا کے واسطے پھوپھی ایسی باتیں تو نہ کیا کرو۔“

”اچھا تو پھر مائیے، میں خود ان کا منہ نام لیتا پسند نہیں کرتی۔ منظور کے ماننے اب کوئی نہیں چٹا، اللہ قسم کتنا چاہتا ہے مجھے۔“ پھوپھی نے بوے مزے سے انہیں بند کر لیں۔

”معمی کوئی مرد کسی سے محبت نہیں کرتا“ اپنے آپ سے محبت کرو تا۔“
 ”واہ! اچھی پہن پڑھاتی ہیں، جمیل بھائیوں ہی آپ کے پیچھے دیوانے پھرتے
 ہیں یہی تو ایک محبت ہوتی ہے دنیا میں، جب تک چلے چلے، نہ چلے تو کھیل ختم پیرہ
 بھٹم“ لو اپنے آپ سے محبت کرو، کچھ دن بعد آپ کہیں گی کہ اپنے ابا اور ان تمام
 گھر والوں سے محبت کرو۔ یہ باپ بھائیوں وغیرہ کی محبت کچھ نہیں ہوتی، سب الو
 کے الو ہوتے ہیں“ کہنے۔“
 عالیہ معمی کو علاء علاج سمجھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کمرے میں انور کمال پاشا
 کی ایک تصویر اور اس سال کے کیلنڈر کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جانے کس نے دیئے تھے
 اسے۔

وہ چپکے سے اٹھ کر چلی آئی۔ معمی نے اسے بیٹھنے کو بھی نہ کہا۔ ابھی وہ
 صحن طے کر رہی تھی کہ نجرہ پھو پھو معمی کے کمرے میں جاتے ہوئے اس سے
 ٹکراتے ٹکراتے بچیں۔ سخت ہو کلائی ہوئی تھیں۔ ہے! اتنی پڑھی لکھی
 عورت کے کام سے ایک جاہل لڑکی نے ہاتھ اٹھایا۔ عالیہ کو ہنسی آ رہی تھی۔
 معمی نے فحاشی نہ منی۔ اور اب نجرہ پھو پھو خود ہی کاکھ کاکھ کر اپنی
 ساریوں پر استزی کرتیں۔ کونسل دکھاتے ہوئے آنکھوں میں آنسو آجاتے اور
 سینڈلوں پر پاش کرتے ہوئے قسمت کی ساری نکیریں سیاہ پڑ جاتیں۔
 ”تھیلے بھیا کو فکر ہی نہیں کہ کسی کے ساتھ اپنی اس بیٹی کے دو بول پڑھا
 دیں۔ کون سے ایم اے تلاش کرنے ہیں“ جیسے بڑے بھیا نے اپنی ساجدہ کی شادی
 کر دی۔“ نجرہ پھو پھو کا بس چلتا تو معمی کی ایسی جگہ شادی کرتیں کہ پانی تک
 نصیب نہ ہوتا، کسی کپڑا میں دھکیل دیتیں کم بخت کو تاکہ پاسی مر جاتی۔
 ”پتلے آپ کیجئے اپنی شادی نجرہ پھو پھو پڑھا پا رہا“ جواب میں معمی ان کا
 کلیجہ ٹونپنے کی کوشش کرتی۔

”ہونہ! مجھے کس بات کی کمی ہے۔ لوگ ناک رگڑیں گے، تجھے تو پندرہ
 روپے مینے کا پاسی بھی نہ جڑے گا۔“
 معمی انہیں جتانے کے لیے ہی ہنستی۔ ”پاسی مل گیا تو میں سب سے

پنے نجرہ پھو پھو کو پکڑا دوں گی۔“
 نجرہ پھو پھو ہنستا کر اپنے کمرے میں بھاگتیں، بھلا معمی جیسی جاہل کے منہ
 کون لگتا۔ گھر میں طوفان اٹھانے کے بعد معمی برقع اوڑھ کر کھلے میں گھروں گھروں
 گھومنے کے لیے نکل جاتی اور جب واپس آتی تو سخت جوش میں بھری ہوتی۔
 سارے قصے فر فر سنانے شروع کر دیتی۔ ”ہے وہ کلوی کی اماں کا لڑکا تھا، وہ
 مزدوروں کی جماعت میں چلا گیا، وہ جماعت انڈر گراؤڈ رہتی ہے۔ اللہ وہ زمین
 کے اندر کیسے رہتے ہوں گے؟“ معمی کو نجرہ پھو پھو سے سن کر اور پڑھ کر ابتدائی
 انگریزی کے چند مطلب تو معلوم ہو ہی گئے تھے جن کا وہ لفظ بہ لفظ ترجمہ کر لیتی۔
 ”ہے بے چاری بیوہ۔“ بڑی چچی فٹھڑی آہ بھرتیں۔ ”جیسی تو اس چٹا
 کی ماری نے بہت دنوں سے ادھر آتا بھی چھوڑ دیا، دیسے تو سال چھ مینے میں نکل
 ہی آتی تھی۔“

”اور بڑی چچی، وہ محمود کی ماں بچاری بلک بلک کر رو رہی تھی۔ محمود جنگ
 پڑ چلا گیا۔ کیا سو بھی حرام زادے کو کہ ماں کا خیال نہ کیا۔“
 ”ہے بے کیا حال ہو گا دیکھا؟“

”ہوں۔“ خبر سناتے سناتے جانے کیوں معمی کا موڈ خراب ہو جاتا۔
 میں نے کہا وہ آپ کا لاڈلا پوت جو رات دن آوارہ گھومتا رہتا ہے نا، اسے کیوں
 نہیں بھیج دیتیں جنگ پڑ، کمینہ کل جانے کس وقت میرے تھکے کے نیچے سے اسکی
 نال لے گیا۔ ہاتھ تو میں اس نکلیل کے خد اکرے۔“
 بڑی چچی ایسے صبر سے ہونٹ سی لیتیں کہ حیرت ہوتی۔ ایک وہی تو تھیں جو
 معمی کی ہر اچھی بری بات برداشت کر لیتیں۔ کبھی روڈھ کر نہ بیٹھیں۔ معمی جب
 ان سے جواب نہ پاتی تو منہ لپیٹ کر اپنے کمرے میں پڑ جاتی۔

تکلیف باہر چلا گیا۔ کریمین بوا بڑے چچا پر سے خیرات کرنے کے لئے دلیا میں سوا ہیر گیوں تول کر رکھ رہی تھیں۔

”وہ! بڑے چچا سے کس طرح ملا جائے گا۔ عالیہ سوچ رہی تھی اور مارے خوشی کے اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے میں آگئی اور کھڑکی میں بیٹھ کر کھلی میں جھانکنے لگی۔ وقت کتنی سستی سے گزر رہا تھا۔ ایک دن ابابھی اسی طرح آجائیں گے۔ اس نے سوچا اور غم کی ایک ٹیس اس کے کیلیجے کو چھلی کر مٹی — مگر ابھی تو پانچ سال باقی ہیں۔

سانے سے ایک سادھو بابا جنم پر بھسوت لے، سرخ لنگوٹ کے اور ہاتھ میں چٹا پکڑے آ رہے تھے۔ ”مٹھکا دے پچہ تیری سب مرادیں پوری ہوں۔“ سادھو بابا دردنازے پر کھڑے تھے۔

”معاف کرو بابا۔“ کریمین بوا نے باہر جھانک کر جلدی سے سر اندر کر لیا — ”یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کس کا گھر ہے، ننگ دھڑنگ سانے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں کیخنت“ — کریمین بوا نے زور سے کہا اور ہنسنے لگیں۔

”ارے کریمین بوا بڑے چچا کی خیرات تو کسی ہندو ہی کو دو“ — معمی نے فوراً مشورہ دیا اور پھر گانے لگی — ”اپنے کل میں گڑیاں کیبلیت تھی، سیاں نے پیچھے کمار رے۔“

”اللہ بھلا کرے۔“ دو سرا فقیر موٹے موٹے موتیوں کی مالا گلے میں ڈالے دردنازے پر آکھڑا ہوا —

کریمین بوا نے ہاتھ بڑھا کر ادھٹا پکڑا دیا — ”تھوڑی دیر بعد آ کر خیرات بھی لے جانا بابائی۔“ کریمین بوا نے کہا — جب سے جنگ چھڑی تھی فقیر کتنے بڑھتے جا رہے تھے۔

کچی گلی میں آگنے کے پیوں کی کھڑکھڑاہٹ ہو رہی تھی۔ بڑے چچا آ رہے تھے۔ سب سے آگے وہ ہار پنے بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ اسرار میاں اور پیچھے ان کے دو تین دوست تھے۔

”بڑے چچا آگئے ہیں“ — عالیہ نے چیخ کر سارے گھر کو اطلاع دی۔

آج گھر میں سخت دھوم مچی تھی۔ اسرار میاں نے تڑکے تڑکے چائے کا مطالبہ کر دیا تھا مگر آج کریمین بوا نے بھی ان کی اس سخت ناجائز حرکت پر معاف کر دیا تھا۔ آج زندگی میں شاید پہلی بار کریمین بوا نے انہیں سب سے پہلے چائے کی کشتی پکڑا دی تھی۔

آج صبح آٹھ بجے بچے اچھا الہ آباد جیل سے رہا ہو کر اسٹیشن پہنچ رہے تھے۔ بڑی چچی کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ وہ سوتے ہوئے جیل بھیا کو بار بار بھنجوڑ رہی تھی کہ وہ بھی باپ کے استقبال کے لئے اسٹیشن پر جائیں۔ مگر جیل بھیا نے ہر بار کوئی بہانہ تراش دیا — وہ رات بادلوں کی گرج کی وجہ سے سوئے نہیں — سر میں درد ہے — آج تو دفتر بھی نہیں جاسکتے — کچھ حرارت بھی ہو رہی ہے۔

اور جب اسٹیشن جانے کا وقت نکل گیا تو جیل بھیا بڑی تیزی سے اٹھے۔ چائے پی اور ٹافٹ کپڑے تبدیل کر کے دفتر بھاگ لئے۔

”تکلیف میرے بھیا، چار بار تو لا دو بڑے چچا کے لئے“ — عالیہ نے تکلیف کے ہاتھ پر دونی رکھ دی۔ وہ کچھ خوش نظر نہ آ رہا تھا۔ باپ سے کوئی واسطہ ہو نہ ہو پھر بھی پابندی تو محسوس ہوتی ہے۔

”ایک میں پچیس بار میرے لئے بھی لینے آتا کیسے سے مانگ کر تکلیف، پڑا تیر مار کر آ رہے ہیں بڑے چچا۔“ معمی کچی کھی ہنسنے لگی اور اپنے کمرے کی دالیز کے کنڈے میں پڑے ہوئے رسی کے جھولے پر جا بیٹھی اور لمبے لمبے پیٹک لینے لگی۔ یہ جھولا سادوں میں پڑا تھا تھے آج تک نہ اتار کیا تھا۔

”ہوا تلے ڈولا رکھ دے مسافر آئی سادوں کی ہمار رے“ — وہ سب کو پڑا کر گارہی تھی۔

بچا۔ اے انتقام لینا شروع کر دیا۔

عالیہ کا بی چاہا کہ اس وقت وہ بڑے بچا کو کیس چمپا دے، اس وقت تو کوئی ان سے کچھ نہ کہے۔ اس وقت تو کوئی پرانی باتیں نہ یاد دلائے۔ کتنی مدت بعد وہ اپنے گھر آئے ہیں۔ جیل سے انہیں توڑ دیا ہے، انہیں آرام کی ضرورت ہے۔
 ”ارے تم کیس ہو مہمی؟“ بڑے بچا نے مسکرا کر اس کے ہنر کو سدھ لیا اور مہمی جیسے جیلا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”ارے بڑے بھیا، اس مہمی چیل کے رشتے والے کہاں مر گئے، پورے چار مہینے ہو گئے انتظار کرتے کرتے۔“ اماں ان کے پاس بیٹھ کر پیالی پیرا چائے اٹھیلنے لگیں۔

ابھی چائے کی پیالی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ بیٹھک کے دروازے کی زنجیر کھڑکنے لگی۔

بڑے بچا باہر دوستوں میں چلے گئے اور عالیہ ان کے پاس بیٹھ کر ان سے ڈھری باتیں کرنے کو ترستی رہ گئی۔ وہ تو ان سے اس وقت بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی، ان کے اس کارنامے کو سراہنا چاہتی تھی۔ مگر میں سب ان کے لئے بے چین تھے مگر کسی نے بھی تو ان کا سواکت نہ کیا۔ جیل بھیا پیار ہو گئے۔ مہمی تیر چلا گئی اور بڑی بچی شکایتوں کا دفتر کھول کر بیٹھ گئیں۔ ہے بڑے بچا آپ کو کیا مل گیا ہے یہ سب کر کے، یہ جو آپ نے ملک کا جوگ سا دھ لیا ہے تو تاجپوں اور بربادیوں کے سوا کیا ہوا ہے اور — گھر والے تک عزت نہیں کرتے۔ کاش اس وقت تو سب خوش ہو کر انہیں سراہتے کاش —

نرین بوا گیوں کی ڈلیا اٹھا کر دروازے پر کھڑی ہو گئیں۔ مہمی جھولے سے اتر کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کلیل کہاں ہے اللہ، اب وہ بڑے بچا کو کیا پٹنائے گی — آج پہلی دفعہ اسے کلیل کی بے ایمانی پر غصہ آ رہا تھا۔

بڑے بچا نے اندر قدم رکھا تو سب سے پہلے نرین بوا نے گیوں کی ڈلیا ان کے ہاتھ سے چھوادی اور بھر دھائیں دینے لگیں۔ بڑے بچا نے سب کی طرف ایک قاتح کی نظروں سے دیکھا۔

”تم اب بی اے کی تیاری کر رہی ہو؟“ بڑے بچا نے پوچھا۔

”جی بڑے بچا — میں نے کلیل سے ہار مٹائے تھے، وہ اب تک نہیں آیا، میں بھی تو آپ کو ہار پٹائی۔“

”ہاں، جی کلیل نظر نہیں آ رہا، کیسا ہے وہ؟“ بڑے بچا نے جیسے رسا پوچھا۔ وہ چوکی پر بیٹھ کر جوتے اتار رہے تھے، نرین بوا نے تانے کے بڑے سے لونے میں منہ دھونے کے لئے پانی بھر کر رکھ دیا تھا۔ عالیہ انہیں چپکے چپکے دیکھ رہی تھی۔ بڑے بچا اسے کتنے کزور نظر آ رہے تھے۔ تو نہ گھٹ گئی تھی اور دائرہ میں آدھے سے زیادہ سفید بال نظر آ رہے تھے۔

”تمہارا بیٹا رات کو بارہ بارہ بجے آتا ہے یا پھر ساری رات غائب رہتا ہے،“ نہ پڑھتا ہے نہ لکھتا ہے، تم کو کیا؟ تم تو جیل جا کر سب بھول جاتے ہو۔ اور یہاں رہتے ہو تو بھی بیگانے لگتے ہو، اور تو اور تمہارا بڑا بیٹا بھی مسلم لیگ کے جلسوں میں شریک ہونے لگا ہے۔“ بڑی بچی نے ساری شکایتیں کر کے ہی سانس لی۔ بڑے بچا یا تو سخت شرمندہ نظر آ رہے تھے یا آخری بات پر ایک دم چونک پڑے۔ ”خوب خوب! صاحبزادے مسلم لیگ بن گئے؟“ بڑے بچا ایک ذرا دیر کو نکلیے سر کے نیچے رکھ کر لیت گئے۔ رات بھر کے سفر نے بڑا حال کر دیا تھا۔

”اب اپنے صاحبزادے کا کچھ بگاڑ لیجئے تو جانوں۔“ مہمی اپنے کمرے سے نکل کر وہیں دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ سلام کے بغیر ہی اس نے بڑے

مل جاتا تو تن کو کپڑا نہ جڑتا۔ جمیل بھیا کی چھوٹی سی تنخواہ اس گھر کے لئے دال میں نمک کے برابر تھی مگر بڑے چٹاک دکان کی آمدنی پھر بھی اس گھر میں نہ آتی، وہ سب باہری بار اڑ جاتی۔ بڑی چچی ہر وقت جمیل بھیا کی جان کھاتیں کہ کچھ اور کرو۔ مگر وہ بھی تو ملک آزاد کرانے لگے تھے۔ ٹھیکل نے قفل از وقت موغنیں نکال دی تھیں مگر درد سروس کے کورس کی کتابیں ساری رات اور کئی کئی دن ختم نہ ہوتیں۔ اسے تو سب عضو معطل سمجھ کر جیسے مہر کر بیٹھے تھے۔

کرکین ہوا جیسے سچ سچ آج اپنے کو جلانے پر تل چکی تھیں۔ وہ اور بھی چولے سے چٹ کر بیٹھ گئیں۔ عالیہ کو دشت ہونے لگی۔ ”کرکین ہوا“ ہٹ کر بنجو، جلانے کو ایک چنگاری بھی بت ہوتی ہے۔ ”عالیہ نے تخت کے پاس کھڑے کڑے کنڈالی پر ہاتھوں کا چھیر چھیدا۔“ ہائے کیسی سردی ہو رہی ہے۔ کم سخت سویر بھی تو اتنا پڑا ہوا گیا ہے کہ گرمی نام کو نہیں رہ گئی۔

ہاتھوں کو سینک کر ذرا جسم گرم ہوا تو وہ بھی بڑی چچی کے پاس ٹک گئی۔ مٹی سے ریوڑیوں والے کی ٹھنڈی ہوئی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ کمر کی رات کس قدر دیران معلوم ہو رہی تھی۔

”جاڑوں میں یہی“ اس تخت پر بیٹھے بیٹھے سب لوگ مٹھیاں بھر بھر کر ریوڑیاں کھایا کرتے تھے۔ اپنا تو منہ تھک جاتا تھا چائے چاتے“ اب تو جاڑے یوں ہی گزر جاتے ہیں مگر ایک ریوڑی نصیب نہیں ہوتی“ واہ رہ زمانے۔ ”کرکین ہوا نے کنڈالیاں چولے میں سرکا دیں۔ کرکین ہوا کو اب ہر وقت بولنے کا عارضہ ہو گیا تھا۔

بڑی چچی نے پھر ایک لمبی آہ بھری اور لالین کی بتی اونچی کر دی۔ ”ہائے کرکین ہوا“ اتنی سردی میں تمہاری آواز کیسے نکل رہی ہے؟“ عالیہ نے جھنجھلا کر کہا۔ چلی پہلی روشنی میں بڑی چچی کا چہرہ کیسا مردوں جیسا نظر آ رہا تھا۔ آخر اس کے پاس پیسے ہوتے تو وہ ابھی ابھی کرکین ہوا کو ریوڑیاں منگا کر کھلا دیتی، کڑے ہوئے وقت کو آواز دے دیتی۔ ایسی باتوں سے بڑی چچی کتنی نڈھال ہو جاتی تھیں۔

شام سے کر پڑنا شروع ہو گئی تھی۔ کرکین ہوا کھانا کھاتے ہوئے چولے کی لکھ میں سٹائی جا رہی تھیں۔ عالیہ کو ڈر لگنے لگا کہ کہیں انکے کپڑوں میں آگ نہ لگ جائے ذرا میں بھین کر راگھ ہو جائیں گی۔ ویسے بھی اب انہیں بھائی کم دیتا ہے۔ ”کرکین ہوا ذرا چولے سے سرک کر بیٹھو۔“ عالیہ نے بے چین ہو کر کہا۔

”ایک جان رہ گئی ہے وہ بھی جل جائے“ نصیب تو پہلی ہی جل چکے“ عالیہ بنیا اسی گھر میں جاڑوں کے دنوں میں اپنے ہاتھوں سے منوں لکڑی چھوٹ دیتے تھے۔ ارے یہ دالان جو آج ٹھنڈا پڑا ہے پہلے آگ کی طرح چٹا تھا، اب کوئی آگ بھی ہے چولے میں بنیا“ وہ تو کنڈالیاں لگی ہیں، بھلا اتنے میں کیا جلوں گی۔؟“ کچھ دنوں سے کرکین ہوا بڑی بھٹی بھٹی اور ہراساں نظر آنے لگی تھیں۔ جتنا زمانہ انہیں بہت شدت سے ستانے لگا تھا۔ اتنی تقریر کے بعد بھی وہ چپ نہ رہیں۔ آہستہ آہستہ بڑوانے لگیں۔ ”اللہ مارا سب کچھ جیلسوں کی بند ہو گیا“ سب کھا گئے موٹی تو تھوں والے“ لہو لہا کوئی پوچھے مگر چھوٹ کر بھی کسی کو آزادی ملی ہے“ اللہ ہر بات دے دے بڑے میاں کو۔“

بڑی چچی اور اماں تخت پر بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے مٹی کی کنڈالی میں انگارے رکھے ہوئے تھے، جن پر اب راگھ جم چلی تھی۔ وہ دونوں بار بار اپنے ہاتھوں کو سینک رہی تھیں۔

بڑی چچی نے ایک لمبی آہ بھری اور تخت کے ایک کونے پر رکھی ہوئی لالین کی بتی کو ذرا سا اونچا کر دیا۔ لالین میں شاید تلک کم تھا جو بتی بار بار بجتی ہو رہی تھی۔ ہر جہز سنبھال سنبھال کر کم سے کم خرچ کی جاتی۔ جنگ کو کئی سال ہو گئے تھے، مگانے نے اس گھر کو بالکل ہی لوٹ لیا تھا۔ سب پریشان رہتے۔ کھانے کو جیسے نیسے

عالیہ نے اپنی آہ میں سے گھونٹ لیا۔ اگر اس وقت جلدی سے کھانا مل جائے تو تھوڑی دیر بڑھ لے۔ سارا دن گزر گیا مگر کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کھری کھاٹ پر دھوپ میں لیٹ کر ادھمتے ہوئے دن گزر گیا۔

سب چپ بیٹھے تھے۔ عالیہ یوں ہی فکر کر دالان کی دیواریں اور چمت تک رہی تھی بجلی کا کنکشن کسے کتنا زمانہ گزر چکا تھا، مگر اس پر آمدے میں اب تک بریکٹ میں غور بلب لگا ہوا تھا جسے دھوئیں نے بالکل سیاہ کر دیا تھا۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس سیاہ بلب کو نکال چھینے، کرکین ہوا پتہ نہ لگائے دیتیں۔ خواہ خواہ پرانی نشانوں کو کیلیجے سے لگا کر رکھ چھوڑا ہے۔ عالیہ نے الجھ کر نظریں جھکا لیں۔

کرکین ہوا، کھانا پک گیا؟ آج تو بڑی سردی ہے۔ — ٹھنڈی ہینچک میں سردی سے سکتے ہوئے اسرار میاں نے دوسری بار آواز لگائی تھی۔

”ٹھہر جالائ صاحب۔“ کرکین ہوا نے دوسری بار جمل کر جواب دیا۔

”کیسا مریکا ہے؟ ذرا بھی مبر نہیں۔“

”توبہ کیسا مرتا ہے کھانے پر اندھا، کیسے کیسے لوگ پال رکھے ہیں بڑے بھیا نے بھی۔“

اماں یا تو اتنی دیر سے چپ چاپ بیٹھی ہاتھ سینک رہی تھیں یا ایک دم کلیجہ پھاڑ کر بولیں۔ عالیہ کی جان ہی تو جل چکی مگر اماں کو بھلا کیا کہتی۔ کوئی اتنا نہیں سوچتا کہ سردی کس غضب کی ہو رہی ہے۔ اسرار میاں بھی انسان ہیں پھر تو نہیں — عالیہ سوچتی چلی گئی۔ کیسے دکھ سے زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ تو جب سے آئی ہے اس نے یہی دیکھا کہ بڑے بچے کے پرانے کھدر کے کرتے اور پاجامے پہنے کوڑی کوڑی کے کام کرتے پھرتے ہیں۔ اسی طرح سردیاں اور گرمیاں گزر جاتی ہیں۔ کبھی ان کو ایک گرم کپڑا بھی نصیب نہیں ہوتا، کیا حال ہو گا غریب کا اس سردی میں —

”بس کھانا تیار ہے اسرار میاں!“ عالیہ نے کمزور سی آواز میں کہا اور گھبرا کر اماں کا منہ دیکھنے لگی۔

”تم سے کس نے کہا تھا کہ اسے جواب دو، کیا تمہاری بھی شرم اڑ گئی؟“ اماں نے فوراً ڈانٹ پلائی۔

عالیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اماں کا دل نہ دکھانا چاہتی تھی۔ رسی جمل جائے مگر مل نہیں جاتے، پرانی شان جھیلنے والی ایک وہی تو رہ گئی تھیں۔

”کیا ہو گیا دلہن جو اس نے جواب دے دیا۔ آخر اسرار بھی تو تمہارے خسر کی اولاد ہے۔“ بڑی چچی اپنی طرف سے مذاق کر کے ہنسنے لگیں۔

”ہے تو مگر اپنی اوقات بھی تو پچھانے رہے۔“ اماں نے منہ بتایا اور پھر انہیں ممی کی شادی کا خیال ستانے لگا۔ بڑی بھالی جب پیغام آگیا ہے تو شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دیتے، دیکھتے یہ وقت ہو گیا مکھلے میں گئے، اب تک نہیں آئی۔“

”آکھوں نہیں ممی، اپنے کمرے میں ہے۔“ عالیہ نے جلدی سے کہا۔

”مگر اس کے باپ نے جو پانچ سو شادی کے لئے بیجے ہیں، اس میں سب کام کیسے ہو گا؟“ اب اماں کو دوسری فکر ستانے لگی۔

”بس کچھ ہو ہی جائے گا۔“ بڑی چچی نے سر جھکا لیا۔

”بس جیسے کینوں کے ہاں شادی ہوتی ہے۔“ اماں نے کہا۔

”پھر ہزاروں کہاں سے آئیں گے؟“ عالیہ سے آج اماں کی باتیں برداشت نہ ہو رہی تھیں۔

”پانچ پانچ سو کی تو آتش بازی پھوڑی جاتی تھی، اپنے گھروں کی شادیوں میں ان آنکھوں نے سب دیکھا ہے۔“ کرکین ہوا تیزی سے روٹیاں پکڑ رہی تھیں۔

پردہ سر کا کر ممی اندر آگئی اور کرکین ہوا کے پاس چولے کے سامنے بیٹھ گئی تو شادی کی بات وہیں ختم ہو گئی۔ سب چپ ہو گئے۔ ممی سے تو سب چپا رہے تھے۔ کسی نے اسے خبر نہ کی تھی کہ شادی کی بات کچی ہو چکی ہے۔ جینز کے لئے اس کے باپ نے روپے بیچ دیئے ہیں اور وہ ایک دن ڈولے میں سوار ہو کر چلی جائے گی۔ سب اس سے ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی طوفان نہ کھڑا کر دے، بھلا اس کا کیا اعتبار۔ سب چپ تھے۔ دالان میں پڑے ہوئے ٹاٹ کے پردوں میں کتنے

بڑے بڑے سوراخ ہو گئے تھے۔ دھوپ اور بارشوں نے ان کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اور اب تو ان سوراخوں سے اتنی ہوا اندر آ رہی تھی جیسے کھلی کھڑکی کے سامنے بیٹھ گئے ہوں۔ عالیہ خاموشی سے آکا کرناؤں کے سوراخ گھنٹے لگی۔

”اتنی سخت سردی میں بڑے بھیا کاپور چلے گئے، انگریزی لباس سے بھی تو نفرت کرتے ہیں، شیروانی سے کوئی سردی جاتی ہے، ہر طرف سے بھر بھر ہوا لگتی ہے۔ ایک کوٹ پہن لیں تو کیا ہرج ہو گا بھلا۔ بس اللہ ہی رحم کرے۔“ اماں نے پھر باتیں چھیڑ دیں۔ اس خاندان میں جانے یہ حرکتیں کہاں سے کھس آئیں۔

”بس ان کی یہی زندگی ہے، اللہ اسی میں بھلا کرے گا، خدا انہیں سردی سے محفوظ رکھے، انگریزی لباس تو انہوں نے کبھی پہنا نہیں، بیشہ سے نفرت کی، پھر جب سے گرم شیروانی پہنی دوسری پہننے کی قوت نہ آئی، پرانی شیروانی سے کیا سردی جاتی ہو گی۔“ بڑی چچی نے کہا اور کونکوں پر بھی ہوئی راکھ نکلے سے کریدنے لگیں۔

عالیہ نے اپنا سر بازوؤں میں چمپا کر آنکھیں موند لیں۔ اندھیرے میں لال پیلے دھبے تاپنے کو دے لگے اور پھر اس کے سامنے لوہے کی سلاخیں ابھرنے لگیں اور ان سلاخوں کے پیچھے اس کے ابا کا چہرہ چمک رہا تھا۔ ”ابا وہاں کتنی سردی ہو گی۔ وہاں تو کونسلے دھکا کر کوئی کرہ بھی نہ گرم کرتا ہو گا، اور وہ گرم کپڑے بھی تو اب پرانے ہو چکے ہوں گے۔ رات کس طرح گزرتی ہو گی۔“ اس نے گہرا کر آنکھیں کھول دیں یہ دل کو کون چٹکیوں سے مسل رہا تھا۔

”کریمین ہوا روٹی تو پختی رہے گی، آج مجھے سب سے پہلے کھانے کو دے دو“ مجھے پڑھتا ہے۔ ”عالیہ نے کہا۔

”میں صدمہ تم گرم گرم روٹی کھاؤ، تمہارے ساتھ تنہی بیٹا بھی کھالیں گی۔“

”مجھے کون سا پڑھنا ہے جو گرم گرم روٹیاں توڑنے بیٹھ جاؤں۔“ ”بھئی نے تیریاں چڑھا کر کہا اور بازوؤں میں منہ چمپا کر چولے کے اور آگے سرک گئی۔

عالیہ بڑی بے دلی سے کھانا کھا رہی تھی۔ اس وقت مہربس خاموش بیٹھے تھے۔ اتنے لوگوں کے بیچ میں بھی زندگی کے آثار ڈھونڈنے نہ ملے۔ بڑے بچا ہوتے تو دس گیارہ بیچ رات تک بیٹھک ہی آباد رہتی۔ اس نے سوچا۔ اور جانے آج جمیل بھیا کہاں چلے گئے۔ وہ کس کارروائیوں میں مصروف ہیں اور کلکلی اللہ ہی جانے کہاں آوارہ گھوم رہا ہو گا۔

”کریمین ہوا اب تو اسرار میاں کو بھی کھانا بھجوا ہی دو۔“ عالیہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مگر کریمین ہوا تو ایسے موقعوں پر بیشہ گوئی بسر ہی جایا کرتیں۔ ”بھجوا دیا جائے گا، اب کوئی کریمین ہوا دس ہاتھ کر لیں۔“ اماں نے تنہی سے جواب دیا۔

”ہاں دیکھ لیجئے چھوٹی دلن۔“ کریمین ہوا جلدی سے بولیں۔ ”وہ بھی کیا زمانہ تھا کہ۔“

عالیہ جلدی سے پردہ سرکا کر باہر نکل آئی۔ کتنا اندھیرا تھا۔ ذرا سے فاصلے کی چیز دکھائی نہ دیتی۔ وہ صحن میں پڑی ہوئی لوہے کی کرسی سے ٹکرا گئی۔ بھئی کے کمرے سے نکلی ہوئی ہلکی سے پیلی روشنی کمری دیوار کے اس پار رہ گئی تھی۔ صحن پار کر کے وہ جلدی جلدی میڑھیاں طے کر گئی۔ کریمین ہوا کے دس ہاتھوں کے خیال نے اسے بڑی طرح جھینلا دیا تھا۔

نجر پھو بھی کا کرہ طے کرتے ہوئے اس نے نیچی نیچی نظروں سے دیکھا کہ نجر پھو بھی آرام کرسی پر لیٹی اپنے سے دگنی موٹی کتاب میں غرق ہیں اور ان کے بیروں پر ریٹھی لپکا لگی دو لائی بڑی غلاست سے پڑی ہوئی ہے۔ نجر پھو بھی نے سب معمول نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اب بھلا وہ اس راتے کو کیسے چھوڑ دے۔ وہ ہوا میں اڑ کر تو اپنے کمرے میں جانے سے رہی۔

اپنے ننھے سے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے گلے میں کھلنے والی کھڑکی لے پٹ کھول دیے۔ بجلی کی تیز روشنی میں اس نے اپنا بسز تھیک کیا اور پھر خلاف میں دیک کر لیٹ گئی اور جب ذرا ہاتھ گرم ہو گئے تو پتلی کی الماری سے نکالی ہوئی کتاب اٹھا کر پڑھنے لگی۔

اس نے پھر کتاب اٹھالی۔ چنگیز خاں کے مظالم پڑھ پڑھ کر مارے وحشت کے دل کا نچا جاتا۔

کتاب رکھ کر اس نے لحاف میں منہ چھپا لیا۔ اس اشرف المخلوق نے کیسے کیسے ظلم سے تاریخ مرتب کی ہے۔ اس وقت وہ سراسر مفکر بنی ہوئی تھی۔ اقدار کی ہنگ کبھی نہیں بھگتی۔ لاکھ تہذیب جنم لیتی رہے کچھ نہیں بننا۔ اقدار سب کچھ جلا کر بھسم کر دیتا ہے۔ اس کے باوجود دعویٰ ہے کہ اب ہم مذہب ہو چکے ہیں۔ سروں کے مینار بنانا اور انسانوں کو پنجروں میں بند کرنا تو صدیوں پرانی وحشت کے دور کی یادگاریں ہیں، مگر آج وہ جنگ ہو رہی ہے، ایک سے ایک بڑھایا ہم لو، جس سے سب سے زیادہ بے گناہ مرے وہ سب سے ترقی یافتہ بھتیاز۔ پھر جلد نوالے باغ کا قصہ کون سا صدی پرانا واقعہ ہے۔ اسی مذہب دور نے تو اس واقعہ کو جنم دیا تھا۔ اور اسے ایک دم کسم پیدی یاد آگئیں۔ اندھیرے میں ان کی لاش آنکھوں کے سامنے تیرنے لگی۔ بستی ساری سے قطرہ قطرہ پھٹتا ہوا پانی اس کے دل پر گر رہا تھا۔

کسی نے ہوئے اسے اس کا لحاف سر کا یا تو وہ بوکھلا کر اٹھ گئی۔ ”ارے تم تو
 ڈر گئیں۔“ جیل بیا اس کے سرہانے کھڑے تھے۔
 ”ہاں میں تو جج جج ڈر گئی۔ ابھی ڈرا دیر پہلے میں چنگیز خاں کے مظالم پڑھ
 رہی تھی۔“

”اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم مجھی کو چنگیز سمجھ رہی ہو، بھلا مجھ میں اتنی ہمت کہاں۔“ جمیل بھیا نہیں۔

”تمہیں کیسے کہہ سکتی ہوں، تم تو مہذب ہو اور پھر شاعر — اسرار میاں
لو کھانا مل گیا؟“

کھڑکی کھلنے کی وجہ سے سردی کتنی زیادہ ہو گئی تھی مگر کھڑکی بند کرنے سے تو اندھیرے میں غوطے لگانے پڑتے۔ لائینن کی پیاسی اور پیاری روشنی سے اس کو کتنی الجھن ہوتی۔ ویسے ایک زمانہ وہ بھی تھا جب لائینن ہی کی پیاسی روشنی میں زندگی کا ایک حصہ گزر گیا تھا۔ برسات کے دنوں میں جب لائینن کے گرد بیٹھے جمع ہو جاتے تو اسے کتنا مزہ آتا۔ لو اب ایک بیٹھے نے پیشیے سے سر کلرایا اور اونہا ہو گیا، اب دوسرا اور اب تیسرا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے گنتے گنتے سو جاتی، مگر اب تو خیرات میں ملی ہوئی بھلی کی روشنی کے بغیر اس سے ایک منٹ کو نہ چڑھا جاتا۔

ابھی تو رات کا ابتدائی حصہ گزرا تھا مگر کھلی میں کیسا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اسکول کی عمارت اور اس کے آس پاس کے گھنے درخت کمری چاروں میں ڈھکے ہوئے تھے۔ نیچے کی منزل سے اب زرد زور سے باتوں کی آواز آرہی تھی اور ان آوازوں سے اسرار میاں کی نینت سی آواز اچھ رہی تھی۔ ”؟“ کریمن ہوا کھانا پک گیا ہو تو دے دو۔“

”کھالینا اسرارِ مایاں“ دیر سے کھاؤ گے تو خوب بھوک لگے گی۔ اس مہنگائی کے زمانے میں اگر تمہاری بھوک نہ کھلی تو ہم سب کیا کریں گے۔“ — بھیجی اپنی مخصوص اداسہ کہہ رہی تھی اور پھر اس کی ہنسی کی آواز عالیہ کے کانوں کے پار ہو گئی۔

عالیہ نے کتاب سینے پر رکھی۔ رزم کی ایک ٹیس اس کے پیچھے کو پار کر مچی۔
 — ارے ان بچارے کا کیا قصور ہے، یہ سب لوگ ان کے لئے ہتھکڑیاں بن گئے
 ہیں۔ آخر یہ آپ ہی آپ تو دنیا میں نہیں آگئے جو اب سب لوگ ان کے پیچھے
 بن گئے۔ وہ کسی کے ماموں نہیں، کسی کے چچا نہیں، کسی کے بھائی نہیں، کسی کے
 باپ نہیں، — باپ، بھلا کسی کو کیا پڑی ہے کہ اس سلسلے میں سوچے۔ یہ کس کے
 باپ بنیں گے، جبکہ ان کا کوئی باپ نہیں۔

اس کا کیسا جی چاہا کہ بس اس وقت دوڑ کر نیچے چلی جائے۔ اپنے ہاتھوں سے کشتی سجائے اور پھر اسرار میاں کے سامنے رکھ دے اور جب تک وہ کھاتے

”میں کریکین ہوا کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔“ جمیل بیبا نے بڑے پککے پن سے کہا۔ ”اس وقت تو میں تم سے باتیں کرنے آیا ہوں اور۔“

جمیل بیبا اس وقت بحث وغیرہ کے موڈ میں نہ تھے۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ وہ پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں اور کیا کرنا چاہتے ہیں اور اب جبکہ رات سو رہی ہے، اس سردی میں سب اپنے بستروں میں دیکے پڑے ہیں تو وہ اس کے کمرے میں کیوں آئے ہیں۔ پھر اسے خیال آیا کہ نجمہ پھو بھی کچھ سوچنے نہ لگیں۔ اس نے کھڑکی کے دونوں ہٹ کھول دیئے۔

جمیل بیبا کرسی سرکار اس کے بنگ کی پٹی کے پاس بیٹھ گئے اور اسے بڑی گہری گہری نظروں سے گھورنے لگے۔ وہ جمیل بیبا کو ٹالنے کے لئے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں، شاعر نے شاید ایسی ہی آنکھوں کو جنت کے نام سے یاد کیا ہے۔“

”شکریہ بیبا جمیل۔“ وہ زور سے ہنسی۔ ”یہ اصلی جنت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے شہاد کی جنت ہو۔“

”عالیہ بیگم، سروں کے مینار بنانا اتنا برا ظلم نہیں بتانا کسی کے جذبات کا مذاق اڑانا۔“

”کیا یہ بھی شاعری کا کوئی باریک نکتہ ہے، خیر چلو معاف کر دو، جذبات کا مذاق اڑانے کے بجائے اب سروں کے مینار بنانا لیا کروں گی۔“ تو اس نے اپنے ہاتھ گلاف میں چھپا لئے۔ ”جمیل بیبا اگر اس بار میں پاس ہو گئی تو مزہ آ جائے گا، نجمہ پھو بھی کی قابلیت کو ضرور تھوڑی بہت نہیں لگے گی۔“ وہ تو گفتگو کا موضوع بدل رہی تھی مگر جمیل بیبا نے ذرا بھی دلچسپی نہ لی۔ سر ہٹائے خاموش بیٹھے رہے۔ کھلی کھڑکی سے ہوا کے تکتے سرد جھونکے اندر آ رہے تھے، مگر وہ کھڑکی بند بھی تو نہ کر سکتی تھی۔ اندھیرا جذبات سے ساری روشنی چھین لیتا ہے۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتیں۔ تم مجھے ہالتی ہو عالیہ، کیا تم میری محبت کا احترام بھی نہیں کر سکتیں؟“

”بیبا آپ کسی باتیں کرتے ہیں، میں۔ میں۔“ وہ جمیل کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بوکھلا گئی۔ اس سے بات نہ کرتے بن پڑی۔

”عالیہ!“ جمیل بیبا نے اسے ایک جھٹکے سے اٹھایا اور عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ کمزریوں کے دونوں ہٹ بند ہو گئے ہیں اور اس کے ہونٹوں پر انگارے رکھے ہوئے ہیں۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہو گیا کہ وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ کچھ سوچ بھی نہ سکی، اور جب جمیل بیبا کو اپنے آپ سے بھٹکتا چاہا تو وہ اس کے بازو پر سر رکھے بچوں کی طرح سبک رہے تھے اور ان کا ایک ایک آنسو کھوتی ہوئی بوند کی طرح اس کے دل پر گرتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے بوندوں کے گرے کی آواز تک محسوس ہو رہی تھی۔ ان بوندوں کی روشنی سارے کمرے میں پھیل گئی تھی۔ اسے ایک صاف ستھرا راستہ نظر آ رہا تھا، جس پر دوڑنے کے لئے جیسے اس کے پاؤں لٹے ہوئے تھے۔

وہ بے سدھ سی بیٹھی تھی اور جمیل بیبا اب سراٹھا کر اس کی طرف دیکھنے ہوئے بڑے بیٹھے پن سے مسکرا رہے تھے۔ کتنا غرور کتنا سکون تھا اس مسکراہٹ میں۔

”بس اب آپ تشریف لے جائیں جمیل صاحب۔“ عالیہ نے ڈانٹوں کی طرح ان کی طرف دیکھا۔ کسی اور کو الو ہائیے گا، میرا نام ہے عالیہ، چلے جائیے ورنہ اتنی زور سے چیخوں گی کہ پاؤں۔“

جمیل بیبا دیوار سے ٹک لگائے کھڑے اسے تک تک دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظریں پیچ رہی تھیں، ”تم کسی سے محبت نہیں کر سکتیں، عالیہ بیگم، تم سچ بچ ڈائن۔“

اور جب جمیل بیبا کھڑے کھڑے ایک دم چلے گئے تو عالیہ نے کمزریوں کے ہٹ بھڑ دیئے اور سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ ”جمیل میرے جسم میں جو تم باد کی سوئیاں چھو گئے ہو اسے اب کون سا شہزادہ آکر نکالے گا۔“

روتے روتے جب اس کا پی بکا پڑ گیا تو وہ اپنی بے وقوفی پر ہنسنے لگی۔

جہ ہے یعنی — کیا وہ آپا اور کسم دیدی سے کچھ کم ہے — ہونہ! پتہ نہیں وہ کیسے پاگل ہو گئی تھی۔

وہ اپنے کورس کی کتاب اٹھا کر بڑے سکون سے پڑھنے لگی۔ اور پھر نہ جانے کس وقت کتاب اس کے ہاتھ سے پھٹ کر سینے پر گر پڑی تو کچی نیند میں وہ چونک پڑی۔

ارے! یہ ممی اتنی ٹھنڈ میں تھکے پاؤں کیوں چپ چاپ کھڑی ہے — عالیہ نے کتاب میز پر رکھ دی۔

”تو کیا آپ اب تک جاگ رہی ہیں بھیا؟“ کھڑکی کی طرف بڑھتے بڑھتے وہ ایک دم ٹھٹھک کر رہ گئی۔

”مگر تم کیا کرتی پھر رہی ہو اس سرور میں؟ ادھر لحاف میں آ جاؤ ممی۔“
”وہ منظور نے کہا تھا کہ رات بارہ بجے کھلی میں کھبے کے نیچے کھڑا ہوں گا تم کھڑکی میں آ کر کھڑی ہونا۔ خیر آپ سو جائیے، خواہ خواہ نیند خراب کی میں نے —“ وہ کمرے کا دروازہ کھول کر جلدی سے چلی گئی۔

”اے ممی —“ عالیہ نے آواز دی مگر وہ تو میڑھیاں طے کر کے اپنے کمرے میں جا چکی ہو گئی۔

عالیہ نے کھڑکی کے پٹ کھول کر نیچے کھلی میں جھانکا، کمر پھٹ گئی تھی۔ چاند کی لمبائی روشنی کھلی میں لوٹ رہی تھی، وہاں اور کچھ بھی نہ تھا۔

جنگ جاری تھی۔ مہنگائی نے گھر میں جھاڑو پھیر دی تھی۔ جمیل بھیا کی توڑی سی آمدنی صحیح معنوں میں کسی کا بھی پیٹ نہ بھر سکتی تھی۔ گھر میں سب کتنے نود غرض ہو رہے تھے، اماں کی پیشانی پر ہر وقت شکایتی ٹکٹیں پڑی رہتیں۔ بڑے بچا کی صورت سے انہیں نفرت ہو گئی تھی۔ انہیں شدت سے احساس تھا کہ اگر دکان کے روپے گھر میں آنے لگیں تو یہ حالت ذرا کے ذرا میں بدل جائے۔ ذرا ڈھنگ کی روٹی تو نصیب ہو۔ دھمکی کے طور پر وہ ہر وقت اپنے بھائی کے گھر جانے کی ضد کیا کرتیں اور بڑی جچی اس خیال سے ہی لرزا فحش کہ اس طرح تو گھر کی بدنامی ہوگی۔ سب یہی کہیں گے کہ پیٹ بھر روٹی بھی نہ کھاسکے۔ ادھر ممی کی یہ حالت تھی کہ ہر وقت لڑنے بھڑنے پر آمادہ رہتی۔ چھینکے پر رکھا ہوا کلیل کا کھانا اتار کر چپکے سے کھا جاتی اور جب بدلے میں وہ کوکاس کرتا تو مزے سے ہنسی یا بھر مارنے پر تل جاتی۔ نجر پھوپھی یہ ہنگامے دیکھ کر خفارت سے منہ پھیر لیتیں —

”جہات میں یہی سب کچھ ہوتا ہے، اگر سب کے پاس تعلیم ہوتی تو آج یوں بھوکے مرتے؟“ وہ بڑے غرور سے کہتیں اور پھر اپنی تعلیم کے آفاق پر بیٹھ کر بڑے فخر سے مسکراتے لگتیں۔ جمیل بھیا یہ سب کچھ دیکھتے، سننے اور ان سب کے بچ میں بڑے بے بس اور خاموش نظر آتے مگر وقت کی اس خرابی کے باوجود کربن بوا ذرا بھی نہ بدلی تھیں۔ جنگ کی وجہ سے فقیروں کے گلے پیدا ہو گئے تھے۔ کربن بوا پچھلے زمانے کی دی ہوئی منوں خیراتوں کو یاد کر کے کڑھا کرتیں اور اسرار میاں کی روٹیوں کے ٹکڑے نوالے کاٹ کاٹ کر فقیروں کو خیرات دے دی دیا کرتیں۔

اس عجیب و غریب خیرات پر عالیہ کا بھی ملنے لگتا — آخر یہ اسرار میاں اپنے دیانت وار کیوں ہیں! کیا وہ دکان سے ایک آدھ روپیہ اڑا کر عیش نہیں

کرسکتے؟ اس اثر اور شرافت کا چلہ کات کر انہیں کیا مل جائے گا؟ اس طرح وہ دادا کی جائز اولاد تو کھلانے سے رہے۔ کچھ بھی کرتے رہیں پھر بھی دادا کی داشتہ کی اولاد ہی کھلائیں گے۔ انہیں کوئی باپ کے نام سے یاد نہ کرے گا یہ دنیا ان کے لئے میدان قیامت ہی رہے گی۔

گھر کی ایسی بری حالت دیکھ کر بھی بڑے چچا کا دل نہ بیچتا تھا۔ مقاصد کے تہیوں نے انہیں اس بری طرح گھاس کر رکھا تھا کہ سارے دکھ درد چھتے — ”جنگ نے آزادی کو بہت قریب کر دیا ہے“ — وہ سب کی طرف دیکھ کر کہتے مگر کوئی بھی تو انہیں جواب نہ دیتا۔ وہ شرمندہ ہو کر سر جھکا لیتے، بھروسوں کی طرح الٹے سیدھے نوالے توڑتے اور بیٹھک کی راہ لیتے۔

سردیوں میں اب وہ شدت نہ رہ گئی تھی۔ عالیہ رات گئے تک گلی کی کھڑکی کھلی رکھتی اور گلی کی روشنی سے پڑھ پڑھ کر امتحان کی تیاری کرتی رہتی۔ ان دنوں اس نے سوچ بچار سے ہاتھ اٹھالیا تھا۔ اب کے خط اس کی امت بڑھاتے رہتے۔

دھوپ ڈھل چکی تھی۔ ساری دوپہر بڑھنے کے بعد بھی چھت سے نہ سر کی ہٹ سائے کی وجہ سے اب اسے سردی لگ رہی تھی۔

پڑھتے پڑھتے اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ممی اس کے پاس کھڑی تھی۔ رات سے وہ چپ چپ تھی اور صبح سے کئی بار عالیہ کے پاس سے گزری تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کچھ کتنا چاہتی ہے مگر جب بھی عالیہ اس کی طرف دیکھتی تو چلی جاتی۔

”کیا بات ہے ممی؟“

”کچھ بھی نہیں بچا، بس یوں ہی جی چاہا کہ آپ کے پاس بیٹھوں“ وہ عالیہ کے پاس کرسی پر ٹک گئی۔

ممی نے آج کتنی مدت بعد اسے پیار سے بچیا کہا تھا۔ وہ اسے بڑی پیار لگ رہی تھی۔ کوئی کوئی سی بیٹھی اسے تک رہی تھی۔

”کچھ تو ضرور ہے ممی ورنہ تم ایسی کیوں نظر آ رہی ہو؟“ عالیہ نے اسے

اپنے قریب سر کایا تو ممی اس کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی — ”وہ منظر بھی جنگ میں بھرتی ہو گیا بچیا، ایک سارا تھا سو وہ بھی گیا۔“ ممی نے روتے روتے کہا۔

”ہونہ! اگر اسے تم سے محبت ہوتی تو پھر جنگ پر کیوں جاتا بھلی اور اب تم اسے یاد کر کے رو رہی ہو، یہ وقوف نہ کرو ممی۔“ عالیہ نے اسے لپٹا لیا۔

”بس دیسے ہی رونا آ گیا کوئی مجھے اس سے محبت توڑی تھی۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا، اس لئے مجھے بھی اچھا لگنے لگا تھا، چلو کوئی مجھ سے محبت تو کرتا تھا۔“ ممی نے بے بسی سے ہنسنے ہوئے آنسو پونچھ لئے۔

عالیہ سے کچھ کہنے نہ بن پڑی۔ بھلا وہ کتنی بھی کیا۔ ”میں جو تم سے محبت کرتی ہوں ممی؟“

”آپ، آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں بچیا؟“ وہ زور سے ہنسی۔ کتنی تفحیک تھی اس کی بے تماشہ ہنسی میں۔ عالیہ اسے کیسے یقین دلا کتنی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ وہ اس سے ہمدردی رکھتی ہے۔ وہ ممی کی ہنسی سے ہلکا کر اس کا منہ تک رہی تھی۔

”یہ دیکھئے بچیا میرے پاجامے کی گوت بری طرح پھٹ گئی ہے۔ میں نیچے جا کر اسے سی لوں تو پھر آؤں گی۔“

ممی بھدر بھدر کرتی چلی گئی اور عالیہ کتاب گود میں رکھے بے وقوفوں کی طرح بیٹھی رہ گئی۔ یعنی اس نے ایسی بے کار بات کی تھی کہ ممی کو پاجامے کی گوت سینا یاد آگئی۔ ممی اس کی محبت پر اعتبار نہیں کرتی۔ دنیا نے اس کے اعتبار کا جنازہ نکال دیا ہے — عالیہ رنجیدہ ہو رہی تھی۔

چھت کی منڈیر پر بیٹھا ہوا کوا کائیں کائیں کرتا ہوا اڑ گیا۔ دھوپ چھت کی منڈیروں پر چڑھتے چڑھتے غائب ہو گئی تھی۔ اب اچھی خاصی سردی ہو رہی تھی۔ کتابیں سمیٹ کر وہ اپنے کمرے میں رکھ آئی۔ ممی کے جانے کے بعد وہ ایک لفظ بھی تو نہ پڑھ سکی تھی۔ توڑی دیر تک وہ آنکھیں بند کر کے اپنے بستر پر پڑی رہی اور پھر نیچے چلی گئی۔ کیاری میں گیندے اور گل عباس کے پھول ہمار کا پتہ دے

رہے تھے۔ عالیہ نے ایک پھول توڑ کر اپنے بالوں میں لگا یا مگر جب اس نے دیکھا کہ جمیل بیبا دالان کی محراب کے پاس کھڑے اسے بڑے اشتیاق سے دیکھ رہے ہیں تو اس نے بوکھلا کر پھول کیاری میں اچھال دیا۔ جانے کیسے اس کو احساس ہوا کہ سنگھار مرد سے محبت کرنے کی چٹلی کھاتا ہے۔

پھول پیچک کر اس نے دیکھا کہ جمیل بیبا کی آنکھیں جیسے کلامنی ہیں۔ وہ لوہے کی کرسی پر سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

اماں تخت پر بیٹھی جمیلہ کاٹ رہی تھیں اور بڑی چچی پننے کی دال جن رہی تھیں۔ ان کا دکھوں میں گمراہ ہوا چہرہ کس قدر کھنڈر ہو رہا تھا۔ سارے دکھ سارے درد ان کے چہرے کی رعنائی کو توڑ پھوڑ کر اب بھی اپنا چہرہ نہ چھوڑ رہے تھے۔ اور مردوں سے وہ ایک نئے دکھ میں مبتلا تھیں۔ دونوں ہو گئے مگر کلیل گھر نہیں آیا۔ جمیل بیبا نے اسے تلاش بھی کیا لیکن کوئی پتہ نہ چلا۔ جانے وہ کتابوں کی تلاش میں کتنی دور چلا گیا تھا۔

”شامیں بیشہ اداس ہوتی ہیں۔“ جمیل بیبا نے عالیہ کی طرف دیکھا۔
”سب شاعری ہے“ مجھے تو کوئی اداسی نہیں لگتی۔“ عالیہ ہنسی اور اماں کے پاس تخت پر بیٹھ کر پادشاہ کی کلبیاں صاف کرنے لگی۔

”میرے سامنے اتنی خوب صورت اور اتنی مکمل غزل ہے کہ اب اپنا سارا کلام بے معنی معلوم ہوتا ہے“ اس لئے شاعری داعری چھوڑ دی ہے“ تم نے فیض اور ندیم کو پڑھا ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

عالیہ خاموش رہی۔ وہ بھلا خود کو غزل کیسے سمجھ لیتی۔ یہ جمیل بیبا بھی خوب ہیں، ہر بات میں اپنا مطلب تلاش کر لیتے ہیں۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔

”تمہارے چچا کی لائبریری میں فیض اور ندیم کا کماں گزر ہو سکتا ہے۔“ وہ ہنسے ”سناء گاندھی پر اور کوئی کتاب چھپی کہ نہیں؟“ جمیل بیبا شاید پھول پیچکنے کا انتقام لے رہے تھے۔

وہ بڑے انہماک سے پاندان صاف کرتی رہی۔ اس نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ جیسے اس معلوم ہی نہیں کہ اس سے کوئی مخاطب بھی ہے۔ جمیل بیبا کے

لئے اس نے کچھ بھی نہ سوچا تھا پھر بھی جانے کیوں وہ ان سے گھبرانے لگی تھی۔
”کیا تم نے آج بھی کلیل کو تلاش کیا تھا؟“ بھلا تم کو اپنی مسلم لیگ سے کب فرصت ملے گی۔“ وال نے سنگڑ صاف کرتے کرتے بڑی چچی نے سر اٹھا کر پوچھا۔

”اماں اب آپ اس کی فکر نہ کریں“ وہ بہت سی چلا گیا ہے“ دہاں مزے سے کھا کھاتے گا۔“ جمیل بیبا نے جیسے ویلا کھینچ مارا۔

”بہت سی؟“ اتنی دور؟“۔ بڑی چچی کی آواز لرز رہی تھی۔ ”ارے اسے شرم نہ آئی مجھے سمجھتے ہوئے“ اسے اپنی ماں کا بھی خیال نہ آیا۔ ”بڑی چچی بکلیہ تمام کر رونے لگیں۔

عالیہ تخت سے کود کر بڑی چچی کی طرف لپکی اور انہیں اپنی بانسوں میں لے لیا۔ ”نہ روئے بڑی چچی“ وہ آجائے گا۔“

”وہ کیوں آئے گا عالیہ بیگم“ یہاں اس کے لئے کیا رکھا تھا اور اب اسے کس کا خیال آئے گا۔ وہ اپنی زندگی بنانے گیا ہے یا بگاڑنے“ اس نے کچھ سوچا ہی ہو گا“ اس گورکھ دھندے میں رہ کر کیا کرتا۔“ جمیل بیبا کی نظروں تک میں طفر تھا۔
”جمیل میاں کوئی کیا کر سکتا تھا“ اس کے باپ کا فرض تھا کہ گھر کی فکر کرتے“ اپنی اولاد کو دیکھئے“ پڑھاتے کھاتے“ تربیت کرتے“ وہ غریب آوارہ پھرتا رہا، کبھی پلٹ کر نہ پوچھا۔“ اماں کو تو بڑے بچے کے خلاف دھرا لگنے کا کوئی موقعہ ملنا چاہئے تھا۔ بس مجبور تھیں جو کچھ خزانے ان کے سامنے کچھ نہ کہیں۔ ان سے یہ احساس کوئی نہیں سکا تھا کہ سب گھروں کی تباہی کے ذمے دار صرف بڑے بچے تھے۔ باقی تمام افراد معصوم تھے۔ وہ بڑے یقین سے کہتی تھیں کہ بنیاد ٹیڑھی رکھی جائے تو ساری عمارت ہی ٹیڑھی بنے گی۔

جمیل بیبا سر جھکا کر جانے کیا سوچنے لگے۔ بڑی چچی دوپٹے کے پلو میں منہ چھپانے روئے جا رہی تھیں۔ ان کی کوکھ سے جنم لینے والا ان کے دکھوں پر قہقہہ کر سناٹھ چھوڑ گیا تھا۔ وہ لاکھ آوارہ ہو گیا تھا پھر بھی ایک ماں کو اس سے کوئی آس تو تھی۔

”مت روئے بڑی بھابی“ جب ملک آزاد ہو گا تو کلیل بھی واپس آ جائے

گا۔ ”اماں نے مسکھ خیز طریقے سے کہا اور داد طلب نظروں سے دیکھنے لگیں۔
 ”اور جب ملک آزاد ہو گا تو سارے انگریزوں دم دبا کر بھاگ جائیں گے،
 ہمارے پاکستان میں تو ایک بھی انگریز نہ رہے گا۔“ مہمئی بھی اپنے کمرے سے نکل
 آئی تھی۔

”میرے اللہ۔“ عالیہ زیر لب بوڑائی۔ ”ایک دفعہ پھر سب لوگ سن لو کہ
 کلیل بھاگ گیا، بڑی چچی کا بلیجہ صدے سے پست رہا ہے، آپ لوگ ذرا دیر کو اپنی
 بحث سے ہاتھ اٹھا لیں۔“ عالیہ کے لیے میں سختی تھی۔

”ذرا دیر کے لئے سب چپ ہو گئے۔ شام اتنی دیر ان اور اس ہو رہی
 تھی کہ عالیہ کو لگا کہ کلیل بھاگ نہیں بلکہ ابھی ابھی اس کی میت اٹھائی گئی ہے۔
 بڑی چچی کیسے بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

”اماں اس کے لئے مت روئے، وہ تو سخت ملاحق لڑکا تھا۔“ جمیل بھی اپنی
 ماں کے پاس آکر کڑے ہو گئے۔ ”میں جو ہوں آپ کا خدمت گار۔“
 ”تم بھی مجھے جھوڑ کر چلے جاؤ۔“ بڑی چچی نے سسک کر کہا۔

”میں کہاں جاؤں گا اماں، میرا آپ کا تو جنم جہنم کا ساتھ ہے، اور تو اس دنیا
 میں میرا کوئی ساتھی نہیں۔“ انہوں نے نظریں ہچا کر عالیہ کو دیکھا تو اس نے گھبرا کر
 بڑی چچی کی آڑ لے لی۔

جمیل بھی ا کی ذرا سی تسلی سے بڑی چچی چپ ہو گئیں، وہ چپ نہ ہوتی تو کیا
 کرتیں۔ ان کی ساری زندگی ان کی مرضی کے خلاف گزرتی رہی۔ اور وہ ممبر کی
 صل پہنے پر دھرے دوسروں کے اشاروں پر بھرتی رہیں۔

”اللہ اب اس گھر کو تباہوں سے بچالے۔“ کریمین ہوا دعائیں کر کر کے
 لالینیں جلا رہی تھیں اور سب لوگ بڑی عقیدت سے اذان کی آواز سن رہے
 تھے۔ مجھ بچو بھی نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر نیچے دیکھا اور اس طرح
 ہٹ گئیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ مر جاؤ جاہلو، تم سب کی یہی سزا ہے۔ بھوکے مر مر
 کر ایک دن سب بھاگ جائیں گے۔

رات آٹھ بجے کے قریب بڑے بچا گھر میں داخل ہوئے تو بڑی مگرز

خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کریمین ہوا نے تخت پر دسترخوان ہچا کر کھانا لگا دیا۔
 ”کلیل بھاگ گیا، بسبتی میں ہے۔“ بڑی چچی نے خبر سنائی۔ ان کی آواز بھرا
 رہی تھی۔

”ارے، بھاگ گیا، آخر کیوں بھاگ گیا وہ مردود۔“ مارے غصے کے بڑے
 چچا کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ ”آئے گا تو اس کی بڑیاں توڑ دوں گا“ اسے شرم نہیں
 آئی۔

”تم کیوں بڑیاں توڑو گے، تم نے اس کے لئے کیا کیا ہے، تم کو تو یہ بھی یاد
 نہ تھا کہ کلیل بھی تمہاری اولاد ہے۔“ بڑی چچی نے تابوڑ جواب دیا۔ آج پہلی
 بار وہ سب کے سامنے بڑے چچا سے لڑنے پر آمادہ تھیں۔

”وہ۔۔۔ وہ میں نے کہا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔“ بڑے چچا نے
 بوکھلا کر سر جھکا لیا اور جلدی جلدی نوالے توڑنے لگے۔ ”مہمئی دانتوں تلے انگلی
 رکھ کر اپنے مخصوص انداز سے ہنسنے لگی تو بڑی چچی نے اسے گھور کر دیکھا اور وہ
 اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

عالیہ نے بڑی خوشی سے سب سنا، دیکھا اور کڑھ کر رہ گئی۔ بڑے چچا کا جھکا
 ہوا سر دیکھ کر اس کا دل توپ اٹھا تھا۔ کاش بڑے چچا سے اب کوئی کچھ نہ
 کہے۔ انہیں ان کے حال میں مست رہنے دیا جائے، مگر یہاں تو کوئی انہیں معاف
 کرنے کو بھی تیار نہیں۔

کھانے کے بعد بڑے بچا بیٹھک میں چلے گئے تو عالیہ نے بڑی منتوں سے بڑی
 چچی کو کھانا کھلایا۔ آج تو وہ بیٹھک کے دوزخ کو پانے کے لئے بھی تیار نہ تھیں۔

”کریمین ہوا، بڑی بھالی سے پوچھو کہ میں بسبتی جا کر کلیل کو تلاش کروں؟“
 جب عالیہ اپنے بستر پر لیٹ رہی تھی تو اسرار میاں کی کیکپاتی آواز اس کے
 کلیجے کے پار ہو گئی۔ کیا چچا بچ آواز اسرار میاں کی تھی! اسے یقین نہ آ رہا تھا۔

جائے۔

”ایک دوپہ ہمیں دے دیجئے اس میں سے“ لپکا لگا کر اوڑھوں گی۔“ وہ پنے ہوئے دوپہ کو اٹھا کر مروڑنے لگتی — ”دیکھئے میرا دوپہ کیسا لٹے ہو رہا ہے۔“

”چھوڑ دو مہمی، پٹٹ کل جائے گی۔“ عالیہ دوپہ جھینٹے لگتی۔

”آخر یہ ہیں کس کے جیز کے، بھاری بتا بھی نہیں سکتیں، زبان حلقی ہے۔“ مارے تجسس کے مہمی لڑنے پر آمادہ ہو جاتی۔

”تم کو پیڑوں کی جو جھ سے لڑیں۔“ عالیہ بڑے پیار سے اپنی بڑائی کا رعب ڈالتی تو مہمی ہنسنے لگتی۔

آج دوپہ میں کتنا سناٹا تھا۔ وہ مہمی کے دوپہ میں کرن ٹانگ رہی تھی اور اپنے مستقبل کے خیال کو جان پر نازل کئے جا رہی تھی — اگر وہ ٹیل ہو مہمی تو کیا ہو گا، اگر پاس ہو مہمی تو لے دے کے ایک ہی بات رہ جاتی ہے کہ بی ٹی کرے۔ استانی بن جائے مگر کیا وہ بی ٹی کر سکے گی، کیا اماں اسے علی گڑھ جانے دیں گی اور کیا اماں اسے اتنے روپے بھجواتے رہیں گے؟

ہائی سکول کے احاطے میں آم کے درختوں پر کوئل مسلسل جھٹکے جا رہی تھی اور پاس کے کمرے میں سوئی ہوئی نجمہ چھو بھی کے خرائے چھت سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی سو جائے اور اتنے خرائے لے کر نجمہ چھو بھی اپنی بے فکر نیند سے چونک پڑیں اور پھر ساری دوپہ بیٹھ کر کاٹ دیں۔

بالم آئے ہو مورے من میں — پچھلائی دھوپ سے بچنے کے لئے کوئی راہ گیر بالم کا سایہ تلاش کرتا نکلی سے گزر گیا۔

وہ ایک لمبے کوئلے کی جھانگی اور پھر کرن ٹانگنے لگی — کتنی صدیاں گزر گئیں مگر ان بالم صاحب کی جج میں فرق نہ آیا۔ کتنوں کو قبر میں سلا دیا مگر خود موت کا منہ تک نہ دیکھا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ جمیل بیہانے آتے ہی پوچھا۔

آج کتنی مدت بعد وہ پھر اس کے پاس آ بیٹھے تھے — لوا ایک اور بالم صاحب آ گئے — عالیہ بوکھلا کر اگلے سیدھے ٹانگے مارنے لگی — ”مہمی کا

Talib
22-12-06

امتحان کے بعد جب عالیہ نے سر اٹھایا تو ہمارا جا بھکی تھی۔ ہواؤں میں گرمی بس گئی تھی۔ ٹالی سے ڈھیروں پانی کیاری میں جا کر مچھلوں پر رونق نہ آتی۔ پتلیں مرحماں مہماں کر بھرتی رہتیں، مارے پاس کے نسبی نسبی چڑیوں کی چو نہیں سکی رہتیں اور چلے کے پاس کام کرتے ہوئے کرہن بوا کے ہاتھ سے چٹکیا نہ چھوٹی۔ شام کو مہن ٹھنڈا کرنے کے لئے کتنی ہی پانی کی باٹلیاں چڑک دی جاتیں، پھر بھی سکون نہ ملتا۔ سارا ماحول جل رہا تھا۔

ان بے کار، دیران اور گرم دنوں میں بڑی چچی نے مہمی کے جیز کے پانچ جوڑے کپڑے اس کے سپرو کر دیئے تھے۔ دوپہر میں جب سناٹا چھا جاتا تو وہ مشین پر کپڑے سینے بیٹھ جاتی۔ بڑی چچی سے تو اب کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ ہر وقت بھی بھی سی رہتیں۔ ان کا کسی کام میں جی نہ لگتا اور اماں تو ویسے بھی مہمی کو برداشت نہ کرتیں۔ ان کا بس چپتا تو جیز کے کپڑوں سے مہمی کا کٹن سی ڈالتیں۔ بس ایک عالیہ رہ گئی تھی جو بڑے غلوں سے جیز سی رہی تھی اور ہر وقت مہمی کے اچھے نصیب ہونے کی دعائیں کر رہی تھیں۔

ادھر مہمی تھی کہ اپنے نصیب کی بازی کتنے سے بے خبر سارے گھر میں اودھم ڈھاتی پھر رہی تھی۔ منظور کی محبت نے جو ذرا سی جینجیو پیدا کر دی تھی وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔ بڑے بچا کو دیکھتے ہی اسے پاکستان کا خیال سٹانے لگتا۔ انگریزوں کو وہ بے نقط سناٹا کر اماں کے چٹکے چھوٹ جاتے، اور جب سب کو چڑا چڑا کر وہ تھک جاتی تو پھر عالیہ کے پاس آتھتی — ”اے بچیا یہ کس کے کپڑے کل رہے ہیں، ہے اللہ کتنے پیارے ہیں، یہ کون پنے گا؟“ وہ اٹھلا کر پوچھتی۔

”کسی کے ہیں مہمی۔“ عالیہ لرز کر ہمانہ کرنی کہ کبیں جی بات کا پتہ نہ چنیں

دوپٹہ ٹانگ رہی ہوں۔"

وہ دوپٹے کا ایک سرا پکڑ کر یوں ہی اٹھنے بیٹھنے لگے۔ عالیہ نے بچی بچی نظروں سے دیکھا کہ آج بھران کی آنکھوں میں پاگل پن بھانک رہا تھا اور چہرے پر زندگی سے تھک جانے کے آثار اتر رہے تھے۔ ہائے یہ کون سا جذبہ ہے جو اتنی جھڑکیاں کھانے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتا۔

"اچھا تو جی بی بی کا چیز تیار ہو رہا ہے۔" وہ جیسے بات کرنے کی خاطر بولے۔

"ہاں جیل بھیا۔ ابھی خیر ہے، خوب سوچ لیجئے۔"

"عالیہ۔" مارے غصے کے جیل بھیا ایک دم چپ ہو گئے۔ "تم مجھے چڑا کر خوش ہوتی ہو؟" چند لمحوں بعد وہ بولے تو ان کی آواز میں لرزش تھی۔

"بھئی کچھ ہے،" آپ تو ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہوتے ہیں۔" وہ ہنسنے لگی۔ اس نے سوچا کہ بات یوں ہی بنی میں ٹل جائے تو ٹھیک ہے، پر جیل بھیا تو سخت سنجیدہ ہو رہے تھے۔

"عالیہ!" انہوں نے پکارا۔

"ہوں۔" عالیہ نے سر تکانہ اٹھایا۔

"ذرا یہ دوپٹہ تو اوڑھ کر دکھاؤ۔" ان کی آواز جذبات کے بوجھ سے

بھاری ہو رہی تھی۔

"کیوں؟"

"بس یہی دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم دلہن بن کر کیسی لگو گی۔"

"آپ کی دلہن کے لئے مجھے ایسا دوپٹہ ٹانگ دوں گی۔"

"میری کوئی دلہن نہیں۔"

"کئے تو آپ کی چار شادیاں کر لاؤں؟"

"بیویوں کا کیا ہے، وہ تو بہت سی مل جائیں گی، مگر مجھے میری دلہن کبھی نہ

ملے گی، تم میری شادی کرنے کی زحمت نہ کرو تو اچھا ہے۔"

جیل بھیا کی آنکھوں میں ایسا دکھ تھا کہ وہ ڈوب کر رہ گئی۔ اس نے دونوں

ہاتھوں سے دوپٹے کو اس طرح تان لیا جیسے اب سر پر ڈال لے گی۔ وہ اس وقت تو جیل بھیا کی فرمائش ضرور پوری کر دے گی۔ جیل بھیا اسے کس شوق سے دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک دم جیسے وہ چونک پڑی۔ اس نے دوپٹے کو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اگر آج اس نے یہ دوپٹہ اوڑھ لیا ہو تا تو پھر یہی دوپٹہ کھونٹھت بن جاتا۔ وہ اس کھونٹھت کو کبھی نہ اٹھا سکتی۔ یہ کھونٹھت اس کی آنکھوں پر پردہ بن کر پڑ جاتی۔ اس گھر میں ایک اور بڑی بچی زندگی کی راہ پر بھٹکنے کے لئے جنم لے لیتی اور پھر ملک آزاد ہوتا رہتا۔

"تم یہ دوپٹہ اوڑھنا چاہتی ہو مگر بزدل ہو۔" جیل بھیا پھر آپے سے باہر ہونے لگے۔ "جانے تم کس قسم کی لڑکی ہو۔"

"جیل بھیا صاحب،" آپ اپنی اماں کی زندگی سے عبرت حاصل کیجئے۔ کسی سیدھی سادی عورت سے شادی کر لیجئے اور بس، وہ سب سہ جائے گی۔"

جیل بھیا نے اسے غور سے دیکھا، شاید وہ اس کے فطری گہرائی کو پار کر گئے تھے۔ "مجھے نہیں معلوم کہ میرے باپ کس مٹی کے بنے ہیں، بہر حال یہ خیال غلط ہے کہ ملک کا غم گھروں کے غموں سے نجات دلا دیتا ہے یا سیاست میں حصہ لینے والے کسی سے محبت نہیں کرتے۔" وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "تم اس شخص کے دکھ کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتیں جس کا کوئی ارمان پورا نہ ہوا ہو۔"

وہ ذرا دیر ٹھہر کر چلے گئے مگر عالیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جواب دینا بھی نہ چاہتی تھی۔ اس وقت جیل بھیا کے سامنے وہ کسی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنے کی طاقت نہ رکھتی تھی۔ اس وقت اسے ان کے دکھ کا احساس ہو رہا تھا مگر ان دکھوں کا مداوا اس کے بس میں نہ تھا۔

اس نے پھر دوپٹہ ٹانگنا چاہا مگر جی نہ لگا۔ ناامیدیوں کے بولوں کے بعد کا سناٹا کتنا بوجھل ہو رہا تھا۔ وہ بڑی دیر تک یوں ہی خالی الذہن سی بڑی ادھر ادھر دیکھتی رہی۔

شام کو جب وہ نیچے اترتی تو کمرین بوا صحن میں پانی چھڑک رہی تھی۔ جیل

بھیا لوہے کی کرسی پر بیٹھے اٹھائیں مروڑ رہے تھے اور بڑے چچا برآمدے میں مثل مثل کر جیسے کسی چیز کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بڑی چچی سب سے بے نیاز، تخت پر بیٹھی آلوچیل رہی تھیں۔
 ”بڑے چچا آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ عالیہ نے بڑے چچا کے قریب جا کر پوچھا۔

”سر میں درد ہے بیٹی۔“

بڑی چچی نے چونک کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ”کریمن ہوا جلدی سے پتک بچھاؤ، بس صحن ٹھنڈا ہو گیا۔“

”ناس جائے اس درد کا۔“ کریمن ہوا برآمدے میں ایک طرف کھڑے ہوئے پتک اٹھا اٹھا کر آئین میں بچانے لگیں۔

بڑے چچا جمیل بھیا کی طرف سے کروٹ لے کر لیٹ گئے۔ عالیہ کو سخت کوفت ہو رہی تھی کہ بیٹا پاس بیٹھا ہے مگر باپ کو پوچھتا تک نہیں۔ کتنا عرصہ ہو گیا دونوں کے درمیان بات چیت بند تھی۔

”تم آج دو دن سے گھر میں کیوں بیٹھے رہتے ہو؟“ بڑی چچی نے جمیل بھیا کی طرف دیکھا۔

”نوکری چھٹ گئی ہے اماں، سرکار کے دفتروں میں سیاسی لوگوں کا گزارا مشکل ہی سے ہوتا ہے۔“

عالیہ نے جل کر جمیل بھیا کو دیکھا۔ ”خوب، اسی برتے پر اپنی دامن تلاش ہو رہی تھی۔“ اس نے سوچا اور پھر جمیل بھیا کو سختی ہوئی نظروں سے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

”مسلم لیگیوں کی کھپت تو انگریز بہادر کے دفتروں ہی میں ہوتی ہے۔“ بڑے چچا نے کروٹ بدلے بغیر کہا۔

”آپ کا خیال بالکل غلط ہے، اصل بات تو یہ ہے کہ جب کانگریس سفارش کر دیتے ہیں تو پھر نوکری مل جاتی ہے۔“ جمیل بھیا بھی کیوں چپ رہتے۔
 ”ہوں!“

باپ بیٹے دونوں ہی اپنے اپنے ٹھکانے میں جل کر خود بخود بجھ گئے اور دونوں نے اس طرح منہ پھیر لیا جیسے ایک دوسرے کو بات کرنے کے لائق نہ سمجھ رہے ہوں۔ عالیہ نے جمیل بھیا کو ملامت بھری نظروں سے دیکھا اور بڑے چچا کے پاس بیٹھ کر ہولے ہولے سرسلانے لگی۔ اماں کیلے پال جھکتی ہوئی غسل خانے سے نکل آئیں اور سب کو ایک جگہ جمع دیکھ کر بڑی بیڑاری سے پائداں اٹھا کر آخری پتک پر جا بیٹھیں۔

”اب کیا ہو گا؟“ بڑی چچی نے جمیل بھیا سے پوچھا۔

”فکر نہ کیجئے اماں، ایک بڑی اچھی نوکری ملنے والی ہے، آپ سب کے ٹھاٹھ ہو جائیں گے۔“

”کھیل کی پھر کوئی خیریت معلوم ہوئی یا نہیں؟“ بڑی چچی نے اچانک پوچھا۔
 ”اماں آپ اس کی فکر نہ کیا کیجئے، وہ بڑے مزے میں ہے۔ یہاں کے سارے دکھ بھول گیا ہو گا۔“ جمیل بھیا نے پھر بڑی صفائی سے بھوت بولا۔ انہوں نے عالیہ کو ساری حقیقت بتا دی تھی کہ انہیں کھیل کا پتہ تک نہیں معلوم۔

”خیر جہاں رہے خوش رہے۔“ بڑی چچی نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”بڑے چچا آپ کا پتک باہر چڑھتے رہے پوچھاؤں، کھلی فضا میں درد کم ہو جائے گا“ عالیہ نے پوچھا۔ وہ مختلف کٹر نظرات ایک جگہ جمع ہو جاتے تو اسے ڈر لگنے لگتا۔ کھیل کے ذکر سے وہ پریشان تھی۔ جمیل بھیا موقع پر چوکنے کا نام نہ لیتے۔

”ہاں وہیں بستر لگوا دو تو بڑا اچھا ہو۔“ بڑے چچا نے اسے ممنونیت سے دیکھا اور پھر باہر جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

گلی میں کانگریسی بچوں کا جوس نکل رہا تھا۔ وہ بڑے بے ہنگم طریقے سے شور مچا رہے تھے۔ ”ہمجنڈا اونچا رہے ہمارا۔“ کانگریس زندہ باد، گاندھی جی زندہ باد، جواہر لال نہرو زندہ باد، ہندوستان نہیں بنے گا، ہمجنڈا اونچا رہے ہمارا۔“

بڑے چچا کے ہونٹوں پر ایک مسمی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ جمیل بھیا ہنس رہے تھے اور اماں جو بڑی دیر سے چپ بیٹھی چھایا

کاٹ رہی تھیں۔ آخر بول ہی پڑیں۔ ”پہلے آزادی تو مل جائے، پھر سب ہوتا رہے گا اور پھر یہ ہندوستانی لوگ پہلے حکومت کرنا بھی تو سیکھ لیں۔“

سب چپ رہے، کسی نے بھی تو اماں کو جواب نہ دیا۔ باہر بڑے چچا کا بستر لگ گیا تھا۔ وہ چلے گئے اور جمیل بھی پھر اگھیاں مروڑنے لگے۔ جلوس کا شور دروازے کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ بھی دیوانوں کی طرح بھدور بھدور کرتی اپنے کمرے سے نکل پڑی۔ ”اگر میرے دروازے کے پاس سے جلوس نکلا تو ڈھیلے ماروں گی۔“ وہ دروازے کی طرف لپکی۔

”خبردار جو آگے بڑھیں، جھٹے جاؤ پچکے۔“ جمیل بھی زور سے گرجے، اور بھی جانے کیسے رعب میں آگئی۔ اس نے جمیل بھیما کو گھور کر دیکھا اور بڑبڑائے لگی۔ ”ہونہ! بڑے آئے پچارے“ آج ہی مسلم لیگ کا جلوس نہ نکالا ہو تو میرا نام بھی بھی نہیں۔“

جلوس دروازے کے پاس سے گزر گیا تو جمیل بھی کپڑے تبدیل کر کے باہر چلے گئے۔ بھی جیسے ان کے جانے کا انتظار کر رہی تھی جمیل بھیما کے جاتے ہی برقع اوڑھ کر خود بھی باہر نکل گئی۔ عالیہ اسے روک نہ سکی۔

”زمانے زمانے کی بات ہے، پہلے تو جب بیسیاں گھروں سے نکلتیں تو دو دو چار چار مائیں ساتھ ہوتی تھیں۔“ کریمین ہوا بھی کیوں باہر نکل جانے پر ہمیشہ کڑھا کرتیں۔

عالیہ نے کواڑوں کی اوٹ سے جھانک کر باہر دیکھا۔ بڑے چچا اپنے صاف سترے بستر پر پاؤں پھیلائے سکون سے لیٹے تھے اور اسرار میاں ان کے قریب آرام کر رہے تھے۔ سامنے جیل کے گھنے درخت سے چاند کی روشنی ابھرتی معلوم ہو رہی تھی۔ عالیہ کاجی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی باہر چوتڑے پر جا بیٹھے۔ اسرار میاں کی باتیں سننے، انہیں پاس سے دیکھے۔ وہ کس طرح بولتے ہیں، وہ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ وہ جو اس کے دادا کی بدینچ کا نتیجہ ہیں، ان کی آنکھوں میں کون سی کیفیت ہوگی اپنے آپ کو پہچاننے کے بعد کون سے اثرات ان کے چہرے پر لرزاں ہوں گے۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے۔ اور جب وہ یہ سب کچھ معلوم

نر لے گی تو ایک بار انہیں چپکے سے اسرار چچا کے گی۔ انہیں بتائے گی کہ وہ بھی اسے بڑے چچا کی طرح عزیز ہیں۔ وہ ان کی بے حد عزت کرتی ہے، اور زندگی میں ایک بار انکی خدمت کرنا چاہتی ہے اور وہ ان کے دل سے ان تمام تیروں کو کھینچ کر پھینک دے گی جو کریمین ہوا نے پیوست کئے ہیں۔ وہ انہیں سمجھائے گی کہ ان کی کسی بات کا برا نہ مانا کریں۔ وہ کسی کی دشمن نہیں وہ خود کچھ نہیں کہیں۔ یہ ظالم نمک ان سے سب کچھ سکھاتا ہے۔

”عالیہ بیٹی اچھی پان کھلا دو۔“ بڑی چچی نے فرمائش کی تو وہ تخت پر آ بیٹھی اور پاندان کھول کر پان بنانے لگی۔ وہ باہر چوتڑے پر جا کر نہیں بیٹھ سکتی۔ اسے عجیب سی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔

محلے کی مسجد سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے مارے احرام کے ساری کا پلہ سر پر ڈال لیا۔ کریمین ہوا جلدی جلدی لالینیں جلا رہی تھیں۔

”اللہ تکمیل کو خیریت سے رکھو۔“ بڑی چچی دونوں ہاتھ پھیلا کر دعا کرنے لگیں۔ وہ اس وقت کتنی دھکی اور ماسا سے بھرپور نظر آ رہی تھیں۔

اندھیرا ہر طرف در آیا تھا مگر بھی اب تک گھر نہیں کوئی تھی۔ عالیہ کو خواہ نواہ فکر ہو رہی تھی۔ ویسے گھر میں اور کسی نے نہ پوچھا کہ وہ ہے کہاں۔

زرا دیر بعد بھی آئی تو منہ سرخ ہو رہا تھا۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔

”اے بیجا میں نے ایسا شاندار جلوس تیار کر لیا ہے کہ آپ دیکھتی رہ جائیں گی، بس زرا دیر میں ادھر سے گزرنے والا ہے۔ عذرا کی اماں نے جھنڈا بنایا، طاہرہ کی اماں نے ایک بوقلم مٹی کا تیل دیا تھا، میں نے مشطیں تیار کیں۔ سارے محلے کے لڑکوں کو جمع کر دیا ہے، ہائے، بڑے چچا دیکھیں گے تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ میں نے سارے بچوں کو سمجھا دیا ہے کہ میرے دروازے پر آ کر خوب نعرے لگائے، بھی ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی۔ اور پھر برقع پھینک کر جلوس کے انتظار میں ٹھٹھنے لگی۔“

خوشیوں کا کوئی پیمانہ اس وقت بھی کی سرست کو نہیں ٹاپ سکتا تھا۔ عالیہ نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پریشان ہو رہی تھی کہ کہیں یہ ننھے نئے بچوں کا

جلوس گھر میں فساد نہ کرا دے۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اوپر اپنے کمرے میں کھٹک لے۔ دور سے بچوں کے نعروں کی آواز آرہی تھی۔

بڑے کمرے سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ نجمہ پھوپھی اپنے صاف ستھرے بستر پر لیٹی کوئی موٹی سی کتاب پڑھ رہی ہیں۔ گرمیوں میں بڑی جھت پر نجمہ پھوپھی کا ڈیرہ جتنا تھا۔ اس لئے وہ اپنے کمرے کے پاس والی چھوٹی جھت پر گزارہ کر لیتی۔ اتنی قابل نجمہ پھوپھی کا اور اس کا ساتھ کیسے ہو سکتا تھا۔

جلوس قریب آ گیا تھا۔ بچے بڑے زور زور سے نعرے لگا رہے تھے۔ ”مسلم لیگ زندہ باد“ قائد اعظم زندہ باد“ بن کے رہے گا پاکستان“ دھتیا راج نہیں ہو گا“ چلیا راج نہیں ہو گا۔“

عالیہ جھت کی منڈیر سے جھک کر گلی میں بھاگنے لگی، دو بڑے لڑکے مشطیں اٹھائے سب سے آگے تھے۔

”نہیں دیکھنے دیا ظالم نے“ — مہمی بھاگتی ہوئی آئی اور عالیہ کے برابر کھڑے ہو کر نیچے گلی میں آدمی لٹک گئی۔ ”ہائے کیسا شاندار جلوس ہے“ وہ آپ کے بڑے بچانے مجھے دروازے سے جلوس نہیں دیکھنے دیا، جل کر خاک ہو گئے حضرت۔“

”مہمی ذرا سرک کر جھاکو کیس جلوس کے ساتھ تمہاری لاش بھی نہ نکال جائے۔“ عالیہ نے مہمی کے لٹکے ہوئے دھڑکواہنی طرف کھینچا۔

”ہائے بچا میں نے مشطیں کیسی اچھی بنائی ہیں، ہیں نا؟“ مہمی نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔ ”آج تو آپ کے بڑے بچا جلتے جلتے ختم ہو جائیں گے۔“

”جی، کیسی باتیں کرتی ہو مہمی، بس پتہ چل گیا کہ لٹی و جی کچھ نہیں ہو، بڑے بچا کو جلانے کے لئے یہ سوائگ رچایا ہے۔“

”واہ، ہوں کیوں نہیں۔“ وہ شرمندہ سی ہو گئی اور عالیہ کے گلے میں ہاتھ ڈال کر جمبول گئی۔

جلوس گلی کے موڑ پر غائب ہو گیا تو تھکی تھکی سی مہمی عالیہ کے بستر پر لیٹ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی اور عالیہ خاموشی سے مشطی رہی — اب کتنے دن یوں

سب کو جلانے کے لئے مہمی بیٹھی رہے گی۔ آخر تو ایک دن اپنے گھر چلی ہی جائے گی، جائے وہ گھر بھی اس کا گھر بنے گا کہ نہیں۔ مہمی کو وہاں محبت ملے گی یا نہیں۔ کیا وہاں بھی وہ سب سے بدلے چکانے کے طریقے ایجاد کر کر کے زندگی گزارے گی۔

”عالیہ بنیا اور مہمی بنیا، دونوں کھانا کھائے نیچے آ جاؤ۔“ کریکین بوا کی آواز آئی۔

لے پچاسوں چکر لگانے کے بعد ہمیں کے جیز کے برتن خرید لئے تھے۔ نقشن، لونہ کنورہ، بک، اگلدان، پاندان، دو پتلیاں اور چھ پٹلیں جب بڑے بکس میں رکھی جا رہی تھیں تو کریمین بوادیر تک سر پکڑے بیٹھی رہیں۔ ان کی آنکھوں کو یہ زمانہ بھی دیکھنا تھا کہ ان کے مالک مرحوم کی پوتی کو ایسا جیز دیا جائے۔ اچھے زمانے میں تو ایسا جیز باندیوں کی بیٹیوں کو دے کر رخصت کیا گیا تھا۔ بس اتنا ہی فرق تھا کہ وہ برتن نقشن نہ ہوتے تھے۔

جب بڑی چچی برتن بند کر کے انھیں تو کریمین بوا کو بے تحاشہ روٹا آگیا۔ بڑی چچی نے انہیں سمجھا بھکا بڑی مشکل سے چپ کرایا۔ کیا فائدہ تھا جو ہمیں کو پہلے سے خبر ہو جائے۔ سب اس سے ڈرے ہوئے تھے۔ بڑے بچا کی لگائی ہوئی شادی سے کہیں انکار ہی نہ کر دے۔

بڑی چچی کو شادی کے دن کا سخت انتظار تھا۔ شادی میں شریک ہونے کے لئے ساجدہ آپا بھی آ رہی تھیں۔ ساجدہ آپا کی شادی کو کتنا عرصہ گزر گیا تھا مگر بڑی چچی گھر کے دھندوں سے جھٹ کر ایک دن کے لئے بھی اپنی بیٹی کے گھر نہ جاسکیں۔ ساجدہ آپا شروع شروع میں تو گھر آتی رہیں۔ پھر جیسے سب کی طرف سے مبرک کے بیٹہ رہیں۔ یہاں ساجدہ آپا کے لئے کون بچا کا بارہا تھا۔ عالیہ نے شاید دو چار دفعہ ہی ان کا ذکر سنا تھا۔ پھر انکے میں ان کے لئے کون سے جوڑے ہانگے رکھے تھے جنہیں لے کر خوشی خوشی رخصت ہوتیں۔ ادھر ان کے میاں بھی یہاں آنے سے کتراتے، جب سے کانگریس کو خیر باد کہا تو بڑے بچا بھی جھوٹ گھسے تھے، ان کے سامنے کس منہ سے آئے۔

جوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے تھے، عالیہ کو یہ فکر ستا رہی تھی کہ وہ ہمیں کو کیا دے۔ اماں نے تو اپنے جیز کے کپڑوں سے ایک گھا ہوا جوڑا نکال کر ہمیں کے نام کا کر دیا تھا۔ اس طرح وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئی تھیں۔ انہوں نے عالیہ سے مشورہ تک نہ کیا تھا۔ عالیہ کو اپنی اماں کی اس زیادتی کا شدت سے احساس تھا۔ ادھر بڑی چچی بھی عالیہ سے کچھ کم پریشان نہ تھیں۔ جمیل بھیا کو روزانہ شو کے دیتی رہتیں کہ کچھ روپے کا انتظام کر کے ہمیں کے لئے کپڑا خرید

وہ پاس ہو گئی تھی مگر اب پورا سال برباد جا رہا تھا۔ وہ بیٹی کرنے علی گڑھ نہ جاسکی۔ بس اتنی سی بات تھی کہ وہ اپنے قلم سے لکھ کر ماموں سے زیادہ روپوں کی فرمائش نہ کرتا چاہتی تھی۔ جب اماں سے بات ہوئی تو انہوں نے بڑے لاڈ سے کہا تھا کہ اپنے ماموں کو لکھو، وہ زیادہ روپے بھجوانے لگیں، اس وقت عالیہ نے سختی سے انکار کر دیا تھا، اس نے یہ تک کہہ دیا تھا کہ وہ انہیں خط لکھتا پسند نہیں کرتی۔ بس اسی دن سے اماں نے منہ پھلایا تھا۔ اپنے بھائی اور انگریز بھادج کے لئے اپنی اکلوتی اولاد کے دل میں عداوت پان کر کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ انہوں نے عالیہ سے بات کرنا چھوڑ دی تھی اور اس طرح ایک جیتی سال خد کی بازی ہار دیا تھا۔

”اے اردو لے کر بی اے کر لیا، بی بی ہے، اور کبھی کیا سکتی تھی غریب“ ایک دن نجمہ پھو بھی بول ہی پڑیں۔ شاید انہیں یقین ہو گیا کہ بس اب تعلیم کا سلسلہ ختم۔ عالیہ نے سن کر منہ پھیر لیا۔ وہ اس کے ابا کی بہن تھیں۔ وہ ان کے منہ نہ لگنا چاہتی تھی اگر اس کے حالات نہ خراب ہوتے تو ایم اے بھی اردو ہی میں کرتی۔ اردو تو اس کی مادری زبان تھی۔ اس کے چیتے چٹا کی زبان تھی۔ بڑے بچا تو انگریزی زبان تک سے نفرت کرتے تھے۔ انہیں کے کہنے سے اس نے بی اے میں اردو بھی لی تھی۔ اسے خود انگریزی زبان سے نفرت نہ تھی اور نہ وہ تالائق تھی، وہ تو انگریزی میں ایم اے کر کے نجمہ پھو بھی کے منہ پر اپنی ڈگری مار سکتی تھی مگر یہ سب کچھ کرنے کے لئے اسے بڑے بچا کا حکم ماننا پڑتا۔

تمبر کی میں تاریخ ہمیں کے نکاح کے لئے مقرر ہو چکی تھی۔ اماں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود عالیہ نے ہمیں کا سارا جیز تیار کیا تھا۔ اسرار میاں نے بازو

ناد۔ جمیل بھیا ان کی باتیں سن کر چپ ہو رہے۔ آج کل ٹیوشنوں سے گھر کا کچھ کام چل رہا تھا۔ نوکری وغیرہ کے سلسلے میں وہ کوئی خاص فکر مند بھی نظر نہ آتے۔ مسلم لیگ کے کارکنوں نے انہیں دنیا کی فکروں سے نجات سی دلا دی تھی مگر جمیل بھیا کے سلسلے میں بڑی چچی بھی ہار ماننے والی نہ تھیں۔ جب بھی وہ گھر آتے، پیچھے پڑ جاتیں۔ ”تم کو کب ملے گی نوکری؟“ منگائی نہ کھایا ہے مگر میں دھیلا نہیں، پھر بھی کی شادی کے دن قریب ہیں، کیا تمہاری مسلم لیگ نے کچھ دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔“

”سب کچھ ہو جائے گا اماں آپ پریشان نہ ہو جئے۔“ جمیل بھیا شرمندہ ہو جاتے ”میں کوئی ایسا کئی طرح ہوں جو اپنے گھر کو تباہ ہوتے دیکھوں گا۔“

”ابا کے طعنے دتو، کچھ کر کے دکھاؤ۔“

”اماں میں تو سب کچھ کرنے کو تیار ہوں مگر کوئی کرنے نہیں دیتا۔“ وہ عاالیہ کی طرف دیکھنے لگتے تو وہ منہ پھیر لیتی۔

”کون نہیں کرنے دیتا، میں اس کا کچھ کھا لوں گی، وہی نا تمہاری مسلم لیگ۔“

”نہیں اماں۔“ جمیل بھیا زور سے جہتے تو عاالیہ اپنے کمرے میں پناہ لینے چلی جاتی اتنی فضول باتیں سن کر وہ آتا جاتی۔

ادھر کچھ دنوں سے بھی بالکل خاموش رہنے لگی تھی۔ جانے اسے کیا ہو گیا تھا کوئی بات کرتا تو اس طرح جواب دیتی جیسے بارگزر رہا ہے۔ کھانا کھانے کے لئے اپنے کمرے سے نکلتی اور پھر جا چھتی۔ بہت ہو تا تو گراموفون پر ریکارڈ بجانے لگتی۔ اس کے چہرے سے ساری شکستگی غائب ہو گئی تھی۔ عاالیہ اسے یوں چپ چاپ دیکھ کر مارے فکر سے کھلی جاتی۔ کیس بھی کو اپنی شادی کے سلسلے میں شبہ نہ ہو گیا ہو۔ کیس وہ بڑے چچا کی عزت برباد نہ کر دے۔ یہ بھی ہے، سادہ آپا نہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ یوں ہی چپ ہو، وہ اپنی اتنی ہی عمر میں اتنا بوجھل ہے کہ اب تھک گئی ہو گی اور کیا پتہ وہ منظور کی جدائی میں سوگوار ہو، مگر بھی منظور سے محبت ہی قرب کرتی تھی، وہ تو اسے صرف سارا سمجھتی تھی، اس کی محبت سے لطف لیتی تھی

— عاالیہ بھی کے سلسلے میں سوچ سوچ کر تھکی جاتی۔ لاکھ اس کے ساتھ سر کھپاتی مگر بھی کبھی کبھی کر کے ٹال دیتی۔

بڑے چچا دلی گئے ہوئے تھے۔ بینک سونی پڑی تھی۔ جمیل بھیا بھی آج صبح سے غائب تھے۔ بھی گونگی بن گئی تھی اور یہ بادلوں سے لدا پسندا دن ہے حد اداس ہو رہا تھا۔ کوئی کام نہ تھا جس سے عاالیہ اپنا جی بہلا لیتی۔ بھی کا بیڑ تیار ہو چکا تھا، بڑے چچا کی لائبریری سے کتابیں پڑھتے پڑھتے تھک چکی تھی اور اب آج اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے، یہ رینگتا ہوا دن کسی طرح تو کئے، اور کچھ نہیں تو بھی ہی اسے چھیڑے۔ اس سے لڑے، شور کرے، یہ ویران خاموشی کسی طرح تو دور ہو۔

عاالیہ بھی کے کمرے کی دہلیز پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ ”اوپر نہیں چلتیں میرے کمرے میں؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے نیند آرہی ہے بچیا۔“ بھی نے کروٹ بدل لی۔ اس نے اپنی مسہری سے اٹھنے کی زحمت تک نہ کی۔

دو تین گھنٹے کی بارش نے جیسے ساری دیرانی اور اداسی کو دھو دیا تھا۔ شام کو جب جمیل بھیا گھر آئے تو وہ بھی خوش نظر آ رہے تھے۔ عاالیہ نے سوچا کہ آج یہ حضرت خوش کیوں ہیں، کون سا کارنامہ انجام دے کر آئے ہیں جو آج اسے دیکھنے کے بعد بھی صورت پر ماتم نہ برسا۔ وہ تو جمیل بھیا کے لئے جیج تعویہ بن گئی تھی۔ ”اماں، حیدر آباد سے ظفر چچا کا خط آیا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ میرے نام ہے۔“ وہ لوہے کی کرسی پر بیٹھ کر سب کی طرف دیکھ کر کہنے۔ ”بھئی یہ انہیں میری شکایتیں کون لکھتا ہے، میری بیکاری کی کس نے اطلاع دی ہے؟“

”تمہاری نگہ پو پو بھی سے خط و کتابت ہے، انہوں نے لکھا ہو گا، اور تو کسی کو پوچھتے بھی نہیں۔“ بڑی چچی نے کہا۔

”میری شکایتیں لکھنے کی وجہ سے خط و کتابت ہو گی، بھلا میرا کوئی کیا بگاڑ لے گا؟“ بھی اپنے کمرے کی دہلیز پر بیٹھے بیٹھے بولی۔

”کیا لکھا ہے انہوں نے؟“ اماں نے پوچھا۔

”انہوں نے لکھا ہے کہ حیدر آباد چلے آؤ، یہاں کسی چیز کی کمی نہیں، یہ ہندوستان پاکستان کا قصہ جموڑو، یہاں تو بتایا پاکستان ہے۔“ جمیل بھیا ہنسنے لگے۔
”تو پھر چلے جاؤ نا، جہاں روپیہ ہے وہاں سب کچھ ہے۔“ اماں نے مشورہ دیا۔

”پھر میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔ آپ میں سے کوئی یاد نہ آئے گا، وہاں کے پانی کا بھی اثر ہے۔“
”بس یوں ہی بکواس کرتا رہتا ہے۔“ بڑی چچی کو غصہ آگیا۔ ”پھر یہاں کوئی نوکری کر کے دکھاؤ نا؟“
”نوکری تو مل گئی ہے اماں، بس اب جانے والا ہوں!“ جمیل بھیا نے اطلاع دی۔

”کس؟“ ارے اشتیاق کے بڑی چچی کی آنکھیں کھل گئیں۔
”فوج میں بھرتی ہونے کی درخواست دی تھی سو منظور ہو گئی اور اب بندہ آپ کو ڈھیروں روپے بھیجا کرے گا۔“
”فوج میں؟“ بڑی چچی کی آنکھیں اس طرح ساکن ہو گئیں جیسے وہ مر گئی ہو۔
”ارے تو بولا گیا ہے جمیل، پھر مجھے زہریاں نہیں دے دیتا۔“

”بھئی حد کرتی ہیں اماں، ہزاروں آدمی فوج میں جاتے ہیں تو کیا سب مر جاتے ہیں، اور پھر جناب اگر ہٹلر کا مقابلہ نہ کیا تو انگریزوں سے بدتر ثابت ہو گا“
اس کی غلامی بھیلنا آسان نہ ہو گی۔ جمیل بھیا نے سمجھانا چاہا مگر بڑی چچی بے بسی کی تصویر بنی بیٹھی تھیں۔ عالیہ کا جی چاہا کہ جمیل بھیا کو چچ چچ کر کمینہ کے، ظالم کے، یہ اپنی بے روزگاری دور کرنے نہیں جا رہے ہیں، ہٹلر کا مقابلہ کرنے جا رہے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ وہ خود اپنی اماں کے لئے کتنے عقیم ہل رہیں۔

”اب اپنا نام کنالو جمیل ماما۔“ کرکین ہوائے بڑی اتھار سے دیکھا تو جمیل بھیا ہنس پڑے۔ ”کرکین ہوا میں تو صرف تمہاری خاطر جا رہا ہوں، تمہارا باورچی خانہ آباد ہو جائے گا اور تم گزرے ہوئے زمانے کو بھول جاؤ گی۔“
بڑی چچی رونے کے قریب ہو رہی تھیں۔ ”جنگ پر جانے کی بجائے تم بھی

فیل کی طرح بھاگ جاتے تو پھر مجھے صبر آ جاتا۔“ وہ رو پڑیں۔
”میری اماں —“ جمیل بھیا ان کے لپٹ گئے۔ اماں کوئی میں بندوق اٹھا کر لاؤں گا! بھئی میں تو قلم سے لڑوں گا، میں تو صرف ہٹلر کے خلاف پروپیگنڈا کروں گا اور اپنی اماں کی خدمت کروں گا۔“

”تم لڑو گے نہیں؟“ بڑی چچی نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔
”قطعاً نہیں اماں، میں تو دوسرے ہی کام کروں گا۔“
”کیسے کام؟“ نجمہ چھوچی نے پوچھا۔ وہ جانے کیسے اس وقت سب کے چچ میں آ بیٹھی تھیں۔

”میں فوج میں جا رہا ہوں۔“ جمیل بھیا نے فوراً جواب دیا۔
”بہت اچھی بات ہے، اب اتنی تعلیم پر اور کوئی نوکری بھی کیسے ملتی۔“ نجمہ چھوچی نے اطمینان کی سانس لی۔

”بالکل درست“ وہ تو کہنے کہ عورتوں میں تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے، ورنہ آج آپ بھی بیکار پھرتی ہوتیں۔“

نجمہ چھوچی اگلے بیروں واپس ہو لیں، بھلا ان جالوں کے کون منہ لگے، اس گھر میں ان بچاری کی قابلیت کی ذرا بھی عزت نہیں۔ عالیہ کو ہنسی آ رہی تھی۔

”میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ لڑو گے نہیں۔“ بڑی چچی نے جمیل بھیا کا ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا۔

”اس سر عزیز کی قسم اماں —“ جمیل بھیا نے قہقہہ لگایا تو سب ہنس دیئے اور مہمی جو اتنی دیر سے چپ بیٹھی تھی ایک دم اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

نئے چاہوں گی اس کے لئے کچھ نہیں بتا سکتی کہ کیسا ہو گا۔ آپ سے یہ سب کچھ اس لئے کہہ رہی ہوں کہ آپ وہاں اتنی دور رہ کر مجھے بھی یاد نہ کریں۔ گھر سے دور رہ کر اور سب کو چھوڑ کر ان کی یادیں بہت اذیت ناک ہو جاتی ہیں۔ تو آپ آج ہی اس اذیت سے چھٹکارا پا لیجئے۔ جہاں تک گھراور بڑی چچی کا سوال ہے تو وہ آپ کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ بڑی چچی اور کتنے دن جنیں گی؟“ عالیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ جانے کیوں وہ اس وقت جی بھر کر رونا چاہتی تھی۔

”تم نے بہت اچھا کیا جو سب کچھ کہہ دیا۔ اگر تم نہ بھی کہیں تو مجھے معلوم تھا۔ ویسے میں تم کو یہ بتا دوں کہ اماں مجھے بہت عزیز ہیں اور جہاں تک پرانی آگ کا تعلق ہے تو وہ پرانی نہیں میری اپنی آگ ہے۔ اس آگ میں جل کر میں ذرا بھی جلن نہیں محسوس کروں گا۔ کاش اس آگ کو اور بھڑکانے والا کوئی ساتھی بھی ہوتا۔ تم میں اور مجھی میں فرق کیا ہے۔“ خیر، خدا حافظ“۔ جیل بھیا اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”مگر ایک بات تو بتاؤ کہ کیا بدلے کی قائل ہو،“ میرا خیال ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے اس کا بدلہ ضرور چاہتا ہے، تو مجھے بھی جانے سے پہلے بدلہ چاہئے۔ شاید یہ بدلہ وہاں اتنی دور میرے لئے تسکین کا سامان بن سکے۔“ جیل بھیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں تو وہ کانپنے لگی تھی۔

”کیسا بدلہ؟“ وہ جانتے بوجھتے انجان بن رہی تھی۔

ذرا دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ جیل بھیا اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظروں میں تلخی تھی، کچھ کھو جانے کا دکھ تھا، کچھ پالنے کی تمنّا تھی۔

”میں آپ کو کیا بدلہ دے سکتی ہوں؟“ اس نے جیل بھیا کو چونکایا تھا، اب وہ ان کی نظروں کا مقابلہ نہ کر پا رہی تھی۔

”نہیں یہی۔“ جیل بھیا نے آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ اسے ہانگوں کی طرح چوم رہے تھے، اسے اپنے سینے میں جذب کر رہے تھے اور وہ ذرا سی مزاحمت بھی نہ کر سکتی تھی۔ وہ نفرت سے انہیں دھکا بھی نہ دے سکتی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ سب اتنے اچانک کیسے ہو گیا تھا اور وہ یہ سب کچھ کیسے قبول کر رہی تھی اور پھر جیل بھیا جیسے اسے ہسٹربھینک کر چلے گئے تھے اور

جیل بھیا چلے گئے۔ جانے سے پہلے رات گئے وہ عالیہ سے رخصت ہوئے اس کے کمرے میں آئے تھے اور بڑی دیر تک اس کے پاس کرسی پر بیٹھے پاؤں ہلاتے رہے تھے۔ دونوں خاموش تھے اور باہر بارش ہونے چلی جا رہی تھی۔ عالیہ کو اپنی کمزوری پر غصہ آ رہا تھا۔ آخر وہ کیوں نہیں بولتی۔ وہ اتنی خاموشی کے ساتھ کس سوگ کا اعلان کر رہی ہے۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ بارش اب ہلکی ہو گئی تھی۔ خاموشی اور جیل بھیا کی موجودگی سے اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ ”آپ صبح جا رہے ہیں؟“ عالیہ نے بڑی ہمت کر کے پوچھا۔

”ہاں جا تو رہا ہوں، پھر؟“ جیل بھیا نے سخت اکھڑیں سے جواب دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ جانے وہ اپنے کس جذبے کا گلا گھونٹ رہے تھے جو ان کی آنکھیں مارے درد کے چبھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

”پوچھنا کوئی گناہ تو نہیں!“ عالیہ نے سر جھکا لیا۔ جیل بھیا کے جواب سے دل پر چوٹ لگی تھی۔

”تم مجھے یاد کرو گی عالیہ؟“ جیل بھیا نے جیسے جھپٹ کر اس کے ہاتھ پکڑ لئے تھے۔

”نہیں! میں آپ کو کس لئے یاد کروں گی؟ آپ میرے لئے بچا زاد بھائی سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ میں آپ کو اور کچھ سمجھنا بھی نہیں چاہتی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے مرد کی محبت پر اعتبار ہی نہیں اور اگر فرض کر لیجئے کہ کبھی اعتبار کیا بھی تو وہ آپ جیسا نہیں ہو گا۔ اماں اور بڑے چچا جیسا بھی نہیں ہو گا۔ پرانی آگ میں جلنے والے اپنی گھریلو آگ سے بیش بہا خبر رہتے ہیں۔ بہر حال میں

وہ مارے بے بسی کے رونے لگی تھی۔ بھلا وہ کس بات کا بدلہ چکانے پر راضی ہو گئی تھی۔ وہ خود کو طاقت کرتے کرتے جانے کب سو گئی۔

جیل بھیا صبح صبح چلے گئے تھے، وہ تو اس وقت سو کر بھی نہ اٹھی تھی۔ بھی اسے جگا کر شکایت کرنے آئی تھی۔ ”بھیا آپ سوئی رہیں، آپ نے تو جیل بھیا کو رخصت بھی نہ کیا۔ اچھا ہو تاکہ ابھی کچھ دن اور نہ جاتے۔“

”کیوں؟“ بہتر سے اٹھتے ہوئے اس نے چونک کر بھی کو دیکھا۔ یہ اسے کن دنوں کا انتظار ہے؟

”بس نہ جاتے۔“ وہ مڑ بوا گئی۔ ”بھاری بڑی بچی سخت رنجیدہ ہو رہی ہیں۔ اس اولاد کا بھی کوئی سکھ نہیں ملتا کیوں پالتی ہیں مائیں، میں سب سے اچھی جو خود بخود چلی گئی۔ میرے لئے کوئی دکھی نہیں۔“ بھی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”ہاں بھاری بڑی بچی کو کوئی سکھ نہ ملا۔“ عالیہ نے کہا اور بھی کا ہاتھ تمام کر بیچے اتر آئی۔

ٹکلی کھو گیا، جیل بھیا جنگ پر چلے گئے، بڑی بچی مٹی جون کی پیاسی چڑیا کی طرح نظر آ رہی تھیں۔

”اللہ اسے خیریت سے رکھے، مگر میں پیسہ تو آئے گا بڑی بھالی، آپ کو سکھ تو ملے گا۔“ اماں بڑی بچی کو سمجھا رہی تھیں اور وہ خاموش بیٹھی ٹھنڈی سانسیں بھر رہی تھیں

”زمانے زمانے کی بات ہے، آج مالک مرحوم کی اولادیں نوکریوں کی تلاش میں کہاں کہاں جا رہی ہیں، کبھی وہ زمانہ بھی تھا کہ دولت اپنے قدموں چل کر آتی تھی اور کوئی اسے اٹھا کر رکھنے والا نہ تھا۔“ کریمین بوا کی نظریں جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔

دوپہر میں بڑی بچی نے کپڑوں کا ایک بڈل عالیہ کو تھما دیا۔ ”یہ کپڑے جیل بھی کے لئے دے گیا ہے اور کہہ گیا ہے کہ عالیہ سے سلوا لیں۔ سب کا خیال تو کرتا ہے مگر اس برے وقت نے اسے دور جانے پر مجبور کر دیا۔ اگر کوئی اچھی سی نوکری مل جاتی تو پھر وہ کیوں جاتا۔“

”خدا انہیں خیریت سے واپس لائے گا، بڑی بچی آپ پریشان نہ ہوں۔“ وہ کپڑے لئے لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کا بی چاہ رہا تھا کہ بھی کو یہ کپڑے دکھا دے اور اسے بتائے کہ جیل بھیا اس کے لئے دے گئے ہیں، مگر کس لئے، وہ اس کا کیا جواب دے گی۔ اسے بھی سے ڈر لگتا تھا۔ شادی میں صرف پندرہ دن رہ گئے تھے۔

شام کو بڑے بچا دلی سے آ گئے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ جیل بھیا فوج میں چلے گئے ہیں تو ایک دم بلبل اٹھے۔ ”ارے اس ملائی سے اور کیا ہو سکتا تھا، انگریزوں کی مدد کر کے ہی تو پاکستان بنائے گا، یہ سب انگریزوں کے پٹو ہیں۔“

”تو کیا اللہ مارے کافروں کا ساتھ دیتا؟“ اماں نے فوراً جواب دیا اور بڑے بچا سر جھکا کر رہ گئے۔

”آپ کپڑے وغیرہ تو بدل ڈالنے بڑے بچا، ستر سے تھک گئے ہوں گے، ذرا دیر آرام کر لیجئے۔“ عالیہ نے باتوں کا رخ بدلنا چاہا۔ بڑے بچا کا تھکا ہوا چہرہ دیکھ کر اس کا دل مل رہا تھا۔ اتنے دن بعد وہ گھر آئے ہیں تو اب انہیں آرام کی ضرورت ہے۔

کریمین بوا چائے تیار کر رہی تھیں اور بڑی بچی ان کے بکس سے کپڑے نکال رہی تھیں۔ عالیہ ان کا سامان اٹھا کر کمرے میں رکھ آئی۔

بڑے بچا کپڑے تبدیل کرنے کے بعد بڑی بچی کے کمرے میں مسمری پر لیٹ گئے، شاید وہ اتنے تھک گئے تھے کہ بیٹھک تک جانے کو بھی جی نہ چاہا تھا۔ کریمین بوا نے سر ہانے رکھی ہوئی تپائی پر لائین رکھ دی۔ عالیہ ان کے پاس بیٹھ کر سرد ہانے لگی۔

”مجھے ڈر لگتا ہے، یہ لی لگی لوک بائٹ نہ دیں۔“ بڑے بچا نے دکھ سے کہا۔ ”ہاں ڈر تو مجھے بھی ہے۔“ اس نے بڑے بچا کا دل رکھنے کے لئے ہاں میں ہاں ملائی۔

”تم نے دیکھا، جیل فوج میں چلا گیا، یہ میری اولاد ہے۔“

”بہت برا کیا بڑے بچا۔“ وہ ہن میں ہاں ملائے جا رہی تھی۔ وہ ان سے یہ

”یہ زمانے بھی آگئے کہ بھکاری لڑکے بیبیوں کے پاس بیٹھ کر گانے گائیں
— والہن کی خراب کے کنڈے میں لالہین لٹکاتے ہوئے کریمین ہوا بڑا بڑا رہی
تھیں۔“

”کریمین ہوا ایک پیالی چائے بنا لاؤ‘ پڑھتے پڑھتے سر دکھنے لگا ہے۔“ کھڑکی
سے جھانک کر مجھ پھوپھی نے حکم دیا اور کریمین ہوا چولے کی طرف سرک گئیں۔
عالیہ نے مجھ پھوپھی کی طرف دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ ہر وقت انگریزی کی
مومن مومن کتابیں پڑھ پڑھ کر مجھ پھوپھی کی آنکھوں میں کیسے گھرے حلقے پڑ گئے
ہیں۔ آخر یہ کس کے لئے پڑھتی ہیں‘ یہ سب کس کام آتا ہے‘ یہ سب اس لئے
ہے کہ صحیح انگریزی بولنے پر فخر کر سکیں۔

اب اندھیرا چھانے لگا تھا اور صحن میں پڑی ہوئی لوہے کی کرسی اس
اندھیرے میں ڈوبتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ — مجل بھیا کا سفر ختم ہو گیا ہو گا کہ
نہیں؟ عالیہ کو بار بار خیال آ رہا تھا۔

”کریمین ہوا‘ پرکاش بابو آئے ہیں‘ بڑے بھیا کو بتا دو۔“ بیٹھک سے اسرار
میاں کی آواز آئی۔

”نہیں کوئی آرام بھی نہیں کرنے دیتا‘ سو رہے ہیں‘ وہ اس وقت نہیں
آئیں گے۔“ کریمین ہوا نے جھلا کر جواب دیا‘ مگر بڑے چچا تو جیسے اسرار میاں کی
آواز کے منتظر تھے۔

کس طرح پوچھ سکتی تھی‘ کہ اگر مجل بھیا جنگ پر نہ جاتے تو پھر ان بیٹیوں کی بھئی کو
کیسے سرد کیا جاتا۔
”منظر کا خط آیا؟“

”ادھر کچھ دنوں سے نہیں آیا۔“ وہ ایک دم رنجیدہ ہو گئی۔ اسے اب اسے
خط کا کتنا انتظار تھا۔ وہ ساری کے پلو کو اس طرح مروڑنے لگی کہ جھر سے ہو گیا
— ”بت پرانی ہو گئی ہے۔“ وہ شرمندہ ہو کر رہی۔

”ارے ہاں تمہارے کپڑے تو اب بت پرانے ہو گئے ہوں گے‘ نئے
کپڑے بننے بھی تو نہیں۔“ وہ بھی شرمندہ سی رہی تھی۔

”ابھی تو میرے پاس کئی نئے جوڑے رکھے ہیں۔“ وہ صاف جھوٹ بول
گئی۔ جانے کیوں وہ بڑے چچا کو ایک لمحے کے لئے بھی شرمندہ دیکھنے کو تیار نہ
تھی۔

بڑے چچا جانے کیا سوچنے لگے اور پھر انہوں نے اس طرح آنکھیں بند کر
لیں جیسے سو رہے ہوں۔ عالیہ دبے قدموں برآمدے میں آگئی۔ کمرے میں کتنی
جلدی رات ہو گئی تھی مگر باہر تو ابھی مغرب کا وقت بھی نہ ہوا تھا۔ کریمین ہوا
لاٹینوں کی چٹنیاں صاف کر رہی تھیں اور بھی محن میں کرسی پر بیٹھی دس بارہ
سال کے ایک بھکاری لڑکے کو باسی روٹی کھلا رہی تھی۔ — ”یہ بت اچھا لگتا ہے
بچیا‘ میں نے زینت کی ماں کے گھر گاتے سنا تھا۔“ عالیہ کو دیکھتے ہی بھی نے
تعارف کرایا۔ ”بس اب گاؤ۔“ بھی نے حکم دیا۔ فیض کے دامن سے ہاتھ منہ
صاف کرنے کے بعد لڑکا آنکھیں بند کر کے گانے لگا۔

چڑیوں نے باغ اجاڑا‘ پتہ پتہ چک دارا

عالیہ کو اس کی آواز بڑی اچھی لگی۔ وہ بڑے شوق سے سن رہی تھی مگر
بھی کو جانے کیا ہوا کہ اچانک سسکیاں بھرتی اپنے کمرے میں بھاگ گئی اور لڑکا
گھبرا کر سب کی طرف دیکھنے لگا‘ پھر بیک کی پونٹلی سمیت کڑوا ڈرا سا بھاگ نکلا۔
بس عالیہ پریشان کھڑی رہ گئی۔ بھی دیوانی نے اس گانے سے کون سے روئے کے
پلو تلاش کر لئے‘ مگر اس نے دیکھا کہ بڑی چچی بھی تو آنسو پونچھ رہی تھی۔

تمہارے بچے سخت شریر ہیں، انہیں خوب پڑھانا، کم از کم انگلش میں ایم اے ضرور اکرانا۔“

”ضرور پڑھاؤں گی نجمہ پھوپھی۔“ سادہ آپا کا منہ لٹک گیا اور نجمہ پھوپھی اوپر اپنے گوشہ عافیت میں چلی گئیں۔ عالیہ تخت پر بیٹھی سارے مکالے سن سن کر کڑھتی رہ گئی۔

جب سے سادہ آپا آنی تھیں کریمین بوا بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ بچوں نے سارے گھر میں تھمکے مچا رکھا تھا اور کریمین بوا نہال ہو ہو کر ایک کے گنڈے ہاتھ دھلاتیں تو دوسرے کا منہ اور تیسرے کو ہلانے کے لئے روٹی کا ٹکڑا پکڑا دیتیں۔

شام کو بوے چچا گھر آئے تو اپنی بیٹی کے پاس تک گئے۔ وہ بوے چاؤ سے باتیں کر رہے تھے کہ ہمچی کو ایک دم جوش آگیا۔ ساری بنییدگی فرق ہو گئی اور وہ بچوں کو جمع کر کے نعرے لگانے لگی۔ ”مسلم لیگ زندہ باد“ بن کے رہے گا پاکستان، وحیاء راج نہیں ہوگا، پٹیا راج نہیں ہوگا۔“

بچے ہمچی کے گرد جمع ہو کر ساتھ دے رہے تھے۔ بوے چچا چپکے سے بیٹھک میں سرک گئے۔

”اللہ کی مار ہے ان منحوس نعروں پر“ ادھر آؤ تم سب، خبردار جو شور مچایا۔ شادی کا گھراور یہ نعرے؟“ سادہ آپا نے اپنے بچوں کو کھینچ کھینچ کر بٹھانا شروع کر دیا۔

”بھئی کس کی شادی ہو رہی ہے؟“ ہمچی فاتحانہ غمی ہنس رہی تھی۔
 ”تمہاری اور کس کی۔“ اماں نے جل کر جواب دیا اور سب نے گھبرا کر ہمچی کی طرف دیکھا۔ عالیہ کو اپنے روٹنے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ہمچی نے سب کو حیران سی نظروں سے دیکھا اور سر جھکائے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بڑی چچی نے اطمینان کی لمبی سانس لی۔ ہمچی سے کیسی کیسی تو قعات وابستہ تھیں مگر اس نے تو اب بھی ہمیں کی سب کی تو قعات کو ٹھکرا کر سر جھکا دیا۔
 ”لوکی ذات کیسی ہی شریر کیوں نہ ہو مگر ہوتی اللہ میاں کی گائے ہے۔ جدھر

شادی سے چار دن پہلے سادہ آپا اپنے چار عدو تلے اوپر بچوں کے ساتھ آ گئیں۔ بڑی چچی مدت سے چھڑی ہوئی بیٹی کو گلے لگا کر دیر تک روتی رہیں اور پھر ساری موٹی موٹی خیریں سنا ڈالیں۔ ٹکیلیں کا بھاگ جانا، جمیل بھیا فوج میں جانا اور ہمچی سے شادی کی خبر کا چھپانا، اتنی بہت سی دردناک خبروں کو سن کر سادہ آپا کا رنگ پتلا ہو گیا تھا اور بھائیوں کی جدائی کے غم میں وہ دیر تک سر نہوڑائے بیٹھی رہیں۔

عالیہ نے اماں کی زبانی سنا تھا کہ سادہ آپا خوبصورت ہیں مگر اب وہ دیکھ رہی تھی کہ مبینہ حسن کا کس دور دور نشان نہ تھا۔ پڑیوں کا ڈھیر تھا جس پر سفید کھال منڈھی ہوئی تھی۔ وہ عالیہ سے اس قدر پیار سے پیش آ رہی تھیں کہ اسے بار بار اپنی تمینہ آپا یاد آ رہی تھیں۔

سادہ آپا کے آنے پر نجمہ پھوپھی کو بھی ان سے ملنے کے لئے پیچھے اترنا پڑا۔ وہ ان سے گلے ملنے کے بجائے الگ ہی کھڑی رہیں۔ ”تمہاری صحت بہتر خراب ہو رہی ہے سادہ۔“ نجمہ پھوپھی نے انہیں غور سے دیکھ کر کہا۔
 ”بچوں نے تنگ کر رکھا ہے نجمہ پھوپھی، اوپر سے گھر کے ڈھیروں کام، دو دو بھینسوں کی دیکھ بھال۔“

”تو تمہارے میاں مل جلاتے ہیں؟“ نجمہ پھوپھی نے حقارت سے پوچھا۔

”جی ہاں نجمہ پھوپھی۔“

”کتنا پڑھے ہیں؟“

”دس درے نجمہ پھوپھی۔“ سادہ آپا نے فخریہ جواب دیا۔

”بس پھر ٹھیک ہی ہے، اتنا پڑھ کر اور کیا کر سکتا ہے بچا اور“ اور سادہ

چاہو ہنگامہ دو ہوں نہیں کرتی۔“ بڑی چچی آنسو پونچھے لگیں۔

ذرا دیر بعد عالیہ بھی کے کمرے میں گئی تو وہ اپنے بستر پر پڑی جا نے سن خیلوں میں گم تھی۔

”آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا بچیا؟“ ممی نے بیٹکی بیٹکی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”خیر کوئی بات نہیں“ جب سے ساجدہ آپا آئی تھیں“ ان کے روپ میں میں اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔“

”ارے بابا میں نے تو صرف اس لئے نہیں بتایا کہ تم شرابا کر کے میں چھپ رہو گی۔ مجھے ایسی شرم ہے چڑھے“ آج تمہارے مہندی لگے گی۔ تم مانیوں بٹھائی جاؤ گی، بس آج سے شرم شروع کر دو۔“

”اچھا!“ ممی اسے وحشیوں کی طرح تک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ذرا بھی شرم نہ تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے کی دہلیز پر اکڑوں بیٹھ گئی اور عالیہ کو تنہا آپا یاد آگئیں۔ ڈھیروں غدا شات نے اسے ہلکا کر رکھ دیا۔ اری ممی تو بھی کیسے پاؤں نہ ہو جاتا۔ اس نے سوچا کہ ان دونوں وہ ممی کا سایہ بن جائے گی۔ وہ ممی کو کچھ بھی نہ کرنے دے گی۔

عالیہ بھی ممی کے قریب تک گئی۔ شام دے قدموں چلی آ رہی تھی۔ ممی لٹی پٹی دیران بیٹھی تھی، سب مصروف تھے۔ بچے شور مچا رہے تھے، کریمین ہوا وزیر آباد کی مہندی پیں رہی تھیں مگر عالیہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ بیٹا نے بن باس میں شاید ایسی ہی شاہیں گزاری ہوں گی، ہائے یہ مہندی کی سسل سے ایک چھوٹا سا گلابی ہاتھ کیوں ابھر رہا ہے۔ عالیہ نے کھرا کر اپنا منہ چھپا لیا اور پھر ممی کو لپٹا کر اس طرح بیٹھ گئی جیسے وہ ہاتھ ممی کو کھینچنے لئے جا رہا تھا۔

مغرب کے بعد اسرار میاں میراٹوں کو بلا لائے۔ محن میں ان کی کرسٹ اور کھٹکتی ہوئی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ عالیہ کے پاس سے اٹھ کر محن میں آ گئی۔ ماضی کی تلخ یادوں کا عذاب اس پر نازل ہو کر گزر چکا تھا۔

”دلن کی بن چوے“ دلن کی چچی چوے۔“ عالیہ کو دیکھ کر میراٹوں

لے دعائیں دینی شروع کر دیں۔

چوکی پر بیٹھی ہوئی ساجدہ آپا قہال میں مہندی سجا رہی تھیں۔ اماں اور ہوی چچی والانا سے جیزس سرکا سرکا کر مانگے گی درہی پھواری تھیں اور ساجدہ آپا کے بچے مہندی لے بھاگنے کی ناک میں ارد گرد مٹھلا رہے تھے۔ عالیہ تھوڑی دیر تک کڑی تلاش دیکھتی رہی اور پھر ممی کے پاس آگئی۔ وہ کس قدر اجنبیوں کی طرح مسہری سے پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔

”بچیا جب میں چلی جاؤں گی تو پھر اس کمرے میں کون رہے گا؟“ ممی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

”میں رہ لوں گی“ روز اسے صاف بھی کر دیا کروں گی اور جب تم آیا کرو گی تو پھر تمہارا کمرہ چھوڑ کر بھاگ جایا کروں گی۔“

ممی ایک دم اٹھی اور کھوٹی پر لٹکا ہوا میلا جہر اتار کر مسراں اور میز کرسی صاف کرنے لگی۔ عالیہ خاموش بیٹھی دیکھتی رہی۔ انسان کو اپنی جگہ سے کتنی محبت ہوتی ہے، مگر اس کا تو کوئی ٹھکانا نہیں۔ وہ کسی جگہ کو اپنا نہیں کہہ سکتی۔

صفائی کرنے کے بعد ممی بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ سے منہ چھپا کر سسکے لگی۔ عالیہ نے اسے لپٹا لیا۔ ”یہ کیا ہے وقوفی ہے“ ممی، ایک دن سب کی شادی ہوتی ہے۔“

”ٹھیک ہے عالیہ بچیا، مگر میری شادی ہو جائے گی اور کسی کو خبر بھی نہ ہو گی۔“ ممی برابر روئے جا رہی تھی۔

”تم نے مجھ سے کہا ہو تا تو منظور کے سلسلے میں بات کرتی، مگر اس نے بھی تو پیغام نہیں دیا“ ممی، پھر وہ بے مروت تم کو چھوڑ کر جنگ پر چلا گیا“ اب اسے کیوں یاد کرتی ہو ممی۔“

ممی نے اسے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ عالیہ بچکانہ نہ سکی۔ ان نظروں کے سامنے اس کا علم اور بھجوا ہوا دے گئی۔ ”کیا بات ہے ممی؟“ اس نے اچھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں بچیا۔“ آنسو پونچھ کر وہ ہنسنے لگی۔

”یہ گیس کا ہنڈا اندر لے جاؤ کریمین ہوا اور اگر سب نے چائے پی لی ہو تو“ — بیٹھک سے اسرار میاں کی آواز آئی تو عالیہ کا جی دکھ گیا۔ آج تو کریمین ہوا کا بے کو چائے دینے لگیں۔

”کبھی تو چائے بھول بھی جایا کرو اسرار میاں، آج ایک گلاس پانی پی لو۔“ کریمین ہوا جواب دیتے ہوئے ہنس رہی تھیں اور میرا شیں ان کا ساتھ دے رہی تھیں۔ ارے یہ اسرار میاں اتنے عالم آشکارا راز ہیں۔ عالیہ کا جی چاہا کہ جا کر سب کے منہ نوچ لے۔

بڑی چچی، ساجدہ آپا اور اماں مندی کا تھال اور پیلا جوڑا لے اندر آگئیں تو ہمیں نے سر جھکا کر دوپٹے میں منہ چھپا لیا۔ رسم کے مطابق یہ جوڑا اور مندی سرسرا والوں کو لے کر آنا چاہئے تھا، لیکن ایسا نہ ہوا، کون آنا اتنی دور سے۔

صدر دروازے پر بھٹکا لڑکے کے گانے کی آواز آرہی تھی۔ چڑیوں نے باغ اجاڑا — ”بھاگ جا، منخوس کہیں کا، بھاگ جا۔“ کریمین ہوا دھاڑ رہی تھیں۔

چادر کی آڑ میں چھپ کر ہمیں نے پیلا جوڑا پہن لیا اور ساجدہ آپا نے اس کے ہاتھوں میں مندی لگا کر اپنے آئینہ پوچھ لے۔

باقی جھولیں سرسردہ دجا — میرا شیں نے گانا شروع کر دیا اور عالیہ کو خیال آیا کہ اس نے ساجدہ آپا سے ہمیں کی سرسرا لے کے لئے تو کچھ پوچھا ہی نہیں۔

مندی لگا کر سب باہر چلے گئے۔ ہمیں نے پھر بھی نظریں نہ اٹھائیں ”پہیل بھیا تمہارے جیز کے لئے ایک بڑا خوبصورت جوڑا بنا گئے ہیں“ — عالیہ نے اطلاع دی۔

”اچھا۔“ ہمیں نے بڑی بے اعتنائی سے اس کی طرف دیکھا اور مندی کریدنے لگی۔

”اڑیا پے چور بھو جی دیا تو جلاؤ۔“ میرا شیں بہت جوش سے گائے چلے جا رہی تھیں۔ رسم سونی سونی دیکھ کر میرا شیں مانجھے کے گیتوں کے بجائے گراموفون ریکارڈوں کے چلنے ہوئے گانے گانے لگیں۔

”ہمیں تم مجھے اپنی سرسرا بلاؤ گی نا۔“ عالیہ اسے بھلانے کے لئے برابر ہاتھیں کئے جارہی تھی۔

”دیکھئے کس حسن سے پوشیدہ غم کا راز ہے
تمہیرے دل میں ہے پردے میں تیرا انداز ہے“
میرا شیں اب قوالی پر ادھار کھا بیٹھی تھیں۔

”مجھے کیا معلوم!“ ہمیں نے آہستہ سے جواب دیا۔

”اچھا تو تم مجھے نہیں بلاؤ گی، بس معلوم ہو گئی تمہاری محبت۔“ عالیہ بن کر روئی مگر ہمیں تو پیسے کچھ سن ہی نہ رہی تھی۔

”آنے والے جلد آؤ آخری آواز ہے۔“ میرا شیں گاتے گاتے چپ ہو گئیں۔ ہمیں یوں ہی غالی غالی نظروں سے کرے میں ادھر ادھر دیکھے جارہی تھی۔
”آنے والے جلد آؤ آخری آواز ہے۔“ دیکھئے دیکھئے ہمیں منگٹانے لگی۔
”تمہیں یہ قوالی اتنی پسند کیوں ہے ہمیں؟“ عالیہ نے جیسے پھر کر پوچھا۔

”واہ میں کسی کو بلا توڑی رہی ہوں۔“ ہمیں نے بھی ہنسنے سے جواب دیا۔
عالیہ کا جی چاہا کہ ہمیں کو پیٹ کر رکھ دے۔ اور آنے والا نہ آئے تو انیوں کھانو بگی، مرچاؤ اور اسے دنیا کے سینے پر درانے کے لئے چھوڑ کر قبر میں جا رہو۔

بڑی دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے سے نہ بولیں اور جب میرا شیں کا گبا کر چلی گئیں تو ہمیں اپنے بسز پر لٹ گئی۔ ”آپ اوپر اپنے کمرے میں جا کر سو رہیں، خواہ خواہ اتنی دیر سے بیٹھی ہیں۔“ آنکھیں بند کئے کئے ہمیں نے اکڑپن سے کہا۔

”میں تو تمہیں تمہارے پاس لپیوں گی۔“ عالیہ نے اسے پیار سے لپٹا لیا۔
خواہ خواہ ہمیں سے یوں بات کی ویسے ہی بیچاری کا دل ٹوٹا ہوا ہے۔

پرسوں برات آرہی تھی مگر ہمیں کے ابا ابھی تک نہیں آئے تھے، ادھر بڑے لچکا اپنے کاموں سے فرمت نہ لٹی۔ کریمین ہوا سخت فکر مند ہو رہی تھیں۔
”اب کیا اسرار میاں برات کی آؤ بھگت کریں گے، اگر انہیں پتہ چل گیا کہ یہ کون ہے تو کیا کہیں گے دل میں، آخر تو انہیں بھی معلوم ہی ہو جائے گا۔“ ہ۔

برابر بیڑائے جا رہی تھیں۔ عالیہ ان کی باتیں سن سن کر جل رہی تھی اور اگر انہیں نہ معلوم ہو تو تم بتا دیتا کریں ہوا۔ تم تو اسرار میاں کا ڈنکا ہو۔

صبح سے بڑی گھما گھمی تھی۔ شام کو چار بجے برات آ رہی تھی۔ عالیہ نے کریمین ہوا کے ساتھ مل کر بیٹھک صاف کرا دی تھی۔ دولہا کے بٹھانے کے لئے تخت کی چاندنی اور گاؤں کے گائیکے کا غلاف بدل دیا گیا تھا۔ باہر اسرار میاں انتظام کرتے پھر رہے تھے۔ اسکول کے میدان کو ایک دن کے لئے ناگ لیا گیا تھا۔ شامیائے لگ پکے تھے اور بلاؤں زدے کی دھمکیاں لکڑی رہی تھیں۔

دو بجے کے قریب عالیہ تھک کر اماں کے پاس تخت پر ٹک گئی۔ میرا شیں بڑے زور شور سے جا رہی تھیں۔ ”آیا رہی ہوا لانا۔“ اماں اور بڑی چچی مہمان عورتوں کو پاؤں تباہ کر رہی تھیں۔ اپنے بچوں کو نئے کپڑے پتار رہی تھیں اور کریمین ہوا آج روٹی باغی کی فکر سے آزاد ہو کر ادھر ادھر چٹکن پھر رہی تھیں۔ ”مالک کے زمانے میں تو دس دن تک گھر کے باہر بھرا ہوا تھا۔ سب سے اچھی رعایاں آتی تھیں۔ گھر میں مہینہ مہینہ پہلے میرا شیں دھول لے کر بیٹھ جاتی تھیں اور جب گھر سے جاتیں تو ان کی جھولیاں روپوں سے بھری ہوتیں، واہ کیا زمانے تھے۔“

اتنی گھما گھمی کے باوجود عالیہ کو لوہے کی کرسی بڑی تھا اور اس لگ رہی تھی۔ وہ آج بھی پہلے کی طرح صحن میں پڑی تھی۔ سادہ آبا کے بچوں نے نیچے پاؤں رکھ رکھ کر اسے مٹی سے لیس دیا تھا۔ عالیہ جب بھی کے پاس جاتے مٹی تو جاتے کس جذبے کے تحت کرسی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ ساری کے پلو سے اس کی مٹی پونجی اور چلی گئی۔

”ابا نہیں آئے بچیا۔“ بھی نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا اور مہندی سے رچا ہوا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”نہیں آئے بھی، وہ تو تیار ہیں، کھانے وغیرہ کے لئے دو سو روپے اور بھجوا دیئے ہیں۔“ عالیہ جھوٹ بول رہی تھی۔

”شاید وہ بھجوا رہے موت کی بیماری میں مبتلا ہوں گے۔“ بھی نے نفرت سے

ہر طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

عالیہ خاموش رہی، بھلا وہ کتنی بھی کیا۔ بھلا جھوٹے کے پاؤں ہوتے ہیں۔ ظفر چچا اگر آئی جاتے تو کیا بگڑ جاتا۔ مگر وہ کیوں آتے، ان کے آرام میں خلل پڑ جاتا۔ وہ اپنی حیدر آباد کی جنت سے کیوں نکلتے۔

برات آنے میں اب تھوڑی دیر رہ گئی تھی۔ اس نے بھی کو غور سے دیکھا۔ وہ شرماٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ بھی کے چہرے سے اسے کسی قسم کا غصہ نظر نہ آ رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ اسے بھی تیار ہونا تھا۔

”کریمین ہوا، ذرا میری ایک بات سن لو کریمین ہوا۔“ اسرار میاں کی آواز آئے جا رہی تھی مگر کریمین ہوا تو سہری ہو گئی تھیں۔ ورنہ کیا آج کے مبارک دن بھی وہ اسرار میاں کے کام کرتیں۔ عالیہ نے ہمت کر کے اسرار میاں کو جواب دے ہی دیا۔

”یہ کپڑے بھی بیٹا کے لئے خریدے ہیں، انہیں میری طرف سے دے دینا، اور کچھ نہ کر سکا۔“ اسرار میاں کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی اور بڑھا ہوا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ کریمین ہوا کی ساعت فوراً تیز ہو گئی۔ ”یہ آپ کا کام نہیں عالیہ بیٹا۔“ انہوں نے عالیہ کے ہاتھ سے بٹول لے لیا۔

اماں اور بڑی چچی کپڑے دیکھ رہی تھیں۔ ”واہ کتنے اچھے کپڑے ہیں، یہ اسرار میاں نے بھی کو دیئے ہیں۔“ عالیہ نے فخریہ کہا۔

”اسرار میاں نے؟ واہ خوب رہی، پرانے مال پر یا حسین۔“ کریمین ہوا جھلجا اٹھیں۔ ”زمانے کے بات ہے، اسرار میاں اس گھر کی بیٹیوں کو جوڑے دیں، ماکن کو خدا جنت نصیب کرے۔ اسرار میاں کی ماں کو اپنے پرانے کپڑے دیا کرتی تھیں۔“

”چلو اب تو کپڑے آئی گئے، یہ جوڑا بڑے بھیا کی طرف سے ہو جائے گا۔“ آخر تو انہیں کی دکان سے پیسے کاٹ کاٹ کر بنایا ہو گا۔ اماں نے فوراً فیصلہ کر دیا۔

”ٹھیک ہے چھوٹی لہسن۔“ کریمین ہوا نے اطمینان کی سانس لی۔

یو مارے دکھ کے رو رہی تھیں۔

ممی نے اتنی آسانی سے ”ہوں“ کر دی کہ عالیہ حیران رہ گئی۔ اسے تو محسوس ہو رہا تھا کہ قیامت تک براتی یوں ہی دروازے پر پڑے رہیں گے۔ ہوں سننے والے گواہوں پر صدیاں گزر جائیں گی اور چادر کے پردے کو آندھیاں بھی نہ ہٹائیں گی۔

گواہ واپس چلے گئے، میراثیں مبارک بادیاں گا رہی تھیں۔

ہو مبارک تری سرال سے آیا سرا

اور عالیہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گانے کی آوازیں کہیں کوسوں دور سے

آ رہی ہیں۔

سادہ آبانے ممی کو سرخ جوڑا پہنا کر ذرا سی دیر میں دلن بنا دیا۔ عالیہ انگ بیٹھی رہی، جیسے وہ مطلوب ہو گئی ہو۔

جب سب لوگ کمرے سے چلے گئے تو عالیہ نے ممی کی مھو تکلف الٹ دی۔ کیا بچ وہ اتنی ہی خوب صورت تھی! — ”شادی ہونی تھی سو ہو مئی، کھیل ختم پیہ ہضم۔“ ممی نے آنکھیں کھول کر دھیرے سے کہا۔ عالیہ کچھ نہ بولی۔ یہ بھی کیسی کیفیت ہوتی ہے کہ بعض وقت کتنے سننے کے لیے کچھ رہ ہی نہیں جاتا۔

عالیہ خاموشی سے باہر چلی گئی۔ گیس کی دودھیا روشنی میں ممی کی سرال والیاں چاندنی پر بڑے ٹھسے سے بیٹھی تھیں۔ پان پر پان کھائے جا رہے تھے۔ بار بار تریبا کو چھانکی جا رہی تھی اور ان سب کے بیچ میں نجمہ پھوپھی اپنے وقت کی ہیروئن بنی بیٹھی تھیں۔ — ”کتا پڑھا ہے دولہا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”آٹھ دے“ اسے پڑھنے کی کیا ضرورت، میں نیچے زمین ہے، دو بھینسیں ہیں، اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔“ ممی کی ساس نے غرور سے بتایا۔

”ٹھیک ہے،“ ممی کے لیے اور کیا چاہیے۔“ نجمہ پھوپھی ان دیہاتی جاہل عورتوں کو بڑی حقارت سے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

ایک میراثن ممی کو گود میں اٹھا کر باہر لے آئی تو سرال والیوں میں ہڑبوک بچ گئی۔ سب ممی پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ باہر سے دولہا اپنے شہ بالے کے

عالیہ نے کپڑوں کو اس طرح اٹھالیا جیسے وہ کوئی بڑی جبرک چیز چھو رہی ہو۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ زور زور سے غصے، سب کو بتا دے کہ یہ کپڑے اسرار میاں نے بھجوائے ہیں، یہ ان کی محبت اور شرافت کا تحفہ ہے مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اس نے دھیرے سے کپڑے ہلکے رکھ دیئے اور اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

نجمہ پھوپھی اپنے کمرے میں بیٹھی ایک اپ کر رہی تھیں۔ اس وقت زردوزی سے لٹی ہوئی ساری پہنے تھیں اور سخت بیزار نظر آ رہی تھیں۔ اب تک انہوں نے کسی کام میں حصہ نہ لیا تھا مگر آج ممی کو رخصت کرنے کے لئے جیسے مجبور ہو گئی ہیں۔

ساری بدل کر عالیہ بھر نیچے آ گئی۔ دھوپ بیکلی پڑ کر دیواروں پر چڑھ گئی تھی۔ سب برات کے منتظر تھے۔ وہ ممی کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

برات آنے کا شور مچا تو ممی کا رنگ فق پڑ گیا۔

”بجیا!“ جیسے کسی چیز سے ڈر کر اس نے پکارا۔

”کیا ہے ممی؟“ اس نے ممی کو لپٹا لیا۔

”کچھ بھی نہیں“ آپ میرے پاس سے ہٹنے کا نہیں، جی گھبرا آ ہے۔“

”میں کہیں نہیں جا رہی ممی۔“ وہ کانپتی ہوئی ممی کو لپٹائے بیٹھی تھی مگر اسے کیا ہو رہا تھا۔ وہ تو خود بھی کانپ رہی تھی۔

اماں، بڑی چچی، ساجدہ آپا اور کریمین ہوا، سب کمرے میں آ گئے۔ کریمین ہوا کے ہاتھوں میں تھال تھا جس میں سرال سے آیا ہوا نکاح کا جوڑا، زیور اور سرا سجا ہوا تھا۔

”سب لوگ پردہ کر لو نکاح کے لیے آرہے ہیں۔“ اسرار میاں کی آواز آئی، تو کریمین ہوا نے چادر تان کر پردہ کر دیا اور سب اس کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔

”آج کے دن تو بڑے میاں گھر میں رجے، اپنی بیٹی کا نکاح تو دھواتے۔ خدا کی قدرت اسرار میاں نکاح پڑھوائے آئیں، اللہ نصیب اچھے کرنا۔“ کریمین

ساتھ آگیا۔ اگلے ہوئے سرے سے اس کا عیث دیمائی کے رنگ کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔

عالیہ کا جی چاہا کہ اپنا منہ چھپالے۔ یہ بھی کا دولہا ہے۔ بھی جو پہلے جیل بھیا کو چاہتی تھی اور پھر منکھور کو پسند کر کے مارے فخر کے پھولے نہ ساتی تھی۔ بدلے میں اسے بس یہی کچھ ملا ہے۔

میرا شیں آرسی مصحف کی رسم ادا کرنے لگیں تو بھی نے اس طرح دولہا کو دیکھا کہ میرا شیں دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ گئیں۔

کھانا کھانے کے بعد بھی کی رخصتی کا سامان شروع ہو گیا۔ مٹی میں کھڑے ہوئے ناگوں پر جیز کا سامان لاوا جارہا تھا اور میرا شیں بڑی رقت سے گاہی تھیں۔ ”بھائیوں کو دنیا محل دو محلے ہم کو دیا پر دیں رے، لکھیا باہل مورے“ بڑی چچی اور کریمین بوا رہی تھیں۔ اماں سر جھکائے جانے کیا سوچ رہی تھیں اور نجر پھو بھی بڑی بیزاری سے جابلوں کی محفل کے خاتے کا انتظار کر رہی تھیں۔

”ہائے بھیا“ بڑے چچا کو اتنا اچھا دولہا کہاں سے مل گیا؟“ بھی نے عالیہ کی گود میں سر رکھ کر دھیرے دھیرے سسکتے ہوئے کہا۔ عالیہ نے اسے لپٹا کر کچھ کتنا چاہا مگر اسے ملت نہ ملی اور وہ اتنا اچھا دولہا میرا شوں کے قہقروں کے سچ میں بھی کو اٹھا کر پردہ لگے تاکہ پر بٹھا آئے۔ عالیہ نے اپنی جگہ گلے میں گھونٹ لی۔

رزا دینا کو لے گیا۔ جیل بھیا کاش تم ہی رام بن سکتے۔

بھی کے جانے کے بعد گھر بالکل ویران بن گیا تھا۔ مسلم لیگ اور کانگرس پارٹیاں اس گھر سے رخصت ہو گئی تھیں۔ کوئی کسی کو نہ چھیڑتا۔ سب گھر سے ہوئے تلاب کی طرح پرسکون تھے۔ بڑے بچا مزے سے گھر میں آتے اور چلے جاتے۔ اب جھنک کے دروازے بند کرنے کی کوئی ضرورت نہ پڑتی۔ کم بخت کافر کانگریسیوں کے خلاف کوئی نعرہ نہ گونجتا۔ بڑی چچی سر شام ہی برآمدے کے پردے مگر اکرتخت پر بیٹھ رہتیں۔ مٹی کی کنڈالی میں کونے دیکتے رہتے۔ اماں اور بڑی چچی ہاتھ سینک سینک کر جانے کیا سوچا کرتیں۔ کوئی بھی کی باتیں نہ کرتا۔ کسی کو اس کے خلا انتظار نہ تھا۔ بھی جیسے بھی اس گھر میں رہی نہ تھی۔

”آج کل گھر کی حالت اچھی ہو رہی تھی۔ جیل بھیا کی تنخواہ نے چولہے میں ذرا سی جان ڈال دی تھی اور کریمین بوا مارے مصروفیت کے گزرے ہوئے وقت کو کم ہی یاد کرتیں۔ انہیں تو اب یہ دکھ کہا رہا تھا کہ بڑے چچا اپنی ہانڈی الگ پکواتے تھے۔ انہوں نے بڑی صفائی سے انکار کر دیا تھا کہ وہ جیل بھیا کی کمائی کا ایک پیسہ بھی اپنے ادب خرچ نہ ہونے دیں گے۔ جیل بھیا نے یہ ملازمت کر کے اگھر بڑوں کا ساتھ دیا تھا۔“ مجھے پتہ نہیں تھا کہ یہ جیل، میری اولاد، میری دشمن ہوگی۔“ بڑے چچا نے کئی بار عالیہ سے کہا تھا اور وہ چچا کی بے قراری دیکھ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ گھنٹوں سوچتی رہتی کہ انسان کے مقاصد میں اتنی دھار کہاں سے آجاتی ہے کہ سارے رشتوں ناطوں کو کاٹ کر پینک دیتی ہے۔ بڑے چچا نے کسی کے باپ ہیں، نہ چچا، نہ شوہر، اسی لیے بھی راون کے ساتھ لٹکا چلی گئی۔ سادہ آپا اپنے خاندان کی ساری بڑائی اور ساری امارت کو گوبر میں ملا کر اسٹپے تھاپ رہی ہیں۔ ٹکلیل بھاگ گیا اور جیل بھیا ماستا کی آگ بھڑکا کر فاشنزم کی آگ

بجھانے چلے گئے۔

خست سردی ہو رہی تھی۔ عالیہ چھت پر دھوپ میں پڑی یا تو بڑے بچا کی لائبریری سے نکالی ہوئی کتابوں سے جی بسلاتی یا پھر آوارہ روح کی طرح بھٹکتی پھرتی۔ اماں اپنے آپ میں گمن رہتیں۔ ماسوں کے لمبے چوڑے محبت میں ڈوبے ہوئے خط آتے رہتے۔ وہ ان خطوں کو حتی الامکان نہ پڑھتی۔ اس نے اماں سے اگلے سال علی گڑھ جانے کی بات بھی نہ کی تھی، پھر بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ ضرور جائے گی۔

کبھی کبھار ابا کا خط بھی آجاتا، جسے پڑھ کر وہ نئی زندگی محسوس کرتی اور بڑی بے قراری سے ان کی رہائی کے دن گنتے لگتی۔

خالی وقت کیسے گئے؟ وہ کس سے بولے، کس سے بات کرے؟ عالیہ کبھی کبھی تو اتنی الجھن محسوس کرتی کہ رو پڑتی۔ کاش نجمہ پھوپھی ہی اسے بات کرنے لائن سمجھ لیں۔ مگر اس نے تو بی اے میں بھی اردو ہی لی تھی، اس لیے وہ بالکل جاہل تھی ان کی نظر میں۔

رات بھر ہلکی ہلکی بارش ہوتی رہی اور بادل اتنے زور سے گرجتے رہے کہ دل دھل کر رہ جاتا۔ تھوڑی دیر تک اولے پڑتے رہے اور جب کھڑکی کے بند پینوں سے آکر ٹکراتے تو ایسا معلوم ہو تا کہ کوئی ڈھیلے مار رہا ہے۔ بارش ہلکی پڑنے پر وہ سوگئی، مگر بڑی اچانک سی نیند۔ اس نے جھیل بھیا کو خواب میں دیکھا۔ وہ اولوں سے سر بجاتے جانے کہاں بھاگے جارہے تھے۔ عالیہ نے انہیں زور زور سے آواز دی تو رک گئے۔ ”میں تم سے نہیں بولتا عالیہ“۔ اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ بادل بڑے زور سے گرج رہے تھے۔ ”خدا کرے وہ خیریت سے واپس آئیں“ بڑی بچی کی ماستا ٹھنڈی رہے۔ ”عالیہ نے بلک کر دعا کی مگر وہ یہ سوچنے سے کترا رہی تھی کہ جھیل بھیا اس کے خوابوں میں کہاں سے آؤمگے۔

صبح بے حد سردی تھی۔ رات کی بارش سے چھت کی منڈیریں اور صحن اب تک گیلا ہو رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کے بجڑے ہوئے پت کھول دیئے۔ کہیں دور سے بیٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ کون ہو گیا؟ وہ بہتر سے اٹھ بیڑی۔ ان دنوں تو

محلے کے کئی آدمی جنگ پر مارے گئے تھے۔ مگر یہاں اتنی دور روٹنے کی آوازیں نہ آتی تھیں، بس یوں ہی خبریں سنیں تھیں تہہ اوپر کچھ دنوں سے تو سارا محلہ اس گھر سے لٹ گیا تھا۔ ہمیں جب محلے میں گھوم پھر کر آتی تو ساری خبریں سنایا کرتی۔ محاذ پر کون ختم ہو گیا۔ کس کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے۔ کس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا، کون اپنی پارٹی کے پیچھے جیل چلا گیا اور کون سا بوڑھا مدتوں کی بیماری جھیل کر ختم ہو گیا۔

وہ جلدی سے نیچے چلی گئی۔ صحن میں پڑی ہوئی لوہے کی کرسی رات کی بارش سے دھل کر چمک رہی تھی اور کیماری کے پودے اولوں کی چوٹ سے دب کر زمین پر جک گئے تھے۔

وہ چپ چاپ تخت پر جا بیٹھی جہاں اماں اور بڑی بچی روٹنے کی آوازوں پر کان لگائے خاموشی سے بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ کریمین ہوا پراٹھے پکاتے ہوئے اپنے گھر کی ماستا کی دعائیں کر رہی تھیں۔

”کون مر گیا؟“ بڑی بچی نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا۔

صدر دروازہ زور سے کھلا اور کمر پر بھوار کے بھنگن صحن میں آگئی۔

”وہ تھانے دار کے صاحبزادے منظور میاں جنگ پر مارے گئے، ہائے کیسے کڑیل جوان تھے، ماں اپنی جان پیٹنے لینی ہے۔“ صحن میں کھڑے کھڑے اس نے اطلاع دی اور پھر کام میں جٹ گئی۔

”مجھے لینا، میں چلی۔“ بڑی بچی نے سینے پر ہاتھ رکھ لئے اور آگے کو جھک گئیں۔ ”میرا جیل“۔

”وہ ٹھیک ہوں گے بڑی بچی، وہ بالکل خیریت سے ہوں گے۔ وہ محاذ پر نہیں جائیں گے، ان کو دوسرا کام ہے۔“ عالیہ نے بڑی بچی کو قہقہہ لیا۔ پراٹھا تو بے پر چل رہا تھا اور کریمین ہوا بڑی بچی کو پانی پلا رہی تھیں۔

”ذرا است سے کام لیجئے بڑی بھائی، اللہ نے چاہا تو جھیل خیریت سے ہو گا، کلکتہ یہاں سے کون سا دور ہے اسرار کو بھیج کر خیریت معلوم کرا لیں۔“ اماں بھی سمجھا رہی تھیں، مگر بڑی بچی کی بے قراری کم نہ ہو رہی تھی۔

”کیا منظور مرگیا؟“ بڑے بچے نے پوچھا۔ وہ آج دیر سے سو کر اٹھے تھے۔
ان کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ ”یہ انگریز بھادر اپنے مفاد کی خاطر ہمارے خون سے ہولی
کھیل رہے ہیں۔“

اماں کی تیروں پر بل پڑ گئے تھے مگر اس وقت وہ کچھ نہ بولیں۔ بڑی چچی
اب اپنے آپ کو سنبھال کر بیٹھ گئی تھیں۔ روئے کی آوازیں مدھم پڑتے پڑتے کھو
گئی تھیں۔

”اور سنا ہے کہ زینب بیگم کا لڑکا ہرنوں کی قید میں ہے۔“ بھگتن نے
جاتے جاتے دوسری اطلاع دی۔

بڑے بچے چوکی پر بیٹھے ہاتھ منہ دھو رہے تھے۔ عالیہ نے دیکھا کہ ان کے
ہاتھ کانپ رہے ہیں، وہ گھبرا گئی۔ ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے بڑے بچے؟“
اس نے قریب جاکر پوچھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ کھنسیاں ہنسی ہنسنے لگے۔
”اتنے دن سے جیل کا کھلا بھی تو نہیں آیا۔“ بڑی چچی کی آواز میں
خداشات لرز رہے تھے۔

سردیوں کی ٹھنڈی ہوئی دھوپ دیواروں سے اتر کر صحن میں پھیل رہی
تھی۔ نجمہ چھو بھلی کالج جانے کے لئے نیچے اتریں تو کریمین ہوا نے خبر سنائی۔
”نجمہ بیٹا قنایدار کے صاحبزادے بھی جنگ پر مارے گئے“ اللہ جیل میاں کو خیریت
سے واپس لائے۔“

”اس گھر کی کیسی بدھنسی ہے کہ اتنی تعلیم بھی حاصل نہ کر سکے جو آرام
سے روزی کما لیتے۔“ نجمہ چھو بھلی کے چہرے سے فکر ظاہر ہو رہی تھی۔

”جی ہاں اور آپ تو اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بڑے مصر کے سرکر رہی
ہیں۔“ جانے کیسے عالیہ نے انگریزی میں بات کرنے کی جرات کی تھی۔

”اوہ! تم سے کس نے کہا ہے کہ غلط سلا انگریزی بولا کرو۔ گھروں میں بیٹھے
بیٹھے بی اے کر لیا تو سمجھا کہ بس قابل ہو گئے۔“ نجمہ چھو بھلی نے بری طرح ڈنپا۔
ان کے لہجے میں اتنی ہنگ تھی کہ عالیہ کاجی چاہا بیس زمین میں دفن ہو جائے۔

”نجمہ بی! زیادہ باتیں نہ بناؤ، کس کی دولت سے قابل بنی ہو، میرا اور بڑی
بھالی کا کھلا کٹ کٹ کر یہ صلہ دے رہی ہو، میں مجبور نہیں ہوں جو تمہاری بات
سنوں گی، میرا بھائی زندہ رہے، تم جیوں کو تو۔“ اماں کچھ کہتے کہتے رک
گئیں۔

”اف! اف! میں آپ لوگوں کے منہ نہیں گلٹا چاہتی“ وہ فارسی والے
سعدی صاحب بھی کہہ گئے ہیں کہ جاہلوں سے اس طرح بھاگو جیسے تیر کمان سے۔“
اور وہ ناشتہ چھوڑ کر کالج جانے کے لئے باہر نکل گئیں۔

”کریمین ہوا بڑی بھالی سے کہو کہ پریشان نہ ہوں میں جیل میاں کی خیریت
معلوم کر آؤں گا۔ اگر سب لوگ ناشتہ کر چکے ہوں تو۔“ بیٹھک سے اسرار
میاں کی کمزوری آواز آئی۔

”تم سب کو پریشان ہونے دو اسرار میاں، تم اپنا ناشتہ کر لو۔“ کریمین ہوا
چائے کی پیالی اور سبھی چہڑی روٹی لے کر اس طرح جھپٹیں جیسے اسرار میاں کے منہ
پر دے ماریں گی۔

”کہہ دو نا کہ خیریت معلوم کر آئے“ اور کیا کام ہے اس بھٹے کو۔“
اماں نے کریمین ہوا سے کہا، مگر وہ بڑی غاموشی سے جھوٹے برتن سینٹی رہیں۔
منظور کے گھر سے بین کی آوازیں پھیلنے ہوئے لگی تھیں۔ بڑی چچی کھنٹی
کھنٹی سی بیٹھی تھیں۔ کھنٹی میں کوئی فقیر صدائے ناگمرازا تو انہوں نے پاندان کی کلیسا
سے ایک چیر نکال کر کریمین ہوا کی طرف بڑھا دیا۔

دوپہر کو جیل بھیا کا کھلا اور منی آرڈر آگیا۔ بڑی چچی خوشی سے کانپ رہی
تھیں اور عظم عظم کر آنے والی بین کی آوازیں بھی اب اتنی درد بھری نہ معلوم ہو
رہی تھیں۔ بڑی چچی برابر جیل بھیا کی باتیں کئے جاری تھیں اور کریمین ہوا مزار
پر چڑھانے کے لئے ملیدہ بنا رہی تھیں۔ خدا نے ان کی منت پوری کی تھی۔ جیل
بھیا کا خط آگیا تھا۔

”ٹھیک ہے بڑے چچا۔“ ٹھیک ہے بڑے چچا۔“ اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔ اب وہ انہیں کیسے سمجھائے ان سے کیا کہے، وہ بولے بولے ان کا سر مسلاتے لگی۔ ”آپ اپنی صحت کی فکر نہیں کرتے بڑے چچا، ہم سب آپ ہی پر ہیں۔“

”وہ میں نے اسرار میاں سے کہہ دیا ہے کہ میرے لئے حکیم محمود صاحب سے کچھ منجوس بنوا لائیں، بس دو دن میں طاقت آجائے گی۔ بڑے پائے کے حکیم ہیں اور ملک کی آزادی حاصل کرنے کے لئے سب سے آگے رہتے ہیں۔ مجھے بھی کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ ان دونوں کمزور ہو رہا ہوں۔ ذرا لائین کی بیٹی اونچی کر دو بس جیسے ہی آزادی ملی، بجلی کا سکشن بحال کرا لوں گا۔ یہ لائین کی روشنی رات کو پڑھنے نہیں دیتی۔“

عالیہ نے اٹھ کر لائین کی بیٹی اونچی کر دی۔ کون جانے آزادی کے بعد کیا ہو گا۔ بھر ملک کی خدمت شروع ہو جائے گی، بجلی کا سکشن بحال کرانے کی کسے فرصت ہو گی۔ یہ گھر تو اندھیرے ہی میں ڈوبا رہے گا۔ عالیہ نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر بڑے چچا کے سر پر آ بیٹھی۔ اس وقت ان کے چہرے پر کیسی سرت تھی۔ شاید آزادی کا تصور چل رہا تھا۔ ”پھر تو سب کچھ ہو جائے گا بڑے چچا۔“ عالیہ نے جیسے بار کر کہا۔

”تم میری کتابیں پڑھتی ہو نا؟“ انہوں نے پوچھا

”ہاں پڑھتی ہوں بڑے چچا۔“

”نعمہ کیسی ہے بہت دنوں سے دیکھی نہیں؟“

”وہ جالوں میں نہیں بیٹھتی، اچھی ہیں۔“

”اتنا پڑھنے کے بعد بھی وہ لڑکی گنبد کی آواز ہے، انگریزوں کی تعلیم کا مقصد

یہی تھا۔“ بڑے چچا نے ٹھٹھری سانس بھری۔ عالیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بڑے چچا تو آنکھیں بند کر کے شاید سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ ذرا ہی دیر میں وہ خراٹے لینے لگے تو عالیہ دبے قدموں کمرے سے چلی گئی۔

باہر ٹھٹھری ہوا سانس سانس کر رہی تھی اور بادلوں کے چند ٹکڑے ادھر

فوری کے خوشگوار دن ہمارا کا پتہ دے رہے تھے مگر بڑے چچا کا چہرہ کیوں پتلا ہو رہا تھا۔ ان کے ہاتھ پاؤں سوکھتے جا رہے تھے اور پیٹ بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ گاندھی جی نے جیل میں ایکس دن کا برت رکھا تھا۔ آزادی کے لئے انہوں نے جان کی بازی لگا دی تھی اور ادھر بڑے چچا نے آرام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جانے کہاں مارے مارے پھرا کرتے، یا پھر بیٹھک میں دوستوں کا جھوم ہوتا۔ نت نئی اسکیپس تیار ہوتی رہتیں۔ عالیہ بڑے چچا کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی۔ اللہ یہ بڑے چچا کس مٹی سے بنے ہیں۔ کبھی جمیل بھیا کی خیریت نہیں پوچھی۔ ٹکلیں مرنے پہ یا جیتا ہے، انہیں کوئی خبر نہیں، بڑی چچی غلوں کی آگ میں سگ رہی ہیں مگر وہ پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ گاندھی کے مرنے کا خوف ستا رہا ہے۔ عالیہ کئی دن سے سوچ رہی تھی کہ بڑے چچا کو سمجھائے گی، انہیں ان کی صحت کی خرابی کی اطلاع دے گی۔

رات کو جب سب لوگ بیٹھک خالی کر گئے تو وہ بڑے چچا کے پاس جا بیٹھی۔ وہ جیسے تھک کر لیٹے تھے۔ لائین کی بجلی پیلی روشنی میں ان کا چہرہ اور بھی کمزور لگ رہا تھا۔

”تم کو پتہ ہے نا گاندھی جی نے جیل میں برت رکھا ہے، مجھے معلوم ہے کہ وہ ابھی نہیں مرنے گئے، مگر۔۔۔“

”ہاں بڑے چچا معلوم ہے، اخبار میں پڑھا تھا مگر۔۔۔“ وہ گھٹکیا گئی۔

”اگر خدا نخواستہ انہیں کچھ ہو گیا تو انگریز ہمارا اپنی ساری مکاری بھول جائیں گے۔ ایک اتنا بڑا طوفان آئے گا جو انگریز کو جنگ سے بھی زیادہ منگوا پڑے گا۔“ بڑے چچا مارے جوش کے بیٹھ گئے۔

ادھر ڈولتے پھر رہے تھے۔ اماں اور بڑی چچی شاید اپنے کمرؤں میں سو رہی تھیں مگر کریمیں ہوا تک چولے کے پاس بیٹھی اپنی بوڑھی ہڈیاں سیبک رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ بیڑھیوں پر ہوئی۔

نمبر پھوپھی اب تک پڑھ رہی تھیں۔ عالیہ نے ان کی طرف کھلنے والے دروازے بند کر لئے اور اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ ہائی اسکول کی طرف سے الو کے بولنے کی آواز آ رہی تھی، گلی میں کچھ آدمی آوارہ کتے لڑ رہے تھے اور کچھ رو رہے تھے۔ اسے رات بڑی ڈراؤنی معلوم ہوئی اور کریمیں ہوا کی بات یاد آ گئی۔ جب کتے روتے ہیں تو کوئی آفت آتی ہے۔ اب اور کون سی آفت آنے کو رہ گئی ہے! ابا بیل میں دن کس طرح گزارتے ہوں گے؟

رات جانے کس طرح گزری، گزری نہیں رات نے اسے گزار دیا۔ کسی بے چینی کسی بے کلي، جاگتے جاگتے آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ اللہ اللہ وہ بار بار جیسے کراہتی اور گلی میں کتے روتے چلے جاتے۔

رات کے چپکلے پھر جب میونسپلٹی کی روشنی بجھ گئی تو کمرے میں گھور اندھیرا چھا گیا۔ فرغوں کی اذانوں کی آوازیں آنے لگیں تو وہ بڑے سکون سے سو گئی۔ صبح کے تصور نے اس کے دماغ سے ساری بلاؤں کو ٹال دیا تھا۔

کسی نے زور سے زنجیر کھڑکائی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ نمبر پھوپھی کی لڑتی ہوئی آواز اس کے کانوں کو چھید گئی۔ ”ہائے مظہر بیبا بیل میں مر گئے۔“ اماں کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ بڑی چچی اونچی آواز سے رو رہی تھیں اور کریمیں ہوا کے سینہ پیٹنے کی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ پھر بھی وہ اپنے بستر پر بے حس و حرکت پڑی رہی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ صبح صبح رات کیسے ہو گئی، سورج کدھر غائب ہو گیا، کیا چچ ابا مر گئے!

وہ رونا جاتی تھی، چینا جاتی تھی۔ اسے اپنا دل پھٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکی اور کریمیں ہوا سینہ پیٹتی اس کے پاس آ گئیں! اسے اپنی بھائی سے لپٹائے لپٹائے نیچے لے گئیں اور وہ ان کے ساتھ اس طرح چلتی رہی جیسے گھٹ رہی ہو۔ اس کے پیروں میں جان کماں تھی۔

بڑے چچا صحن میں کھڑے تھے۔ کیا یہ بڑے چچا ہیں؟ کیا یہ زندہ ہیں؟ انہیں کیا ہو گیا ہے؟ بڑے چچا نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ ان کے برابر کھڑی رہی۔ اماں بے تحاشا رو رو کر تڑپ رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں کیسی بے بسی تھی۔ کتنی حسرت تھی۔ ان کے چہرے پر بچکاری کی دھول اڑ رہی تھی۔

عالیہ لڑکھاتے ہوئے قدموں سے اماں کی طرف بڑھی اور لپٹ گئی۔ اور پھر اسے محسوس ہوا کہ وہ بھی رو سکتی ہے۔

”اے انگریزوں نے مار دیا ہو گا، وہ خود نہیں مرا، وہ مر ہی نہیں سکتا، وہ میرا بھائی۔“ بڑے چچا لوہے کی کرسی کو قھام کر بیٹھ گئے۔ ”میں اسے لینے جا رہا ہوں۔“ بڑے چچا اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جیسے بڑی مشکل سے کھڑے ہو گئے۔

”جلدی سے چلے بڑے بھیا۔“ بیٹھک سے اسرار میاں کی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز آئی لیکن اس وقت تو کریمیں ہوا ان کی آواز سن ہی نہ رہی تھی۔

سب روتے روتے تھک گئے۔ برآمدے میں پھچی ہوئی دری پر اب سب سو گوار بیٹھے تھے۔ دھوپ صحن سے سرک کر دیواروں پر چڑھ گئی تھی اور کوئے ایک سال کائیں کائیں کتے جا رہے تھے۔ بھلا اب یہ کس کی آمد کی اطلاع دے رہے ہیں۔ کسادوں میں کوئی جان نہیں ہوتی، عالیہ کا بچی چاہ رہا تھا کہ دیوار پر بیٹھے ہوئے کدوں کو مارا کر اڑا دے۔

سب کی نظریں صدر دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ مغرب کا وقت ہو رہا تھا اور بڑے چچا ابا کو لے کر اب تک نہیں آئے تھے۔ گلی میں کسی کے بھی قدموں کی چاپ ہوتی تو سب چونک پڑتے۔ کوئی فقیر صدالگا آگزر تا تو ایسا جان پڑنا کہ عین کر رہا ہے۔

کریمیں ہوا نے صحن میں چولہا بنا کر بڑے پٹیلے میں پانی چڑھا دیا تھا اور سیلی ہوئی لکڑیوں کو پھونک پھونک کر کودیں رکھے ہوئے قرآن شریف کو پڑھتے جا رہی تھیں۔ صحن میں اب کتنی سرد ہو رہی تھی۔

گلی میں سب سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر اسرار میاں کی آواز

آئی — ”سب پردہ کر لیں مظہر بھیا آگئے۔“

تھے ہوئے طوفان نے پھر سے زور پکڑ لیا۔ برآمدے میں بچے ہوئے پٹنگ پر ابا کی لاش رکھ کر جب سب لوگ بیٹھک میں چلے گئے تو عالیہ دوڑ کر پٹنگ کے پاس آ گئی۔ اماں پٹنگ کی پٹی سے سر پھوڑ پھوڑ کر رو رہی تھیں۔ نجمہ پھوپھی اپنے بھیا راجہ کو پکار رہی تھیں۔ بڑی بچی اماں کو پٹنائے بیٹھی تھیں اور کریمین بوا سر جھکائے قرآن شریف پڑھنے جا رہی تھیں۔

عالیہ نے ابا کے منہ پر سے چادر سرکا دی۔ کیا بچ بچ یہ ابا ہیں؟ اس نے بچپنا چاہا بیل نے کچھ بھی تو نہ چھوڑا تھا۔ ”بڑے چچا“ عالیہ نے بڑے چچا کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اپنے بھائی کے سرہانے سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔

”میرے بھائی کو انہوں نے مار ڈالا“ اس نے تو انگریز سکران کو مار کر ثواب بھی نہیں کمایا تھا اور انہوں نے اتنی بڑی سزا دے دی۔ میں سب کو بتاؤں گا“ میں اس کے جنازے کو جلوس کی صورت میں لے جاؤں گا۔“ بڑے چچا جوش کے مارے چیخ رہے تھے۔

”کون نکالے گا جلوس؟“ اماں ایک دم تن کر کھڑی ہو گئیں۔ ”جب یہ زندہ تھے تو آپ کے تھے“ آپ کا سنا یہ تھے“ اب یہ میرے ہیں ان کی لاش کی کوئی بے حرمتی نہیں کر سکتا۔“

بڑے چچا کا سر ایک دم جھک گیا۔

پھر ابا چلے گئے۔ ایک ہنگامہ ہوا اور ٹھہر گیا۔ آخری دیدار میں کتنی ہوس ہوتی ہے وہ حیران تھی کہ ابا کی تصویر اس کی بٹلیوں میں کیوں نہیں کھینچ گئی۔

رات گیارہ بجے کے قریب اسرار ماں اور بڑے چچا قبرستان سے واپس آ گئے۔ اس وقت آنسو تھم چکے تھے اور صبر کی سلیز پر سرک آئی تھی۔

”کریمین بوا، چھوٹی ولسن سے کہو اگر ان کے بدلے میں مجھے موت آ جاتی تو میں ضرور مر جاتا“ پرندہ بوا بے بس ہے۔“ اسرار میاں کی آواز سنائے کو چیر گئی۔

”تم نہیں مر سکتے اسرار میاں“ تم زندہ رہو گے، تم نہیں مر سکتے۔“ کریمین بوا نے قرآن شریف پڑھتے پڑھتے اسرار میاں کی زندگی پر لعنت بھیج دی۔

تیسرے دن شام کو حیدر آباد دکن سے ظفر چچا اور ماموں دونوں ہی آ گئے۔ اماں اپنے بھائی سے مل کر بہت بے قرار ہو رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سی بھیک اور اتنا تھی مگر ماموں نظریں چرا رہے تھے، وہ کچھ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ کیا ان کی انگریز بیوی خاندانی زندگی کا پھندا لگنے میں ڈال کر خود کشی کر لیتی؟

ظفر چچا صدمے سے بڑھال تھے اور بار بار کہہ رہے تھے کہ اگر میرا بھائی حیدر آباد میں رہتا تو آج یہ حشر نہ ہوتا۔ پھر شام کو وہ اپنی محفوظ حکومت کی سرزمین کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہوں نے اماں کی ہر طرح مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

کئی دن بعد ممی کا خط آیا تھا۔ شاید اس نے دو رو کر لکھا تھا۔ آنسوؤں نے روشنائی پھیلا دی تھی۔ آخر میں اس نے لکھا تھا کہ اب وہ اس گھر میں نہیں آنا چاہتی، بھونے گاؤں سے کیسا ناٹھ۔ اس نے اپنے متعلق اب بھی کچھ نہ لکھا تھا۔ جمیل بھیا کا بھی خط آیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ مظہر چچا کبھی نہیں مر سکتے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انہوں نے دو دن کی چھٹی پر آنے کو لکھا تھا۔

سے نکل کر چھت پر آگئی۔ نجمہ پھوپھی اب تک اپنے کمرے میں پڑی اونگھ رہی تھیں۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ بھی بدلی بدلی نظر آتیں۔ کتاب ان کے سینے پر کھلی پڑی رہتی اور وہ جانے کیا سوچتی رہتیں۔ عالیہ کو کئی بار خیال آیا کہ اس طرح تو نجمہ پھوپھی کی انگریزی کمزور ہو جائے گی۔

قریب قریب کی چھتوں سے لڑکے لال چلتیں اڑا رہے تھے۔ ”وہ کاٹا“ کی آوازیں آ رہی تھیں اور گلی میں گلاب کی منڈیریاں بیچنے والا تو جیسے اسی گلی کا ہو کر رہ گیا تھا۔

اس نے دلچسپی سے پنچھوں کو دیکھا اور گنتا چاہا مگر ذرا ہی دیر میں جی اچاٹ ہو گیا۔ آج وہ بے حد اداس اور پریشان تھی۔ سارے دن کی دھوپ میں تپے ہوئے پتک پر منہ لپیٹ کر پڑ رہی۔

”عالیہ!“

”اماں۔“ عالیہ بڑبڑا کر اٹھ گئی۔ اماں کے آنے پر اسے حیرت ہو رہی تھی۔ مدتیں گزر گئیں، انہوں نے ڈینے پر قدم بھی نہ رکھا تھا۔ کبھی تھائی میں بیٹھ کر اس سے بات نہ کی تھی۔ پھر ادھر اماں کے مرنے کے بعد تو وہ جیسے سدھ بدھ کھو چکی تھیں۔

”علیٰ کڑھ جاؤ گی لی ٹی کرنے؟“ انہوں نے عالیہ کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”ضرور جاؤں گی، آپ ماموں کو کھدہ دیجئے کہ وہ زیادہ روپے بھیجے لگیں۔“ اماں نے اسے غور سے دیکھا اور پھر کسی خیال میں گم ہو گئیں۔ ابھرا لینے والے پرندے قطار سے اڑے جا رہے تھے۔ عالیہ نے انہیں بے دلی سے دیکھا اور پھر اماں کا منہ نکتے لگی۔ کچھ سوچنے کے باوجود وہ اس وقت بڑی مطمئن سی نظر آ رہی تھیں۔

”عالیہ اب ہمارا کیا بنے گا بچی، سچ تو یہ ہے کہ ہم تباہ ہو چکے ہیں۔ اگر تمہاری جگہ کوئی لڑکا ہو تا تو مجھے اتنی مایوسی نہ ہوتی، خیر اب تو تم ہی سب کچھ ہو۔ تمہی کو سب کچھ کرنا ہے۔“ اماں کی آنکھوں میں پتک تھی۔

”بس ایک سال کی دیر ہے اماں، پھر میں اپنے حیلوں پر کھڑی ہو جاؤں

اس دفعہ بہار کتنی جلدی گزر گئی۔ کیاری میں ڈھیروں گل عباس اور سورج کبھی پھول کھلے مگر ان میں کوئی دلکشی نظر نہ آئی۔ آم کے درختوں میں پور آتے ہی کوئل نے چیخا شروع کر دیا تھا۔ مگر کسی مظلوم سی ترپ نے عالیہ کے پیچھے کو نہ سلا۔ ابائی موت کے بعد وہ کتنی دل شکستہ ہو گئی تھی۔

اماں اب ہر وقت سر بندھے جانے لگی تھیں اور بڑی چچی ادھر ادھر کی باتیں کر کے انہیں ہلانے کی کوشش کرتی رہتیں، پھر اماں کی فکروں میں کمی نہ ہوتی، جانے وہ کیا سوچتی رہتی تھیں، عالیہ پھر ان کے پاس بیٹھی رہتی مگر وہ دل کی بات نہ کتیں۔

بڑے زور کی گرمی پڑنے لگی تھی۔ سر شام آسمان پیلا ہونے لگا تو کھلے کے بچے شور مچاتے۔ ”پیلی آندھی آئی، پیلی آندھی آئی“ شاید ہی کوئی دن گزرتا جو آندھی نہ آتی ہو۔ سارا دن لو طپتی رہتی، گلی میں بگولے لونسے بھرتے اور عالیہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں پڑے پڑے اپنے مستقبل کے لیے سوچتی رہتی۔ یہ دن تو کائنات نہ کٹ رہے تھے۔ وہ اب میاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس گھر کی ایک ایک چیز اسے کاٹنے کو دوڑتی، داوی کے کمرے میں جاتی تو ان کی تیز تیز سانسیں سنائی دینے لگتیں۔ صحن میں بچے ہوئے پر پتک پر ابائی لاش پڑی نظر آتی اور جب لوہے کی کرسی دیکھتی تو جانے کیوں وحشت ہونے لگتی اور پھر بھاگ جاتے، کی خواہش اور بھی جڑیں پکڑنے لگتی۔ جمیل بھیا اسے تسلی دینے بھی نہ آ سکے۔ اس کے باپ کی موت کتنی معمولی بات تھی۔ ادھر تو اسے جمیل بھیا سے نفرت ہو کر رہ گئی تھی۔

دھوپ چھت کی منڈیروں پر چڑھتے چڑھتے غائب ہو گئی تو عالیہ اپنے کمرے

”میں کہتی ہوں کہ اب تم علی گڑھ جانے کا خیال چھوڑی دو۔ خدا جہیل کو خیریت سے واپس لے آئے، میں تمہارے ماموں سے سب روپے لے کر اسے دے دوں گی، تمہارے چچا کی یہی دکانیں کچھ دن بعد چل نکلیں گی۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے، اس نے میرا بیشہ ادب کیا ہے، خدا اسے خوش رکھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں نے کہا تو جنگ سے آنے کے بعد تمہارے ماموں اسے ضرور کوئی بڑا عہدہ بھی دلا دیں گے۔ رہے تمہارے بڑے چچا اور اسرار، تو میں انہیں جلد ہی اس گھر سے چٹا کر دوں گی، بنا بنایا گھر ہے، حویلی سے کچھ کم تو میں۔ سب تمہارے نام کھوا لوں گی۔ ٹھیک تو سمجھو مری کیا؟“ روئہ کوئی خط و لکھتا ماں کو۔ ”سب کچھ کہہ چکنے کے بعد اماں اس کا منہ دیکھ رہی تھیں۔

عالیہ سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر اماں کو دیکھا۔ بچپن میں سنی ہوئی کہانیوں کی چڑیل، اماں کا منہ چمپا کر اس کے سامنے تھرتی معلوم ہو رہی تھی۔ ”میں علی گڑھ جاؤں گی، یہ گھر بڑے چچا کو مبارک رہے۔ آپ اس قسم کی باتیں نہ سوچیں تو بہتر تھا۔“ عالیہ نے سختی سے کہا اور اس طرح منہ پھیر لیا جیسے اب کچھ نہ سننا چاہتی ہو۔

”وہی باپ والی فطرت ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے خوش نہیں دیکھ سکتیں۔ تم چاہتی ہو کہ میں ہمیشہ بے گھر رہوں۔ میرا کھویا ہوا راج پاٹ اب کبھی نہ ملے گا۔“ اماں نے منہ پر دوپٹے کا پلو رکھ لیا اور سسک سسک کر رونے لگیں۔ عالیہ اجنبیوں کی طرح خاموش بیٹھی انہیں روتے دیکھتی رہی۔ اسے اپنی اماں کی تباہ زندگی سے ہمدردی ہے۔ وہ انہیں سکھ دینا چاہتی ہے مگر وہ کچھ نہیں جانتیں اور کہتی خطرناک اسکیم ہے کہ اس کے تباہ ہونے کا سامان کر رہی تھیں۔ وہ ماں ہو کر اسے دکھا دے رہی ہیں۔ جہیل نے بھی ایک لمحے کو بھی زندگی کی خوشیاں سینے کی کوشش نہیں کی اور اب پیسہ کمانے بھی گئے ہیں تو مقصد فاشنزم کو ختم کرنا ہے۔ وہ بھی چچی کی طرح عبرتناک زندگی نہیں گزارے گی اور اماں — اماں نے خود کیسی زندگی گزار دی ہے، اب ایک منٹ کو بھی گھر کے نہ ہو سکے۔ کیا

اماں یہ سب کچھ نہیں سوچ سکتیں۔ کیا یہ چچ اس کی اماں ہیں۔ اس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اماں کو دیکھا جو اب آنسو پونچھ کر اس سے منہ موڑے اٹھ رہی تھیں۔ ”تم علی گڑھ جاؤ میں اپنے بھائی کو لکھ دوں گی، میں تم سے کسی قسم کی توقع نہیں رکھتی، جو جی چاہے کر دو۔“

عالیہ اماں کو جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ اپنے بھائی پر کتنا غور تھا ان کو، عالیہ کا جی چاہا کہ خوب زور سے ہنسنے لگے مگر وہ اماں کے جاتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اس وقت اتنی بے بسی میں وہ خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی۔ رو پھٹنے کے بعد وہ جیسے ہلکی پھلکی ہو کر کمرے بنگ پر لیٹ گئی۔ بئیرا لینے والے پرند کیسی قطار سے اڑے جا رہے تھے۔

”کریمین بوا کیا سب لوگ چائے پی چکے؟“ اسرار میاں کی کزوری آواز اس کے دکھے ہوئے دل کو اور بھی دکھائی۔ اسرار میاں تم اب تک چائے کے انتظار میں بیٹھے ہو۔ آج کریمین بوا نے کوئی جواب نہیں دیا، آج تم کو قیامت تک چائے نہیں ملے گی۔ عالیہ نے ٹھنڈی سانس بھری، کالچ کھلنے میں کہتے دن باقی رہ گئے ہیں؟ وہ دل ہی دل میں حساب لگانے لگی۔

بتی ہیں۔ وہ رنجیدہ ہو گئی۔

”کیل کی کوئی خبر ملی بڑی چچی؟“ عالیہ نے پوچھا۔

”تمہارے جمیل بھیا نے لکھا تھا کہ وہ بڑے مڑے میں ہے، ڈھیروں کماتا ہے اور اڑاتا ہے، کسی کو یاد نہیں کرتا، اس کے لئے سب مر گئے ہیں، تمہارے جمیل بھیا بسبتی گئے تھے۔“ کیلیل کے نام پر بڑی چچی کی کچھ ایسی حالت ہو گئی جیسے چٹپٹائی دھوپ میں ننگے پاؤں چل رہی ہوں۔ ”دیکھو جس نے پیدا کیا، اسی کو بھول گیا،“ اکیلے بیٹھ کر ہے۔“ انہوں نے لمبی آہ کھینچی۔

”ایک وہ بھی زمانہ تھا جب سارے چھوٹے صبح اٹھ کر اپنے بڑوں کو سلام کرتے تھے، جو کچھ تھا سب ماں باپ کے ہاتھ میں تھا۔“ کریمین ہوا بڑا ناخوش۔

”ہے! بڑی چچی کتنی معصوم ہیں، عالیہ سوچ رہی تھی۔ بھلا جمیل بھیا بسبتی میں اسے کیوں تلاش کرتے پھر گئے۔ پتہ نہیں کیلیل کہاں ہو گا، پھر بھی شکر ہے کہ جمیل بھیا اپنی ماں کا دل رکھ رہے ہیں۔ ہائے کس پتھر کا بنا تھا کیلیل۔“

ادھر کے کمرے کی کڑی کھلی اور نجمہ چھو بھی کا سر بھانکا۔ کیسی ڈھل گئی تھیں مجھ چھو بھی بھی۔ اس کا جی چاہا کہ انہیں بھی سلام کرے مگر انہوں نے لفٹ ہی نہ دی۔ اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ نجمہ چھو بھی کو سلام کرنے کے لئے اب انگریزی میں ایم اے کرنا ہو گا۔

کریمین ہوانے بڑے چاؤ سے اس کے لئے چائے تیار کی تھی۔ اتنی مدت بعد ان کے ہاتھ کے سوتکے ہونے پر اٹھے کھانے میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔

”بڑے چچا کہاں ہیں؟“ چائے پینے کے بعد اس نے پوچھا۔

”دہیں کہیں آزادی کا جھنڈا گاڑ رہے ہوں گے۔“ اماں نے تیوریوں پر تل ڈال کر کہا اور بڑی چچی گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

”کہیں باہر تو نہیں گئے ہیں؟“ اس نے پھر پوچھا۔ وہ ان سے ملنے کے لئے سخت بے تاب تھی۔

”نہیں عالیہ، یہی ہیں۔“ بڑی چچی نے جواب دیا۔

”بس اب تم جلدی سے ملازمت کی درخواستیں دینے لگو، میں بھربائی ان

وہ پورے دس مہینے بعد علی گڑھ سے لوٹی تھی۔ بڑے دن کی چٹیاں مزار نے بھی گھر نہ آئی تھی۔ اماں نے بھی نہ بلایا تھا۔ بڑی چچی کے کسی خط آئے تھے کہ وہ ضرور آئے۔ اور بھی سب حال احوال لکھنے والی وہی تھیں۔ اماں تو اتنے دنوں سے ناراض تھیں۔ اتنی مدت میں اماں نے ایک بھی خط نہ لکھا تھا۔ انہیں خبر بھی نہ تھی کہ وہ جس سے ناراض ہیں وہ راتوں کی تنہائیوں میں ان کے دکھوں کا یاد کر کے تڑپتی ہے۔ وہ اماں کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ذہن سے اتار نہ سکی تھی۔ اس کے بعد اگر کوئی شدت سے یاد آتا تو وہ بڑے چچا تھے۔ مگر گرم خبریں اور غیر معمولی حالات ان کی یاد میں اضافہ کرتے رہتے۔ اس نے بڑے چچا کو کئی خط بھی لکھے مگر جواب کا انتظار ہی رہا۔

تانتے سے اتر کر وہ سب سے پہلے بڑی چچی سے ملی اور اس بے پناہ مسرت کو اپنے سینے میں سونے اماں کے لپٹ گئی اور رو رو کر اماں کا سینہ تر کر دیا۔

گھر کا نقشہ کیسا بگڑا بگڑا رہا تھا۔ آندھیوں اور بارشوں نے دیواروں کا رنگ چاٹ لیا تھا۔ کمروں کی سفیدی چلی اور مریض معلوم ہو رہی تھی۔ دلالان کے پردے کئی جگہ سے پھٹ کر ٹکٹک گئے تھے۔ کریمین ہوا ماضی کی یادوں کے بوجھ سے کمر جھکا کر چلنے لگی تھیں اور اماں کی پیشانی کے سامنے بہت سے سفید بال جھانکنے لگے تھے۔ بڑی چچی تو بیتا جانتا تعزیر تھیں اور صحن میں پڑی ہوئی لوہے کی کرسی کے پایوں میں زنگ لگ چکا تھا۔

”بھئی کے لڑکی ہوئی ہے، ساجدہ کا خط آیا تھا۔“ بڑی چچی نے اطلاع دی۔

”اوہ! پیاری بھئی اماں بھی بن گئی۔“ وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ پر اس کی بجائے کارکنہ لٹپلے لے کر کون جانے والا ہے، اب تو اس گھر میں ساری رسیں مر

بڑے بچا آگئے۔ اماں نے ناگوار سی سے دوسری طرف منہ پھیر لیا اور عالیہ ان کی اس حرکت کو نظر انداز کر کے ان کی طرف لپکی — ”بہت دن بعد دیکھا ہے آپ کو بڑے بچا۔“ وہ انکے لپٹ گئی۔

استحسان کیا رہا؟“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔

”بہت اچھا رہا، کامیابی کی پوری امید ہے۔“

”پھر اب تم ان بیکار دنوں میں خوب پڑھو،“ وہ میری لائبریری کی چابی اپنے پاس رکھ لو۔“ وہ اپنی شہزادی کی جیب ٹٹولنے لگے۔ ”ابھی گاندھی جی کی سوانح حیات منگائی ہے، ضرور پڑھو۔“

”اب آپ اسے بھی جاہ کر دیجئے بڑے بھیا، مجھے یہ وہ کر کے آپ کو ممبر نہیں آیا۔ میرے پاس کچھ بھی نہ رہنے دیجئے۔“ اماں آج سب سے مقابلہ کرنے پر قن گئی تھیں۔ ان کی حالت تو کچھ ایسی ہو رہی تھی جیسے کینے کے ہاتھ پیسہ آگیا ہو۔

”وہ — وہ — میں نے کہا،“ جیل کی اماں کہاں ہو؟ دو آدمیوں کا کھانا کچے کا، ذرا انتظام کرا دینا۔“ بڑے بچا بوکھلا کر بیٹھک میں چلے گئے۔

”ضرور پڑھوں گی بڑے بچا،“ ہائے کتنی اچھی کتاب ہو گی۔“ عالیہ نے اماں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا اور تھکے تھکے قدم اٹھاتی اوپر جانے والے زیروں پر ہوئی۔

کریم بن بوا، عالیہ بنیا کو دعا کو اور کو کو کہ اللہ انہیں کامیاب کر دے، بڑے بھیا کہتے تھے کہ پرچے بہت اچھے ہو گئے ہیں۔“ اسرار میاں کی آواز گھر میں داخل ہوئی تو کریم بن بوا کا چہرہ بڑے زور سے کھڑکا۔ ”اسرار میاں کبھی تو تم چپ بھی رہا کرو۔ کوئی بھی مبارک موقع ہو تم ضرور دھل دو گے۔“

عالیہ ایک لمحے کو جیسے زیروں پر جم کر رہ گئی اور پھر تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کریم بن بوا، بیٹ کی ایسی مار پڑی کہ اب تم ذائقہ دار چیزوں کا مزہ تک بھول گئیں اور جنہیں صرف اپنے بڑے سرکار مرحوم کی حرام کاری کے اس پھل کی کڑواہٹ یاد رہ گئی۔ تہماری ساری زندگی کی ناکامی اور غلامی دشمن بن کر اسرار میاں کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ اللہ یہ اسرار میاں کے حصے کی موت کس کتنے بلی

سیٹیوں سے، اس اجڑے گھر میں جانے کس طرح دن گزارے ہیں، کبھی بیٹ نہ کھانا نہ ملا۔“ اماں نے بڑی بے باکی سے کہا۔ اس وقت وہ بڑی مغرور نظر آ رہی تھیں۔

”ارے چھوٹی دلہن، میں نے تو اپنی جان سے زیادہ تمہارا خیال کیا ہے اور۔“ بڑی چچی سے کچھ کہنے نہ بن پڑی تھی۔

”بس جناب آپ کے خیال کا شکریہ“ اب آپ لوگ میری جان بخش دیں اور احسان نہ جتائیں، مجھے یہ تھاکہ ایک دن ہی سنا ہو گا۔“

”اماں!“ عالیہ نے حیران ہو کر اماں کو لپکارا اور بڑی چچی کی طرف دیکھ کر سر جھکا لیا۔ ابھی تو امتحان کا نتیجہ بھی نہیں لکھا، کیا یہی سب کچھ سننے کے لئے اس نے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہا تھا؟ اس کا جی چاہا کہ اپنے لٹل ہوئے کی دعائیں مانگنے لگے۔

بڑی چچی منہ پھیر کر دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔ ”اتنی مدت بعد عالیہ آئی ہے اس سے باتیں کرو دلہن“ — وہ جیسے رنگیتی ہوئی انھیں — ”صبح سے سارا کام پڑا ہوا ہے، کچھ بھی تو نہیں کیا۔“

خدا جب دینے پر آتا ہے تو اتنا برا کبجہ دے دیتا ہے۔ وہ چپ چاپ بڑی چچی کو جاتا دیکھتی رہی۔

”عالیہ بنیا خدا آپ کو پاس کر دے، آپ کے دن پھیرے، پرانا زمانہ یاد کرتی ہوں تو کبجہ منہ کو آتا ہے۔“ کریم بن بوا اپنی کسے جا رہی تھیں۔ انہوں نے شاید اماں کی باتیں نہ سنی تھیں۔ غل کی موٹی سی دھار کچے فرش پر تڑتڑ کرے جا رہی تھی اور کیاری میں پانی ریک رہا تھا۔ ہمارے کھلے ہوئے سرخ، پیلے اور اوڑے پھول اب مرجھ چلے تھے۔

”ہائے اب مجھے کتنا سکون ملا ہے۔ اب ہمارے دن پلٹ جائیں گے۔“ اماں بڑے ذوق و شوق سے عالیہ کو دیکھنے جا رہی تھیں۔

کیا آج اس کمرے میں بڑی چچی زندگی بھر کا کام منٹائیں گی۔ عالیہ کا دھیان بڑی چچی میں لگا ہوا تھا۔ وہ اماں کی کوئی بات نہ سن رہی تھی۔

کو آگئی ہے۔ اتنی دیر سے پکوں میں اگلے ہوئے آنسو ڈھلک کر بستر میں جذب ہو گئے۔

بست دن بعد جبیل بھیا کا خط آیا تھا۔ بڑی چچی ننھی سی چڑیا کی طرح ہر طرف پھدکتی پھر رہی تھیں اور اماں بڑے اشتیاق سے عالیہ کی طرف دیکھ کر جاری تھیں مگر عالیہ کو اس وقت تمام ضروری کام یاد آرہے تھے۔ اماں کے اشتیاق میں جو خوفناک ارادہ بھانک رہا تھا، اس سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ اماں دادا کی حویلی کی مالکن نہ بن سکیں، جاگیر دارانی نہ کھلا سکیں، اب وہ بھانجے پور کی لنگوٹی پر اکتفا کر رہی تھیں اور پھر جمیل بھیا تو بچ انہیں ابھٹے گلتے تھے۔ کیا مزے سے اپنے باپ کا منہ چرا کر انگریزوں کو شکست سے بچانے کے لئے دوڑ پڑے تھے۔

”عالیہ بیٹی ذرا ایک بار پھر سے خط پڑھ دو، اپنی آنکھیں تو اب کام نہیں دیتیں، اتنا بچانی آتا ہے کہ سامنے دھند چھا جاتی ہے۔“ بڑی چچی نے پائیدان سے خط نکال کر عالیہ کی طرف بڑھا دیا۔

”میری پیاری اماں، انتہائی مصروفیت کی وجہ سے آپ کو خط نہ لکھ سکا مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں آپ کو بھول گیا۔ اماں تو ہر وقت یاد آتی ہیں۔ عالیہ بی بی تو اب واپس آ چکی ہوں گی۔ خدا کرے وہ کامیاب ہو جائیں۔ انہیں تجھے میں دینے کے لئے میرے پاس کیا بچا ہے اور۔۔۔“

عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ باقی خط وہ نہیں پڑھ سکے گی، اس کے گلے میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ باقی خط ہزاروں خرابیوں سے پڑھا گیا۔

”اس گھر کو چھوڑ کر پھر ہم بیٹھ کے لئے گھر سے محروم ہو جائیں گے عالیہ جان۔“ بڑی چچی کے اٹھتے ہی اماں نے آہستہ سے کہا۔

”اماں پھر میں کہیں چلی جاؤں گی، آپ مجھے جہنم میں کیوں جھونکنا چاہتی ہیں۔“ عالیہ نے خود مختار لڑکیوں کے تیور سے اماں کو دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

فہ— اس گھر کی دیواروں تک سے لوٹا ٹپک رہا ہے، کتنے برس اور یہ گھر اماں کی جاگیر بنا رہے گا۔

اماں ناراض ہوئے بغیر خاموشی سے اس کو دیکھا کھیں۔ ان کی آنکھوں میں ناکامیوں کا احساس ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ حویلی اور جاگیر سے محروم ہونے کے بعد اب وہ اس حقیر سے مکان کو بھی اپنا نہ بنا سکتی تھیں۔

”یہ آنا کھانے کے لائق ہے؟“ لوریاں لگی ہیں، اللہ یہ دن بھی دکھانا تھا، کبھی اپنی زمینیں سونا اٹکتی تھیں۔ ”کریم بوا آنا چماتے ہوئے سوت جیسے باریک باریک کپڑے جن کر پھینک رہی تھیں۔ لمبی جنگ نے صاف سحرے گیوں کے ایک ایک دانے کو ترسا دیا تھا۔ کریم بوا آئے دن بچش کی شکار رہتیں۔

”اپنی حکومت جیت جائے تو کریم بوا سب کچھ کھانے کو ملنے لگے گا“ سب ہار گئے ہیں، بس ایک جاپان ملک ہی تو رہ گیا ہے۔ اللہ جانے یہ کس پتھر کے بنے ہیں۔“ اماں نے کریم بوا کو قہقہہ دیا۔

”بیٹا ہوا زمانہ پھر نہیں آتا چھوٹی دلہن۔“ کریم بوا نے اپنے حساب بست بڑی بات کہہ کر سب کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کر کندھے ہوئے آٹے کی گگن ڈھانک دی۔ ”جانے بھی بیٹا کیسی ہوں گی اور ٹھیک میاں۔“

”چپ بھی رہو کریم بوا، ٹھیک کا ذکر نہ کیا کرو، بڑی چچی سنی ہیں تو رونے بیٹھ جاتی ہیں۔“ عالیہ نے انہیں ٹوک دیا۔

دھوبن کپڑوں کا گٹھا اٹھائے اندر آگئی تو بڑی چچی سموں کے میلے کپڑے جمع کرنے لگیں اور دھوبن پھولی ہوئی سانسوں کو ٹھیک کرتی تخت کے پاس زمین پر پھسلا مار کر بیٹھ گئی۔ ”اے چھوٹی دلہن بھگت ہے۔“ دھوبن نے ہاتھ پھیلا دیا۔ ”اک دڑا سی تمباکو تو کھلا دیجئے، منہ سوکھ رہا ہے۔“

”کیسا بھگت؟“ اماں نے پان کا ٹکڑا اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”وہ جو حاجی صاحب کا لڑکا جنگ پر مارا گیا تھا“ اس کی پیوی کسی کے ساتھ بھاگ گئی، تین سال ہوئے حاجی صاحب کے لوہڑے کو مرے، ایسی شرافت سے گھر پر ہی رویا گئی کہ سب واہ کر کے رہ جاتے، کسی کو ملیا پتہ تھا کہ یہ گن بھرے

میں۔“

”غضب خدا کا کہیں مل جائے تو کھود کر دفن دیں حرام زادی کو۔“ اماں نے برا سامنہ بنایا۔

”چودھویں صدی ہے، ایک زمانہ تھا کہ بارہ تیرہ سال کی لڑکی بیوہ ہو کر یونی بیٹی رہتی، قبر کے سوا کسی دوسرے کا منہ نہ دیکھتی، پر اب تو سب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ سچ کہا ہے بزرگوں نے چودھویں صدی میں گائے گو کھائے گی اور کنواری براءٹنگ کی۔“ کریم بوا بھی چپ نہ رہ سکیں۔

کریم بوا یہ گائے ماتا کی بات نہ کیا کرو، کسی ہندو نے سن لیا تو لینے کے ویسے پڑ جائیں گے، اب وہ بھائی چارہ نہیں رہا، جسے دیکھو پاکستان کے خلاف ہے، عورتیں تک کہنے سے نہ نہیں چوکتیں۔ ہم تو چپکے سے کپڑوں کا گٹھا اٹھا کر چلے آتے ہیں۔ اللہ بچائے اس قوم سے، کانپور میں کیسے کیسے فساد نہیں ہوتے رہتے۔“ دھوبن نے اپنا سر تھام لیا۔ ”اپنے کئی عزیز کانپور کے فساد میں مر چکے ہیں۔“

”سب ٹھیک ہے، زمانے بدل گئے۔“ کریم بوا جیسے اتنی بہت سی باتوں سے ادبھ کو جھوٹے برتن سیٹھ لگیں۔

ساری رات بارش ہوتی رہی۔ چھاجو پانی برس گیا۔ صبح بھی آسمان صاف نہ تھا۔ ابر کے سیاہ ٹکڑے ادھر ادھر ڈولتے پھر رہے تھے۔

عالیہ نے کھڑکی کے بجڑے ہوئے پٹ کھول دیے۔ سامنے ہائی اسکول کے احاطے کے درخت رات کی بارش سے نما کر خوب نکھر گئے تھے اور کسی درخت میں چھپی ہوئی کوئل برابر قطعہ چراتی تھی۔ گلی میں پڑی ہوئی آموں کی مٹلیوں اور پھنگوں کی بو ہوا میں رچی ہوئی تھی اور اخبار بیچنے والا بڑی تیزی سے گلی سے چپقلہ گزر رہا تھا۔ ”خونفک بم“ جاپان کی کرٹھ گئی، ہیرو شیمہ تباہ ہو گیا، اتحادیوں کی فتح قریب ہے۔ ”آگیا، آگیا آج کا اخبار“ ہیرو شیمہ۔“

اچھا تو ایک پورا شر ایک بم سے ختم ہو گیا۔ پھر اس کے بعد کیا ہو گا؟ جیل بھیا واپس آ جائیں گے۔ انگریزوں کے حق میں پروپیگنڈا کرنے کے سارے ہتھیار ختم کر کے خالی خولی واپس آ جائیں گے مگر وہ ہتھیار جو جنگ کی آگ میں جل مرے، اب ان کے انتظار کرنے والوں پر کیا گزرے گی؟ اس سوال کا جواب نہ باکر عالیہ بستر سے اٹھ پڑی آج اسے اخبار پڑھنے کی چھی طلب ستا رہی تھی۔

بڑے بچا بیٹھک میں جا بیٹھے تھے اور اخبار کے صفحے چنگ پر بکھرے پڑے تھے۔ اس نے بے آبی سے اخبار کے سارے صفحے اٹھالے۔ ہیرو شیمہ میں آگ کے شعلوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

اخبار رکھ کر وہ گم سم سی بیٹھی گئی۔ اللہ یہ حکومتیں شروں کو کیوں نشانہ بناتی ہیں۔ ان کا کیا قصور، انہیں کیوں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے، مگر یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ تاریخ کبھی مسکرائے گی بھی کہ نہیں، ایک ایک لفظ خون کی بوند معلوم ہوتا ہے۔ ہیرو شیمہ کی آگ میں کیا کچھ نہ جل گیا ہو گا۔ پتہ نہیں لوگ

اس وقت کس عالم میں ہوں گے۔ وہ اس وقت زندگی کے کتنے بہت سے کام انجام دینے کی سوچ رہے ہوں گے۔ وہ کیا کیمیا کرنے کو گھروں سے نکلے ہوں گے اور کیا پتہ اس وقت بھی بچے جاپانی گزیاں خریدنے کسی دکان پر کھڑے ہوں اور اس وقت اچانک خونفک بم کا دھماکہ ہوا ہو گا۔ اور۔

”جلدی جلدی چائے پی لو عالیہ بیٹیا، اسکول کا ٹانگہ آنے والا ہو گا۔ یوں ہی بیٹھی کیا سوچ رہی ہو۔“ کرکین بوائے ٹوکا تو وہ جلدی سے چائے پیئے بیٹھ گئی۔ ابھی تو اسے تیار بھی ہونا تھا۔

”جاپان بھی ہارنے والا ہے۔ ان کا ایک پورا کا پورا شہر تباہ ہو گیا۔“ غفلت سے نکل کر اماں نے بڑے اطمینان اور سکون سے خبر سنائی۔

”جی ہاں!“ چائے پی کر وہ صحن میں آگئی۔ بڑی چچی تل کے پاس بیٹھی ہاتھ منہ دھو رہی تھیں۔ کیار میں سارے پودے بارش کے بوجھ سے دب کر زمین پر جھک گئے تھے۔

کپڑے تبدیل کر کے وہ بال ٹھیک کر رہی تھی کہ باہر سے آواز آئی۔

استانی جی تانگہ آگیا ہے۔“

برقع ہاتھ پر ڈالے جب وہ زینے طے کرنے لگی تو آگے آگے نجد پھو بھی بہت اونچی اڑیوں کی سینڈل پر جمی سٹی اتر رہی تھیں۔ ”استانی جی تانگہ آگیا ہے۔“ نجد پھو بھی نے گردن سمھ کر کہا۔ ان کے ہونٹوں پر کیسی مسکراہٹ تھی۔

”ہم دونوں ایک ہی کام کرتے ہیں، مگر آپ کچھ ارکشی جاتی ہیں اور میں استانی، یہ فرق اگر نہ بھی مئے تو کیا قیامت آجائے گی نجد پھو بھی۔“ عالیہ نے تلخی سے جواب دیا۔

”واہ یہ فرق مٹ بھی کیسے سکتا ہے، کیا تم نے انگلش میں ایم اے کیا ہے؟ مگر اسے اور گھوڑے میں کوئی فرق تو ضرور ہوتا ہے۔“ نجد پھو بھی چائے پینے کے لئے بیٹھ گئیں۔

”استانی جی کالج سے تانگہ آگیا ہے۔“ باہر سے صدا آئی۔

”بس اچھے ہی ہیں، کمزور ہو گئے ہیں۔“ بڑی چچی نے جواب دیا۔
 ”تم کھانا کھا چکی ہو، مہمی؟“ عالیہ نے پوچھا۔
 ”نہیں“ میں تو آپ کا انتظار کر رہی تھی بچیا۔“

مہمی کی بنیا جاگ کر رونے لگی تو بڑی چچی نے اسے اٹھا کر کندھے سے لگا لیا اور بڑی محبت سے تھپکنے لگیں۔ اماں تخت پر بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک بار بھی مہمی یا چچی کی طرف نہیں دیکھا۔ جب سے عالیہ اسکول میں ملازم ہوئی تھی، اماں کی نظروں میں سب کے لئے کتنی حقارت پیدا ہو گئی تھی۔ پھر مہمی سے تو وہ ہمیشہ کا بدیر رکھتیں۔

”تمہارے میاں نہیں آئے مہمی؟“

”نہیں بچیا، وہ کیسے آتے؟ ان کی بمبیں پیار تھی۔ انہوں نے مجھے زناتے ڈبے میں بیٹھادیا تھا اور ایک بوڑھی عورت سے کہہ دیا تھا کہ مجھے دیکھ کر رہے۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”تم بہت یاد آتی تھیں مہمی۔“ عالیہ نے اسے پیار سے دیکھا۔ مہمی اپنے ماحول سے مطمئن نہیں۔ یہ سوچ سوچ کر اسے دکھ ہو رہا تھا۔

”میں بھی آپ ہی سے تولنے آئی ہوں۔“

”ہوں! تمہارے جانے کے بعد گھر میں سکون ہو گیا تھا، اس لئے تمہیں یاد کر کے ترپتی تھی۔“ اماں نے جلی جلی نظروں سے مہمی کو دیکھا۔

”اچھا!“ مہمی ان کے طعنے کو نہ کر رہی پڑی۔

ارے کیا مہمی اتنی ٹھنڈی پڑ چکی ہے۔ عالیہ کو یقین نہ آرہا تھا۔ کسی سنجیدہ اور بھاری بھر کم سی لگ رہی تھی۔

”مہمی اس کو تو مجھے دے دے۔ اسے پال کر زندگی کے دن کٹ جائیں گے۔“ بڑی چچی مہمی کی بنیا کو چوم چوم کر کہہ رہی تھیں۔

”لے لیجئے بڑی چچی۔“ مہمی نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ شاید مہمی کو اپنی پور درش کا زمانہ یاد آ گیا تھا۔ اسے بھی تو میاں پلنے کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔

”تائیکے والوں کے لئے ہم اور آپ دونوں برابر ہیں۔“ عالیہ زور سے ہنسی۔
 ”آپ انہیں سمجھاتی کیوں نہیں؟“ وہ تائیکے پر جا بیٹھی۔ نجر پھوپھی کیا کہہ رہی تھیں اس نے سنا نہیں۔

اسکول سے واپسی پر عالیہ نے دیکھا کہ کوئی صحن میں کھڑا ہے۔ وہ پشت سے پہچان نہ سکی مگر جیسے ہی وہ قدم آگے بڑھی تو مہمی پلٹ کر اس سے پلٹ گئی۔

”ارے مہمی تم آگئیں؟ عالیہ اسے زور زور سے سمجھ رہی تھی۔“ اور وہ برآمدے میں کون لینا ہے کھنوں پر؟“

”چپہ نہیں بچیا۔“ مہمی جھینپ گئی۔

”مہمی کی بنیا ہے، اور کون ہے۔“ بڑی چچی نے نمال ہو کر بتایا۔

”اوہ!“ عالیہ برقع اتارتا بھی بھول گئی اور چچی کی طرف بھاگی۔ ”بے کتنی پیاری ہے، بالکل مہمی کی طرح۔“ عالیہ کا پی چاہا کہ اسے سوتے سے اٹھا کر خوب پیار کرے۔ اسے یاد آرہا تھا کہ اگر تہینہ آپا زندہ ہوتی تو شاید ان کے بھی ایک دو بچے ہوتے۔

چچی کے منہ پر سے دوپٹہ سرک گیا تھا اور گال پر کبھی آ بیٹھی تھی۔ عالیہ نے کبھی اڑا کر منہ ڈھاکا دیا۔ کل میں اسکول سے آتے ہوئے اس کے لئے ایک چھوٹی سی پھردانی خرید لاؤں گی، پھر کھینوں سے محفوظ ہو جائے گی۔“ عالیہ نے کہا۔

”لو بھلا کھینوں سے کون بچتا ہے، یہ تو ہمارے ہاں موسیٰ جلیاں ہیں بچیا۔“ مہمی ہنس دی۔ ”اگر ہمارے گاؤں میں کوئی ایسی بات کرے تو سب مذاق اڑانے لگتے ہیں، بھلا کھینوں سے بھی کوئی بچ سکتا ہے۔“ وہ پھر ہنسنے لگی، کیسا دکھ تھا اس کی ہنس میں۔ وہ دہلی ہو گئی تھی، اس لئے کچھ زیادہ ہی خوب صورت لگ رہی تھی۔ جمیل بھیا نے مہمی کو کھو کر غلطی ضرور کی ہے۔ عالیہ کو خیال آیا اور وہ موقع اتارنے لگی۔ ”بڑے بچا سے ملیں؟“ اس نے برقع لپیٹے ہوئے پوچھا۔

”کہاں؟ وہ گھر میں آئے ہی نہیں۔“ مہمی نے کہا اور پھر بڑی چچی کی طرف مڑ گئی۔ ”اچھے تو ہیں بڑے بچا؟“ اس نے بڑی بوڑھیوں کی طرح پوچھا۔

ممی کی بنیا بھوک سے ہلبلا کر زور زور سے رونے لگی۔ تو ممی نے کھڑا
چھوڑ دیا اور ہاتھ دھو کر اسے گود میں لے لیا۔ بڑی چچی کمرے میں چلی گئیں۔ اماں
پہلے ہی ممی کے کمرے میں پانڈان لے کر جا چکی تھیں۔ شاید انہیں خطرہ ہو گا کہ
ممی اپنے کمرے میں ذرہ نہ ڈال دے۔

کتنی سخت گری پڑ رہی تھی۔ ہوا بند ہونے کی وجہ سے سخت جھس ہو رہا
تھا۔ دوپہر کاٹے نہ نکلیں۔

”کریمین ہوا صاجزادی کے لئے یہ کھلونے لے جاؤ اور ممی بنیا کو میری دعا
کو اور اگر بس لوگ کھانا کھا چکے ہوں تو۔“ اسرار میاں بیٹھک کے کواڑوں
کی آڑ میں کھڑے کمرے سے رہے اور کریمین ہوا سب کے آگے سے بچا ہوا سالن
ایک پیالے میں جمع کر کے اسرار میاں کے پیٹھ مار کرنے کا سامان کر رہی تھیں۔

عالیہ نے ہاتھ بڑھا کر کھلونے لے لئے تو کریمین ہوا جیسے ہلبلا اٹھیں۔
”خدا کی شان ہے، زمانے زمانے کی بات ہے اسرار میاں ممی بنیا کی اولاد کے لئے
کھلونے لائیں۔“ کریمین ہوا نے سالن کا پیالہ اور روٹیاں ان کے آگے بڑھے
ہوئے ہاتھ پر پیش دیں۔

”یہ کھلونے اسرار میاں نے دیئے ہیں اور دعا کی ہے۔“ عالیہ نے بچوں کی
طرح جھنجھٹایا۔

”اس طرح تو اونچے ہونے سے رہے اسرار میاں، یوں بچھلے پھرتے
ہو، اپنی اوقات بھی نہیں بچا سکتے۔“ کریمین ہوا برآمدے میں اب تک بڑبڑا رہی
تھیں۔

”کریمین ہوا! اللہ کرے تم کو بھی ہو جاؤ یا اسرار میاں مرجائیں۔“ عالیہ نے
دل ہی دل میں دعا کی اور پھر بڑی چچی کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ کپڑوں کی ٹکڑیوں اور
تلتے دانوں کو کھولے ریشتی کلوے جن جن کمرے کی بنیا کے لئے کریمین ہوا لٹی سی
رہی تھیں اور برابر باتیں کئے جا رہی تھیں۔ ”ممی تمہاری سانس کیسی ہے؟ لوتی
تو نہیں؟ تمہارا میاں تو تم سے بہت محبت کرتا ہو گا؟“

ممی ہنس ہنس کر ہر بات کا جواب ہاں میں دے رہی تھی مگر عالیہ دیکھ رہی

تھی کہ ممی سب سے نظریں بجا رہی ہے۔ ”مجھے یہ اتنی پیاری کیوں ہے بھئی؟“
”تمام باتوں سے بچنے کے لئے ممی نے دوسری بات شروع کر دی۔

”تمہاری بیٹی جو ہے۔“

”جب سے یہ سامنے آئی ہے ساری دنیا بچ ہو گئی ہے۔“ ممی نے ٹھنڈی
سانس بھری اور اپنی بنیا کو سینے سے لگا کر لٹ گئی۔ ”اس کے باپ اور دادی کو
اس سے کوئی محبت نہیں، انہیں بیٹا چاہئے تھا۔“

ذرا دیر میں ممی سو گئی اور سوتے میں لمبی لمبی آہیں بھرنے لگی، مگر عالیہ
بڑی چچی کے ساتھ ساری دوپہر کریمین ہوا لٹی سی رہی۔

شام کو جب سب لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ بڑے چچا آ گئے۔ ممی
نے ان کی طرف دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

”بڑے چچا کھڑے ہیں بھئی۔“ عالیہ نے ملامت سے دیکھا۔

”اچھا بڑے چچا ہیں، میں تو بچپانی نہیں۔“ وہ بڑے طعنے نہی۔

”تسلیم بڑے چچا،“ سائے آپ کی کانگریس پارٹی کا کیا حال ہے، ماشاء اللہ گاندھی
میاں کی عمر تو لمبی ہوتی جا رہی ہے۔“

ارے یہ وہی ممی ہے۔ بس اتنا ہی فرق ہے تاکہ اب گود میں بچہ ہے۔
عالیہ اسے حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”تمہارے گھر میں بس خیریت ہے نا۔“ بڑے چچا بولکھلا کر بیٹھک کی طرف
چلے۔ ”کریمین ہوا چائے باہر بھجوا دو۔“

”عمر لمبی نہ ہو تو کیا ہو،“ چچا راجھوستان پر حکومت کے خواب دیکھ رہا ہے، لو
بھلا لکھوئی ہاتھ کر حکومت کرے گا۔“ اماں خوش ہو کر ممی سے بول پڑیں۔ ایسے
محاملات میں تو وہ سو فی صدی ممی کے ساتھ رہتیں۔ پھر ادھر تو وہ انگریز حکومت
پر دل دجان سے قربان ہونے کو تیار تھیں، وجہ یہ تھی کہ جب سے عالیہ ملازم ہوئی
تھی، اماں کی انگریز بھائی بہت محبت سے خط لکھنے لگی تھیں۔ ان خطوں میں وہ بڑے
مزنے مزنے کی باتیں لکھتی تھیں، مثلاً یہی کہ، اگر ہندوستان میں ہر عورت اپنے
پاؤں پر کھڑی ہو جائے تو پھر یہ ملک بھی انگلینڈ کی برابری کر سکے گا۔

وہ کھٹ کھٹ کرتی زینے چڑھنے لگیں۔
 ”کچھ کلکلی کی بھی خبر کی؟“ ممی نے سرگوشی کی۔
 ”نہیں ممی!“ عالیہ نے چپکے سے جواب دیا۔
 ”اور ہمارے ابا نے بھی خط لکھا؟“

عالیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بچے کے گال سلتاتی رہی۔ ممی جواب نہ پا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

سب کو پوچھا مگر جیل بھیا کو بھول گئی، اس محبت میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ عالیہ کو عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

رات آسمان اس قدر صاف تھا کہ چاندنی دودھ میں نمائی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ آنگن میں برابر سے بچے ہوئے پلنگوں میں آج ایک ننھے سے کھٹولے کا اضافہ ہو گیا تھا اور اس کھٹولے پر پڑی ہوئی ایک ننھی سی بچی کی فوں غاں رات کو اور بھی خوب صورت بنا رہی تھی۔ کل کی موسلا دھار بارش نے آج کی رات کو ہلکا سا سرد کر دیا تھا۔ آج عالیہ نے بھی چھت پر سونے کے بجائے آنگن میں ممی کے برابر اپنا بستر لگوا لیا تھا۔ عجیب سی روغن کا احساس ہو رہا تھا۔ سب ایک جگہ جمع تھے، باتیں ہو رہی تھیں اور ممی کی بنیاد پر غوں غاں کسے جا رہی تھی۔ بس ایک نچر پھو پھو تھیں جو آج بھی سب سے الگ تھلگ جاہلوں کی محبت سے دور چھت پر اکیلے پڑی تھیں۔ ہاں بڑے چچانے بھی ممی سے ملنے کے بعد پھر گھر میں قدم نہ رکھا تھا۔ بیٹھک میں کھانا کھایا اور باہر چھوڑے پر بستر لوار کر لینے جانے کس سے باتیں کر رہے تھے۔

کریمین بوا اسارے کاموں سے فرصت پا کر اماں کے قریب زمین پر بیٹھ گئیں اور ممی کی بنیاد کو لوریاں دینے لگیں۔ ”آ جا رہی مندیا تو آ کیوں نہ جا“

”کریمین بوا ایک اچھی سی کمائی بنا دو۔“ ممی نے فرمائش کی۔ وہ اس وقت ذرا سی بچی لگ رہی تھی۔

”اب تو یاد بھی نہیں آتی، ممی بنیا۔“ کریمین بوا سوچنے لگیں۔

”ممی اب تو تم اتنی بڑی ہو گئی ہو، اماں بن چکی ہو، کچھ تو لحاظ کرتیں بڑے بچا کا۔“ عالیہ نے ضبط کرنے کے باوجود ممی کو ٹوک دیا۔

”بس جانے کیا ہو گیا تھا، میں ان سے معافی مانگ لوں گی بچیا۔“ وہ سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔ ”میں صبح چلی جاؤں گی“ وہ کریمین بوا کی طرف مڑ گئی۔ ”کریمین بوا اسرار میاں سے کہہ دینا کہ صبح آتا کہ لے آئیں اور مجھے گاڑی پر بٹھا دیں۔“

”ارے تو کیا تم اتنی جلدی چلی جاؤ گی ممی، ناراض ہو؟“ عالیہ اس کے پاس سرک کر کھڑی ہو گئی۔

”بھئی حد کرتی ہیں آپ بھی، میں آپ سے ناراض ہو سکتی ہوں؟ آپ کو کیا پتہ کتنی مشکل سے ایک دن کی اجازت ملی ہے، آپ نہیں جانتیں عالیہ بچیا، آپ نہیں جانتیں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے۔ جی تو یوں چاہتا ہے کہ میں پڑی رہوں۔ پر اب یہ میری بنیا جو ہے، ارے اس کا کوئی اچھا سا نام تو بتا دیں بچیا، اس کی وادی نے تو اس کا نام تیزن رکھا ہے۔“ ممی نام بتا کر ہنسنے ہنسنے لوٹ گئی۔

”تم رک کیوں نہیں سکتیں، آٹھ دس دن تک مت جاؤ۔“ گھر کتنا اچھا لگ رہا ہے، لگتا ہے ہمار آگئی۔“ عالیہ جذباتی ہو رہی تھی۔ تمہارے جانے کے بعد کیسا سناٹا چھایا ہے، ممی جی، ادھر جاتا ہے اس خاموشی سے۔“

”پھر آؤں گی بچیا۔“ ممی بڑے اشماک سے اپنی بنیا کو تھپک رہی تھی۔

گلی میں آٹھ رکا اور نچر پھو پھو ساری کا پلو سنواری گھر میں داخل ہوئیں۔ ”ارے واہ ممی آئی ہے، کیا حال چال ہے اور یہ تمہاری بیٹی ہے؟ بڑی پیاری ہے۔ باپ پر تو بالکل نہیں پڑی۔“ انوں نے پیار سے بنیا کے گال تھپتھپائے۔ ”اسے خوب پڑھانا ممی، ورنہ یہ بھی جاہل رہ جائے گی سب کی طرح۔“

”آپ کے پاس بھیج دوں گی، پڑھا دیتے گا نا؟“ ممی کا چھوڑا ہوا حیرانہ پھر بھی کی پیشانی کو بگاڑ گیا۔ ”اچھا پھر باتیں ہوں گی، ابھی تو میں تھکی ہوئی ہوں۔“

”کوئی سی کہانی سنا ڈالو کرہیں ہوا“ ہائے کتنے مزے کی ہوتی ہیں یہ کہانیاں بھی۔“ عالیہ بھی خند کرنے لگی۔ کتابوں کی دنیا سے وہ تھک چکی تھی۔ اس وقت تو اس کا بھتی چاہ رہا تھا کہ کوئی معصوم سی کہانی سنے۔

”ارے وہی کہانی سنا دو کرہیں ہوا کہ ایک بادشاہ تھا۔ اس کی سات بیٹیاں تھیں۔ ایک دن بادشاہ نے اپنی ساتویں بیٹیوں کو بلا کر پوچھا کہ تم کس کی قسمت کا لکھاتی ہو تو سب نے کہا، آپ کی قسمت کا مگر سب سے چھوٹی بیٹی نے کہا کہ میں اپنی قسمت کا لکھاتی ہوں اور بادشاہ نے اسے جگل میں ڈالوا دیا کہ اپنی قسمت کا لکھاؤ اور پھر جب وہ لڑکی جگل میں تھا بیٹی رو رہی تھی تو ایک دیو آیا اور اس نے لڑکی کے لئے محل بنایا اور۔۔۔ بس وہی سی کہانی سنا دو کرہیں ہوا“ اتنی بہت سی تو میں نے یاد دلا دی۔“ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”اچھا تو پھر سنو“ ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، ہاں تو اس بادشاہ کی سات لڑکیاں تھیں۔ ایک دن بادشاہ نے ان ساتوں کو بلا کر پوچھا۔۔۔“

کرہیں ہوا کہانی کے جاری تھیں مگر عالیہ نے ایک لفظ نہ سنا، وہ تو سوچنے لگی تھی کہ آخر بھی کوئی کہانی کیوں یاد آئی۔ کیا بھی کو اپنی قسمت سے کوئی امید تھی۔ وہ تو کتنی مدت سے اپنی بد نصیبی کے جگل میں بھگ رہی ہے مگر اب تک کوئی دیو نہیں آیا۔ ارے بھی یہ جو لوگ کچھ نہ پا سکتے کی حسرت میں معصوم معصوم کہانیوں سے جی سلاتے ہیں۔ ان میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

کہانی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ بھی کو نیند کی پری لے اڑی۔ جانے کس محل میں لے گئی ہوگی، جانے کس شہزادے کے پہلو میں بٹھا آئی ہوگی۔

صبح بھی چلی گئی مگر اسکول جاتے ہوئے عالیہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ رنجیدہ ہے، آج وہ اسکول میں جی سے پڑھانہ سکے گی، کچھ دن کے لئے بھی رک ہی جاتی تو کیا تھا۔

ٹاگا سا کی پر ہم کرتے ہی جنگ ختم ہو گئی تھی۔ جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ دلی سے جمیل بھیا کا خط آیا تھا کہ اب وہ جلد آجائیں گے اب ان کا کام ختم ہو گیا اور آج جب چار بجے وہ سو کر اٹھی تو اس نے دیکھا کہ سچ جمیل بھیا آ گئے ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ فوراً نچے چلی جائے یا بیٹیں بیٹھی رہے مگر اس طرح تو شاید بڑی بچی برا محسوس کریں اور آخر وہ یہاں بیٹھی ہی کیوں رہے۔ وہ نیچے اتر گئی۔ اماں اور بڑی چچی جمیل بھیا کو گھیرے بیٹھی تھیں۔ کرہیں ہوا جانے کا سامان تیار کر رہی تھیں۔ کتنی مدت بعد بڑی چچی کا چہرہ کھلا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”مگر آپ لوگ ڈرتی کیوں تھیں؟ میں تو دلی میں بیٹھ کر اپنے قلم سے جنگ لڑ رہا تھا۔ میرا محاذ پر کیا کام تھا۔“ جمیل بھیا ہنس ہنس کر کہہ رہے تھے۔ ”بس میں ڈرتی تھی کہ کبھی تم بھی لڑنے کو نہ بھیج دیے جاؤ“ جب کوئی بات ہوتی تو میں تڑپ جاتی۔ تم خط بھی تو نہ لکھتے جلدی، جب دیر ہوتی تو میں سمجھتی کہ تم کو بھی جنگ پر لڑنے بھیج دیا ہو گا۔“ بڑی چچی اپنی بے وقوفی پر شرما رہی تھیں۔ ”پھر تم کبھی آئے بھی تو نہیں ارے دلی اتنی دور تو نہ تھی۔“

”اور ہمارے ابا نے بھی کبھی نہ سمجھایا کہ میرا کیا کام ہے؟ میں کہاں کہاں جا سکتا ہوں۔ خواہ خواہ آپ پریشان رہیں۔“ جمیل بھیا بڑی چچی کے لپٹے جاتے تھے۔ ”اتنے دن نہ آیا تو کیا ہوا اب تو آگیا“ انہوں نے مزید دیکھا۔

”اوہ عالیہ بی بی“۔۔۔ وہ کھڑے ہو گئے۔ ”اچھی تو ہو“ اب تو تم بڑی آدمی ہو گئی ہو، ہم تو یوں ہی جاہل رہ گئے، مجھے پڑھاؤ گی کہ نہیں؟“

”یہ چھوٹے بوے کا کیا ذکر لے بیٹھے آپ“ سناٹے کیسے رہے؟“ عالیہ نے

ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی کوشش کی مگر جلد ہی نظریں بند ہو گئیں۔ فوجی وردی میں جیل بھیا خاصے خوب صورت لگ رہے تھے۔
 ”جتنی ہے تائی وردی، لگتا ہوں تائے وقف، یا پھر خوب صورت؟“ جیل بھیا شاید اسے چھیڑ رہے تھے۔

”جنگ کی کوئی بھی نشانی خوب صورت ہو سکتی ہے؟“ اس نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ارے بھی اماں جلدی کیجئے میں اپنی وردی اتاروں تاکہ کچھ تو خوبصورت لگوں، میرے بکس کہاں ہیں، آپ کپڑے نکال دیجئے۔“ جیل بھیا زور سے ہنسنے لگا۔ ”میں گھر آکر کتنا خوش ہوں، کتنی مدت بعد سو کر دیکھا ہے۔“ انہوں نے بڑی گہری نظروں سے عالیہ کی طرف دیکھا۔ ”دور رہ کر انسان کتنا صابر ہو جاتا ہے۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ”بھئی تم نے بھی کبھی مجھے یاد کیا تھا؟“ انہوں نے عالیہ سے پوچھا۔

”ہاں جب بڑی چچی آپ کو یاد کر کے روتی تھیں تو آپ یاد آ جاتے تھے۔“ اس نے بڑی بے تعلقی سے جواب دیا۔

”تم بالکل نہیں بدلیں، بالکل ویسی ہی ہو۔“

”آپ اپنے سلسلے میں کچھ بتائیے۔“ اس نے بات ٹالی۔

”اپنے لئے کیا ہاؤس، ملازمت سے چھٹی کر آیا ہوں، اب پھر وہی بیکاری ہو گی اور ہم۔“ انہوں نے بھیجی سی آواز میں کہا۔

”تو آپ نوکری چھوڑ دیوں آئے جیل بھیا، اب ظاہر ہے کہ بیکاری کا منہ دیکھنا ہی پڑے گا، پہلے آپ نے اس ملازمت کو کیسے قبول کر لیا تھا، بڑے ہچکچی ضد میں؟“

”اوہ! میں ان سے کیا ضد کروں گا۔“ ان کے لہجے میں سخت حقارت تھی۔ ”میرا مقصد پورا ہو گیا تو ملازمت بھی گئی۔ کوئی ضروری تھا کہ جو کیا ہے اس پر قائم رہوں؟ اب تو آزاد ہونے کے بعد ہی ملازمت کروں گا۔“
 ”دیکھو جیل میاں، یہ باتیں مت کرو، اب تو تم نے دیکھ ہی لیا کہ انگریز

سے لاکر بڑے بڑے ملکوں کو بھی کیا بھگتنا پڑا، اس لئے آزادی کے خواب دیکھنا چھوڑ دو۔“ اماں نے جیل بھیا کو سمجھایا۔

”ٹھیک کہتی ہیں آپ، میں تو اب سب کچھ چھوڑ چکا ہوں۔“ وہ سعادت مندی سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

”تم کھیل سے ملے تھے؟“ بڑی چچی نے جیل بھیا کو کپڑے دیتے ہوئے سوال کیا۔

”ملا تھا اماں مگر اس نے تو منہ پھیر لیا، وہ بڑا آدمی ہو گیا ہے، وہ ہم لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا چاہتا۔ آپ اس ٹالاف کو مت پوچھا کیجئے۔“
 ”جاؤ نالو۔“ بڑی چچی نے غصہ سی سانس بھری۔

”اماں ہمارے ابا کہاں ہیں؟“

”مجھ سے کہیں گئے ہیں، بس آتے ہی ہوں گے۔“ بڑی چچی نے بتایا۔

”کبھی بڑے چچا بھی آپ کو یاد آتے تھے؟ عالیہ نے ہنس کر پوچھا۔

”ابا کبھی مجھے یاد کرتے تھے؟“ وہ بھی ہنسنے لگا اور پھر اس کی طرف مڑ گئے۔
 ”اور تم تو مجھے یاد کرتی ہی نہیں تھیں۔“ انہوں نے بڑی امید سے اس کی طرف دیکھا۔

”ان یادوں وغیرہ سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔“ اس نے نظریں جھکا لیں۔

وہ چپ ہو گئے۔ چند منٹ تک کچھ سوچتے رہے اور پھر کریکین ہوا کے پلٹ کر کھڑے ہو گئے۔ میری کریکین ہوا تم تو مجھے یاد کرتی تھیں نا، تم آج میرے لئے کیا پکار رہی ہو؟“

”میں نے تو تڑپ کر دن گزارا ہے، آپ کی نمک خوار ہوں جیل میاں۔“ کریکین ہوا نے ان کی بلائیں لے لیں۔ ”اپنے جیل میاں کے لئے پلاؤ پکار رہی ہوں۔“

جیل بھیا نے آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے منہ پھیر لیا۔ کاش آج اس کی چھٹی نہ ہوتی، آج بھی وہ اسکول میں لڑکیوں سے سر کھپا رہی ہوتی۔
 ”ارے ہاں وہ ہماری نجمہ پوچھی کہاں ہیں اماں؟“ جیل بھیا نے پوچھا۔

ٹیلٹے ہوئے اس کے پاس سے گزرے تو اس نے اطلاع دی۔ ”بھئی آئی تھی۔“
 ”اچھا! جیل بھینا نہ لٹکائے آگے بڑھ گئے اور جب دوسرے چکر میں اس
 کے پاس سے گزرے تو وہ پھر بھی چپ نہ رہ سکی۔“ اس نے آپ کو ذرا بھی
 یاد نہ کیا اس کی ایک بیماری ہی کیا ہے۔“

”بہت خوب! اگر میں نے کب کہا ہے کہ تم ساری کٹھنا ڈالو! میں نے کب
 چاہا تھا کہ وہ مجھے یاد کرے۔“ وہ ہنسنے لگا امان کے پاس جا بیٹھے۔
 جیل بھینا کو سنا کر اسے بڑی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ان کے
 ٹیلٹے اور اسے چھو کر نکل جانے کا سارا مزہ کر کر دیا تھا۔

”کریمن ہوا جلدی سے کھانا تیار کر لو! کھانا کھا کر باہر نکلوں! کچھ دیکھوں
 بھالوں۔“ جیل بھینا سخت بد مزہ ہو رہے تھے۔
 ”لو اتنی جلدی پڑھنی باہر نکلنے کی؟“ بڑی چچی نے پیار بھرے عصبے سے ان کی
 طرف دیکھا۔

”کاروبار جو دیکھنا ہوا بڑی چچی۔“ عالیہ نے طفر کیا۔ مگر سب اس قدر
 موڈ میں تھے کہ کچھ سمجھے ہی نہیں اور ہنسا شروع کر دیا۔ جیل بھینا اسے اندھیری
 اندھیری آنکھوں سے تنک کر رہ گئے۔

کھانے کے بعد جیل بھینا باہر چلے گئے اور عالیہ اوپر اپنے کمرے میں آگئی۔
 رات بدل گئی تھی۔ اب دن میں معمولی سی گرمی ہوتی۔ پھر بھی اسے محسوس
 ہو رہا تھا کہ آج تو بڑے زور سے گرمی پڑ رہی ہے! اس کا سارا جسم جل رہا ہے وہ
 آرام نہیں کر سکتی۔ ساری دوپہر بستر پر کروٹیں بدل کر گزر گئی۔ وہ اپنے متعلق
 سوچ سوچ کر تھک چکی تھی۔

شام کو جب عالیہ چائے پینے کے لئے نیچے اتری تو جیل بھینا اپنی لوہے کی
 کرسی پر بیٹھے شاید چائے کا انتظار کر رہے تھے۔ ”عالیہ بی بی!“ انہوں نے دھیرے
 سے پکارا۔

”جی!“ وہ آگے بڑھتے بڑھتے رک گئی۔

”یہاں آکر عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔ دوری بھی کتنی اچھی چیز ہوتی

”وہ تو اب اس گھر سے ختم ہیزا رہتی ہیں! اس لئے اپنی ایک سہیلی کے
 گھر جا بیٹھتی ہیں! وہ بھی ان کے کالج میں پڑھاتی ہیں۔“ بڑی چچی نے جواب دیا۔
 ”پھر تو یقیناً وہ بھی انگلش میں ایم اے ہوں گی! ویسے دوستی کیسے ہو سکتی
 ہے۔“ جیل بھینا نے ایک قہقہہ لگایا اور کپڑے اٹھا کر غسل خانے چلے گئے۔

بڑی چچی سخت مصروف تھیں، جیل بھینا کے بس ٹھیک ہو رہے تھے، اماں
 تخت پر دسترخوان بچا رہی تھیں اور عالیہ سر نیو ڈائے سوپے جا رہی تھی کہ اب
 اس گھر میں کیسے گزارہ ہو گا۔ یہ ہر وقت کی ذہنی اذیت کیسے برداشت ہو گی! جیل
 بھینا تو جنگ ختم کر آئے مگر اب اس کے ذہن میں جو جنگ ہو گی اسے کون سا ایلم ہم
 ختم کرے گا۔

”جیل آگیا ہے تو گھر کیسا اچھا لگ رہا ہے۔“ بڑی چچی نے اماں کی طرف
 دیکھا۔

”گھر کا مالک جو ہے! اسی کے دم سے روتی ہے بڑی بھابی۔“ اماں نے نال
 ہو کر کہا۔

”اس گھر کے مالک بڑے بچا ہیں۔“ عالیہ خواہ خواہ منہ میں کوو پڑی۔
 اماں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ جب سے وہ کھانے کھانے کے لائق ہوئی
 تھی! اماں اس کی ساری باتوں کو چپکے سے پی جایا کرتیں۔

عالیہ بڑے بچا کے لئے بڑے تکیے لگتی۔ جانے صبح سے کہاں مارے پھر رہے ہیں،
 نہ وقت پر کھانا ہے نہ آرام! کتنے کڑور ہو گئے ہیں اور اب تو جیل بھینا آگئے ہیں!
 ہر وقت کا مقابلہ ہو گا۔ اتنے دن سے چھڑے ہوئے یہ باپ بیٹے جانے کس طرح
 ملیں گے۔

جیل بھینا نہ کر نکل آئے۔ اماں انہیں اپنی جاگیر کی طرح سمیٹ کر پہلو میں
 بٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ عالیہ کی جان سگ اٹھی۔ وہ اپنی اماں کی اس
 محبت کی ذمہ دار نہیں۔ وہ انہیں جیل بھینا جیسا شاندار داماد دینے سے قطعی مجبور
 ہے۔

جیل بھینا اماں کے پاس دو چار منٹ بیٹھنے کے بعد اٹھ کر ٹیلٹے لگے اور جب

ناں اور بڑی چچی چائے پینے کے لئے آ رہی تھیں۔

شام کی اداسی ہر طرف رچی ہوئی تھی۔ سورج پتیل کے گھنے درختوں کے پیچھے ڈوب رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے پھٹ پر ٹٹلنے لگی۔ قریب کے گھروں سے دھواں اٹھ اٹھ کر فضا کو بو جھل بنا رہا تھا، مصالحوں اور بگھار کی خوشبو ہوا میں بسی ہوئی تھی۔

ٹٹلنے ٹٹلنے تھک کر وہ کمرے کی چوکھٹ پر بیٹھ گئی۔ سورج ڈوبنے ہی ہوا سرد ہو گئی تھی۔ اسے اپنے ہاتھوں میں ٹھنڈک دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ جمیل بھیا نے آتے ہی اسے پریشان کر دیا تھا۔ اس کا سکون درہم درہم ہو رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ جمیل بھیا جب دنیا میں کسی شے سے ناٹے کو نہیں مانتے تو محبت پر کس طرح ایمان لے آئے۔ یہ حضرت انسان بھی خوب چڑھتے ہیں، نہیں مانتے تو خدا کو بھی حرف غلط سمجھتے گتے ہیں اور جب ماننے پر آتے ہیں تو بیرون کی چوکھٹ پر اس کا جلوہ دیکھتے گتے ہیں۔ ”جمیل بھیا تم نے مجھے کس مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔“ سوچتے سوچتے وہ بڑبڑانے لگی۔

زیوں پر کھڑپڑ ہوئی اور نجمہ پھو پھی آکر آرام کرسی پر دراز ہو گئیں۔ سارا دن اپنی دوست کو بھگت کر آئی تھیں، اس لئے خاصی تھکی تھکی نظر آ رہی تھیں۔ عالیہ ان کے کمرے کی چوکھٹ سے اٹھنے ہی والی تھی کہ نجمہ پھو پھی نے کھٹکار کر اسے آواز دی۔ ”ادھر آؤ عالیہ۔“

اس نے چونک کر نجمہ پھو پھی کی طرف دیکھا، مارے حیرت کے اس سے اٹھا نہ جا رہا تھا نجمہ پھو پھی پہلی بار اسے اپنے پاس بلا رہی تھیں۔

”کئے۔“ وہ مسہری پر ان کے پاس تک گئی۔

”اس گھر میں کوئی اس لائق نہیں جس سے بات کی جائے، گھر میں سہی، پھر بھی تم نے تھوڑا بہت پڑھا تو ہے، شاید تم مجھے مشورہ دے سکو۔“ نجمہ پھو پھی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

”مشورہ دینے کی صلاحیت تو نہیں پھر بھی شاید کچھ سوچ سکوں۔“ اس نے اپنے منہ کو قابو میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

ہے۔ فاصلے بہت کچھ مٹا دیتے ہیں۔“ انہوں نے لمبی سانس لی۔

”ٹھیک ہے جمیل بھیا۔“ اس نے نظریں جھکا کر ہوئے جواب دیا اور جلدی سے برآمدے میں چلی گئی۔

اماں ابھی تک کمرے سے نہ نکلی تھیں اور بڑی چچی جانے کنی اختلالات میں مبتنی ہوئی تھیں۔

کریمین بوائے چائے دم کر کے پتائی پر رکھ دی، تو اس وقت بڑے بچا شیردانی کے بٹنی کھولے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

عالیہ پیالیوں میں چائے بنا رہی تھی کہ سب چھوڑ چھاڑ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

”السلام علیکم۔“ جمیل بھیا نے کمرے ہو کر کہا۔

بڑے بچے جیسے چونک کر جمیل بھیا کو دیکھا۔ ”وعلیکم السلام۔“ وہ منہ ہاتھ دھونے کے لئے چوکی پر بیٹھ گئے۔ ”سب خیریت ہے؟“

”سب خیریت ہے۔“ جمیل بھیا چائے کی پیالی اٹھا کر پھر کرسی پر جا بیٹھے۔

عالیہ چائے بنانے لگی۔ یا اللہ یہ! باپ بیٹے ہیں! اتنی مدت بعد یہ اسی طرح مل سکتے تھے؟ نظریے کی کھائی دونوں کے سچ میں حائل ہے، دونوں میں سے کوئی بھی اسے بھلا گتے پر تیار نہیں، پھر بھی شکر ہے کہ کبھی کی طرح جمیل بھیا نے منہ نہیں پھیرا۔

منہ ہاتھ دھو کر بڑے بچا بیٹھک میں چلے گئے اور کریمین بوائے وہیں چائے پہنچا دی۔

”زندگی کٹھن بھی ہے اور آسان بھی، یہ سب کچھ انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے کہ وہ اپنی زندگی سے کس طرح کا سلوک کرنا چاہتا ہے، کیا خیال ہے تمہارا؟“

انہوں نے چائے کی غالی پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔ ”ایک پیالی اور بنا دو عالیہ لی لی۔“ جمیل بھیا اس وقت بہت رنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

”بھرا بھی یہی خیال ہے، اگر آپ چاہیں تو اپنی زندگی کو آسان بنا سکتے ہیں۔“ عالیہ نے ان کی طرف پیالی بڑھائی۔ ”لیجئے لیجئے۔“ وہ پیالی پھرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نازک بحث سے بچنے کے لئے اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

”شادی کے متعلق ہمارا کیا خیال ہے؟ میرے ساتھ کی ساری کچھ ر
شادیاں کر رہی ہیں۔“
”آپ بھی کر لیجئے، میرا خیال ہے کہ شادی اچھی چیز ہوگی، خصوصیت سے
آپ کے لئے۔“ اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”یعنی صرف میرے لئے؟ کتنی فضول بات کر رہی ہو، کیا تم شادی نہیں کرو
گی؟“ وہ ذرا سا پھر گئیں۔ ”خیر تمہاری شادی تو گھر ہی میں جہل و دہل کے
ساتھ ہو سکتی ہے، تم کو اس سے زیادہ کامیل مل سکتا ہے، مگر میرے لئے میرے برابر کا
آدی ملنا مشکل ہے۔“

عالیہ کا بی چاہا کہ نچر پھوپھی کے منہ پر قہقہہ دے مگر وہ ضبط سے کام لے
گئی۔ تو کتنے کے بعد تو بات ختم ہو جاتی تھی اور اس کا بی چاہ رہا تھا کہ بات ختم نہ
ہو، وہ خوب کھڑی کھڑی سنالے۔ ”دیکھئے نچر پھوپھی جہاں تک جہل و دہل کی
قابلیت کا سوال ہے تو اس گھر میں کوئی ان کی برابری نہیں کر سکتا، ویسے میں ان کو
بحیثیت انسان پسند نہیں کرتی۔ وہ میرے چچا زاد بھائی ہیں اور بس، اس لئے آپ
دوسرے رشتے مت سوچئے۔ اپنی بات کیجئے، میرا خیال ہے کہ اس اتنے بڑے ملک
میں کسی نہ کسی شخص نے انگریزی میں ایم اے ضرور کیا ہو گا اور وہ آپ کا شوہر
بن سکے گا۔ اس کام کے لئے آپ ڈھنڈورا پیٹا دیجئے۔“

”یہ سب کیا بکواس کر رہی ہو، اس گھر میں سب جاہل ہیں، میں کس سے
مشورہ کروں خدا یا۔“

”آپ اتنی عظیم ڈگری رکھنے کے بعد بھی کسی سے مشورے کی ضرورت
سمجھتی ہیں؟“ عالیہ اٹھ کر چھت پر آگئی۔ نچر پھوپھی کیا کہتی رہ گئیں، اس نے کچھ
بھی نہ سنا۔

”سب لوگ کھانا کھا لو۔“ نیچے صحن میں کھڑی ہوئی کریمین بوا پکار رہی
تھیں۔

اس گھر میں وقت نکٹھن ہے۔ زندگی بل صراط پر گزرنے کا نام ہے۔ کتنا
اچھا ہو تاکہ وہ یہاں سے بھاگ سکی۔ جہل و دہل سے بچنا چھڑا سکتی، مگر یہ سب کچھ
کتنا ناممکن تھا۔ اگر وہ چلی جائے تو بڑے چچا کیا کہیں گے، یہی ناکہ جب اپنے پیروں
پر کھڑی ہو گئی تو آنکھیں پھیر لیں۔ اب تو گھر کی حالت بھی پہلی جیسی ہو گئی تھی۔
جہل و دہل ملازمت سے سکدوش ہو کر جو بیٹھے تو آج تک بیکار تھے۔ بڑی چچی نے
تھوڑی بہت رقم جمع کی تھی۔ وہ اس بیکاری کے زمانے میں ختم ہو چکی تھی۔ عالیہ
نے کتنا چاہا کہ بڑی چچی کو اماں سے چھپا کر کچھ دے دیا کرے لیکن انہوں نے بڑے
بیارے انکار کر دیا۔ شاید وہ اماں سے ڈرتی تھیں۔ جب سے وہ ملازم ہوئی تھیں،
اماں کے طعنے کتنے خوفناک ہو گئے تھے۔ انہیں اس گھر سے کتنی خست نفرت ہو گئی
تھی۔

ایک ایک دن بیمار کی رات کی طرح گزر رہا تھا۔ دسمبر کی سخت سردی
پورے عروج پر تھی۔ صبح نو دس بجے تک کمر کی وجہ سے اندھیرا چھایا رہتا۔
برآمدے کے پرے آندھیوں، بارشوں اور دھوپ میں پہلے ہی اپنی ساری حقیقت
کھو چکے تھے۔ اب کی سردی میں تو ہوا ان پردوں سے یوں گزر جاتی جیسے میدان
میں فرانے بھر رہی ہو۔ کریمین بوا کی کڑور ہڈیاں سردی میں کڑکراتی رہتیں اور
وہ چو لھے کی کھکھی میں گھس کر بیٹھے ہوئے زمانے کی یاد میں ٹپکتے لگتیں۔ ”ہائے وہ
بھی کیسا زمانہ تھا جب والافوں کے پرے ہر دوسرے سال بدل دیئے جاتے۔ ادھر
دو چار سو راغ ہوتے ادھر نو کروں میں بانٹ دیئے جاتے، پر اب وہ زمانہ کہاں آئے
گا۔“

عالیہ نے کریمین بوا کو اپنا ایک پرانا سویٹر دے دیا تھا، جسے اتنی سردی میں

بچنے کے بجائے انہوں نے سینت کر رکھ دیا تھا۔ ”اگر یہ سویر بھی پھٹ گیا تو اگلی سردی میں کیا پنوں گی۔“ کریمین بوائے اپنے حساب بڑی سمجھ داری کا ثبوت دیا تھا۔

بڑے بچا کئی دن سے دہلی گئے ہوئے تھے اور اسرار میاں کو دو تین دن سے بخار آ رہا تھا۔ پتہ نہیں بیٹھک میں وہ کس عالم میں پڑے رہتے ہوں گے، ان کا علاج معالجہ کون رہتا، جیل بھیا کو جلے جلوسوں سے فرصت نہ ملتی۔ گھر آتے تو خالم عشق میں آگ لگی ہوتی۔ اب وہ اس آگ کو بجھاتے یا اسرار میاں کے پھٹتے ہوئے جسم پر دواؤں کے چھینے مارنے بیٹھ جاتے۔

عالیہ کا فکر سے برا چل چلا تھا۔ وہ ہر وقت سوچتی رہتی کہ پتہ نہیں ان کی طبیعت کیسی ہو گی جو نہ چائے آگنے کی صدا آتی ہے اور نہ کھانا لینے کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ کریمین بوا آپ سے آپ بڑ بڑاتی انھیں اور بیٹھک میں جا کر کھانا پانی ڈال آتیں۔ وہ خیریت پوچھتی تو سخت ناگوار سی سے بتاتیں کہ ”سب ٹھیک ہے“ بخار ہو گیا ہے کوئی بڑی بیماری تو نہیں۔“

خدا نہ کرے ان کو بڑی بیماری ہو۔ عالیہ اپنا کلیجہ مسوس کر رہ جاتی۔ کیا جی ہاتھ کا کہ اسرار میاں کے سر ہانے جا بیٹھے، ان کا سرد ہائے، انہیں اپنے ہاتھوں دوا پلائے، مگر اماں کی کڑی نظروں کے سامنے وہ ان کی اتنی پرانی روایتوں کو کیسے توڑ دیتی۔ اس خاندان میں کوئی بھی تو ان حرامی اولادوں کے سامنے نہ آتا تھا۔ نجدہ پھوپھی بے پردہ تھیں، اس کے باوجود کبھی اسرار میاں کا سامنا نہ کیا۔ کالج سے تانکہ آتا تو وہ خود ہی ہٹ جاتے، راہ چلتے دیکھتے تو منہ پھیر لیتے۔ ایک بار عالیہ بیٹھک میں گئی تو اسرار میاں بیٹھے تھے۔ وہ ان کی صورت بھی نہ دیکھ سکی تھی کہ اٹھ بھاگے۔ ”پردہ ہے بنیا۔“ اور وہ ہکا بکا کھڑی رہ گئی، اب ایسی حالت میں وہ اسرار میاں کی حصار داری کرتی بھی تو کیسے۔ کیا پتہ وہ اس حالت میں بھی ”پردہ ہے بنیا“ کہتے باہر بھاگ جائیں اور پھر اس کی اس حرکت سے اماں کے دل پر کیا مگرے گی۔ وہ کیا کہیں گی۔ اب تو اماں نے صرف اس کی خاطر اس مکان اور جیل بھیا دونوں سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ انہوں نے بڑی بے بسی کے ساتھ اس کے

آہم سر جھکا دیا تھا۔ سب کچھ کھو کر صرف اس کو اپنا سارا اپنا لیا تھا۔ پھر کیا قائمہ تھا کہ ان کا جی دکھایا جائے۔ ان کی اتنی پرانی روایات کو ٹھوکریں ماری جائیں۔ آخر کہیں تو اسے بھی بھگنا ہو گا۔

رات جب جیل بھیا کھانا کھانے گھر آئے تو گھرے ہوئے بادل اتنے زور سے گرج رہے تھے کہ کئی دہلا جاتا۔

”شاید اگلے پڑیں گے۔“ کریمین بوا بار بار کہہ رہی تھیں۔
”کس نے سر منڈوایا ہے کریمین بوا جو اگلے ضرور پڑیں گے۔“ جیل بھیا نے فحش کر پوچھا۔

آج بہت دنوں بعد ہنسنے بولنے کے موڈ میں نظر آ رہے تھے، ورنہ ادھر تو کچھ دنوں سے اس قدر خاموش رہنے لگے تھے جیسے منہ میں زبان نہ رہی ہو۔

”ارے میاں سر کے منڈا ہے، میرا ہی چونڈا منڈا رہا ہے، ذرا اسرار میاں کی خبر لے لو، بخار آ رہا ہے، کھانا پانی سب بیٹھک میں پہنچانا پڑتا ہے۔“ کریمین بوا سخت بیزار نظر آئے لگیں۔

”کیا ہو گیا اسرار میاں کو؟“ جیل بھیا چونک پڑے۔

”کہا جو تھا کہ بخار آ رہا ہے، بڑے میاں دلی گئے ہیں، ورنہ آپ ہی دوا دارو کر لیتے، ہمیں کیا پڑی تھی جو بیچ میں دخل دیتے، اب اگر اسرار میاں کو کچھ ہو گیا تو وہ آکر ناراض ہوں گے۔“

”میں انہیں دیکھ لوں گا کریمین بوا، ویسے کتنی سخت نفرت ہے مجھے اس آدمی سے!“

”اس لئے کہ وہ بیچارے ہم میں سے ایک نہیں ہیں؟“ عالیہ نے تڑپ کر سوال کیا۔

”یہ بات نہیں عالیہ بی بی، مجھے ان سے صرف اس لئے نفرت ہے کہ وہ ابا کے ساتھ رہ کر انہیں جیسے بن گئے ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ابا کے ساتھ بچہ کر مجھ پر کتنے چینی بھی کرتے ہیں۔ بس اب تو اتنی سرورہ گئی ہے کہ یہ دونوں حضرات اپنے ہاتھوں پر تلک لگاتے لگیں۔“ وہ سخت نفرت انگیز ہنسی ہنسنے لگی۔

تم، عیلمان رکھو عالیہ بی بی کہ مجھے ان کے ناجائز ہونے کا ذرا بھی خیال نہیں۔“
 ”خیر وہ تمہارے اپنے چچا کے برابر سہی مگر اب اس بیکار بحث سے کیا فائدہ۔“ اماں نے بیزار ہو کر کہا۔

”خدا نہ کرے، نصیب دشمن، بھلا اسرار میاں چچا کے برابر ہو سکتے ہیں۔“
 — کریمین بوا اماں کے طنز کو نہ سمجھتے ہوئے ایک دم بھرا انھیں۔ ”زمانے زمانے کی بات ہے کہ آج کل کی رانیاں اسے چچا بنا ڈالیں۔“ کریمین بوا زندگی میں پہلی بار گستاخی کر رہی تھیں۔

اماں، بڑی چچی اور جمیل بھی ان کی سمجھ پر ہنسنے لگے تو کریمین بوا بوکھلا کر روٹی پیلے لگیں، جمیل بھیانکھ کر بیٹھک میں چلے گئے۔

بادل بڑے زور سے گرے اور اس طرح بجلی تڑپی کہ سب نے سسم کر کانوں میں اٹھیاں دے لیں۔ ”ہل تو جلال تو“ آئی بلا کو ٹال تو۔ ”کریمین بوا زور زور سے پڑھنے لگیں۔“

”کیس بجلی گری ہے۔“ بڑی چچی نے سہمی ہوئی آواز سے کہا
 تیز ہوا سے پردے اڑے جا رہے تھے۔ جمیل بھیانکھ سے کھل کر ابھی بچ آگئیں میں تھے کہ ایک بار پھر زور سے بجلی تڑپی اور عالیہ جیسے چچ پڑی۔
 ”جلدی سے اندر بھاگ آئیے جمیل بھیا۔“

جمیل بھیانکھتے ہوئے اندر آ گئے۔ ”اولے پڑ رہے ہیں، مگر تم کیوں ڈر گئیں عالیہ بی بی؟“

”ڈری تو نہیں تھی، میں تو آپ کو بتا رہی تھی کہ بجلی کڑک رہی ہے۔“
 عالیہ نے بے وقوفوں کی طرح بات بنائی۔ وہ شرمندہ ہو رہی تھی کہ بھلا چچی ہی کیوں تھی۔ کون سی بجلی گر رہی تھی جمیل بھیا پر۔

”یہ حضرت انسان کو سمجھنا بھی کتنا مشکل کام ہے، جب یہ روشن ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو تاریک ثابت کرتے ہیں اور جب تاریک تو روشن نظر آنے کی سعی فرماتے ہیں۔“ جمیل بھیا نے عالیہ کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت وہ کتے نوش، اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔

”ٹھیک ہے جمیل بھیا، جس طرح انسان کو سمجھنا مشکل ہے اسی طرح یہ بھی سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ بعض وقت انسان کا فضل اس کے خیال سے جدا کیوں ہوتا ہے۔ یوں ہی بے مقصد جانے کیا کچھ کر گزرتا ہے۔“ اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔ اسے پتہ تھا کہ اس کی چچ کے ساتھ جمیل بھیا اس کے دل کے بھاگے ہوئے چور کو پکڑ کر سانسے لانا چاہتے ہیں۔
 ”یہ بھی ٹھیک ہے عالیہ بی بی۔“ وہ ایک دم بھگے گئے اور پھر ذرا دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔

بڑے چچا اس وقت کہاں ہوں گے اور کیا کر رہے ہوں گے۔ دھیان بھٹکانے کے لئے عالیہ نے سوچنا شروع کر دیا۔

کھانا ختم ہوا تو سب لوگ سردی کے ڈر سے اپنے اپنے بستروں کی طرف لپکے مگر عالیہ اپنی جگہ سے نہ اٹھی۔ اسے اوپر اپنے کمرے میں جانا تھا اور بارش تھمنے کے باوجود اب تک بجلی چمک رہی تھی۔ اس حالت میں وہ آگئیں کیسے پار کرتی۔ گرج چمک اسے بیشہ سے ڈراتی رہی تھی۔

پردہ سرکا کر اس نے باہر دیکھا۔ اندھیرے اور سیاہ بادلوں کے سوا کچھ بھی نظر نہ آیا۔ وہ ہمت کر کے آگئیں میں آگئی۔

”چلو میں تم کو اوپر تک چھوڑ آؤں“ — جمیل بھیا اس کے پیچھے باہر نکل آئے

”تم بجلی سے ڈرتی ہو؟“ زینے طے کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔
 وہ خاموشی سے زینے طے کرتی رہی۔ شاعروں سے بجلی کی بات چھیڑنا سخت خطرناک بات ہوتی ہے۔ مجھ بھی بھوئی لاف میں منہ چھپانے سو رہی تھیں۔ وہ دبے قدموں اپنے کمرے میں آگئی۔ جمیل بھیا دروازے کے بیچ میں کھڑے رہے۔

”اچھا بھتیجی، آپ بھی جا کر سو رہے۔“ وہ دھیرے سے بولی۔
 ”میں تھوڑی دیر تمہارے پاس بیٹھ جاؤں؟ کیا پتہ پھر بجلی کڑکنے لگے۔ اکیلے

میں تم ضرور ڈر جاؤ گی۔“ وہ آگے بڑھ آئے۔
 ”میں قطعی نہیں ڈرتی، آپ جا کر سو رہے۔“ اس نے بے رخی سے کہا

اور اپنے لحاف میں دبک گئی۔

جیل بھیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسی طرح کھڑے جانے کیا سوچتے رہے اور وہ لحاف کے اندر کا پتلی رہی — جانے اب یہ کیا کہیں گے۔

پندرہ بیس منٹ پندرہ بیس صدیوں کی طرح گزر گئے پھر وہ ایک دم چلے گئے۔ انہوں نے کچھ نہ کہا۔

صدیوں کو گزار کر جب اس نے اطمینان کی سانس لی تو پھر خیال آیا کہ اگر جیل بھیا تھوڑی دیر یہاں اور بیٹھ لیتے، کچھ باتیں کر لیتے تو کیا مضافہ تھا۔

اس سر پھرے خیال سے بچنے کے لئے عاید کو اسرار میاں یاد آ گئے — جانے اب ان کی کیا حالت ہو گی، کیا بیماری میں انہیں کسی کی ضرورت نہ محسوس ہوتی ہو گی۔ بخار سے سر پھٹ رہا ہو گا اور ان کا کیسا ہی چاہتا ہو گا کہ کوئی ان کے پاس بیٹھے، کوئی انہیں پوچھے، اس وقت تو کوئی محبت سے دیکھے۔ پر ان کا تو کوئی نہیں، وہ تو تنہا آسمان سے ٹپک پڑے۔ آج اس بیماری اور تنہائی میں وہ جانے اپنے لئے کیا سوچ رہے ہوں گے۔ اسرار میاں کے لئے آہیں بھرتے بھرتے وہ گمری نیند سو گئی۔

صبح آسمان بالکل صاف تھا۔ سورج بڑا چمکیلا ہو رہا تھا اور جب وہ اسکول جانے کی تیاری کر رہی تھی تو تین دن بعد اسے اسرار میاں کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دے گئی۔ ”کریمین ہوا اگر سب لوگ چائے پی چکے ہو تو مجھے بھی دے دو“ کزوری لگ رہی ہے۔“

صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے اور ہمارے دنوں کو پھیلائی کر پھول کھلا دیتے ہیں۔ ایک ڈیڑھ مہینے پہلے کریمین ہوانے کی باری کا کوڑا صاف کر کے اسے گھٹے تک گڈوا تھا اور پھر چچ بو کر اطمینان کی سانس لی تھی۔ اب کھلے ہوئے پھول دیکھ کر وہ خوش ہو رہی تھی، مگر بڑی چچی سے تو یہ بھی نہ ہوتا کہ وہ پھول توڑ کر اس گرد سے بھرے ہوئے گلخان کو صاف کر کے سجاد دیں۔ ان کے دل میں بہار کا گزرنہ تھا۔ پھولوں میں کوئی دلکشی نہ تھی۔ ٹھیکل ان کے دل میں سدا خزاں کا چچ بو گیا ہے۔ جیل بھیا اس چچ کو سٹیج رہے ہیں اور بڑے چچا — بڑے چچا کے لئے اسے کوئی بری بات نہ سوچنا چاہئے۔ وہ اپنے آپ کو ملامت کرتی۔

گھر کی حالت بڑی خراب ہو گئی تھی۔ جیل بھیا نے ملازمت کی کوشش ہی نہ کی، سارا دن مسلم لیگ کے دفتر میں کام کرتے اور تھوڑا سا معاوضہ مل جاتا۔ بڑی چچی کو یہ معاوضہ دے کر وہ سارے مہینے کے لئے بے خبر ہو جاتے اور سارا مہینہ بڑی چچی سے انتقام لے لے کر گزر جاتا۔

ان دنوں بڑے چچا کے بیروں میں سنبھ ہو گیا تھا۔ آج یہاں، کل وہاں۔ انگلستان کی لیبر وزارت نے ہندوستان کو آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اماں نے یہ خبر اس طرح سنی تھی جیسے چنڈ دھانے سے اڑائی گئی ہو۔

ادھر آزادی کے فیصلے کے ساتھ باپ بیٹے ایک دوسرے کی صورت سے بیرار ہو گئے تھے۔ پاکستان بنے گا، پاکستان نہیں بنے گا — اور اس کشمکش کے عالم میں اسے بھی بری طرح یاد آ گئی۔ اگر آج کو وہ بھی اس گھر میں بیٹھی رہتی تو کیا ہوتا۔ آزادی ملنے سے پہلے ہی سب اپنا اپنا سر پھوڑ کر خدا کو پیارے ہو چکے ہوتے۔

آج پندرہ میں دن بعد بڑے بچا گھر میں داخل ہوئے تھے اور برآمدہ، میر، بچے ہوئے بنگ پر سکون سے لیٹے اپنا سر سلا رہے تھے۔ اتنے دن بعد انہیں گھر میں لیٹے دیکھ کر عالیہ چائے کی پیالی لے کر ان کے پاس جا بیٹھی۔ بڑے بچا اٹھ کر چائے پینے لگے۔

”انگریز کتے ہیں کہ اب ہندوستان آزاد ہو جائے گا؟“ بڑی چچی بھی ہنستی ہوئی آگئیں۔

”ہاں انہیں آزاد کرنا ہی ہو گا! بس تھوڑے دن اور گزریں گے، بے ایمان قوم ہے۔“ بڑے بچا جوش میں آگئے۔

”پھر جب آزادی مل جائے گی تو تم اپنی دکانوں پر بیٹھو گے؟“ بڑی چچی نے پوچھا ان کی آنکھوں سے اشتیاق نکل رہا تھا۔

”بیٹھوں گا کیوں نہیں، تم دیکھنا اس کے بعد دکانیں کیسی چلتی ہیں، اپنی حکومت سے تو دکانوں کو چلانے کے لئے امداد بھی مل جائے گی۔“

”اچھا اپنی حکومت امداد بھی کر دے گی؟ ہائے کتنا اچھا ہو گا۔“ بڑی چچی کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

”بڑے بچا آج آپ گھر میں لیٹے کتے اچھے لگ رہے ہیں، جب آپ ہوتے ہیں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے۔“ عالیہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

”اور میں تمہارا باپ نہیں تو پھر کیا ہوں بچی۔“ بڑے بچا نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ”اور جب آزادی مل جائے گی تو میں اپنی بیٹی کو ولسن بناؤں گا۔ اور بہت شاندار پڑھا لکھا دو لہا لاؤں گا! آئیے نا؟“ انہوں نے بڑی چچی کی طرف دیکھا وہ دونوں ہنسنے لگے مگر عالیہ بڑے بچا کے سینے میں محبت کی گرمی محسوس کر کے دھیرے دھیرے رو رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ اللہ اس ملک کو جلدی سے آزاد کر دے، بڑے بچا اپنے گھر واپس آ جائیں اور پھر شام کو اسی گھر میں لیٹ کر بڑی چچی سے باتیں کریں۔ معنی کی خیریت پوچھیں، ساجدہ آپا کو بیکے آنے کے لئے خط لکھیں، جمیل بھیا کے لئے ولسن تلاش کریں اور

کلیل کو ڈھونڈ کر گھر لے آئیں۔

”اری بچی رو رہی ہے۔“ بڑے بچا نے اپنے کھدو کے کرتے کے پار آنسوؤں کی نمی محسوس کر لی تھی۔ ”مت رو میری بیٹی۔“

”کرکین ہوا بڑے بھیا سے کہو کہ حکیم صاحب اور ہریال بابو آئے ہیں۔“ اسرار میاں کی آواز آئی تو بڑے بچا ایک دم اٹھ پڑے۔ وہ اسے چپ کرانا بھی بھول گئے۔ عالیہ نے آپ ہی آپ آنسو پونچھ ڈالے۔ کیسا جی امنڈ رہا تھا۔ ابھی تو وہ رونا چاہتی تھی۔

رات جب سب لوگ کھانا کھا رہے تھے تو جمیل بھیا بڑے جوش و خروش سے بولتے جا رہے تھے۔ مطالبہ پاکستان ایک ایسی حقیقت ہے جیسے ہم آپ بیٹھے ہیں۔ کانگریسی لاکھ روڑے اٹھائیں مگر کچھ نہیں کر سکتے۔ دس کروڑ مسلمانوں کے اس مطالبے کو کون روک سکتا ہے۔

”تو کیا سارے مسلمان پاکستان جا کر رہیں گے؟“ بڑی چچی نے پوچھا۔

”واہ اس کی کیا ضرورت پڑے گی، جو جہاں سے وہیں رہے گا۔“

”مگر ہندو ہمیں رہنے کیوں دیں گے، وہ نہیں کہیں گے کہ اپنے ملک جاؤ۔“

”ان کے ہندو جو ہمارے پاکستان میں ہوں گے۔ ہم ان سے کب کہیں گے کہ جاؤ۔“

جمیل بھیا کی دلیل بڑی چچی کی سمجھ میں آگئی تو انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔

”ہاں جمیل میاں یہ جانے والے کی بات بری ہے، میں بھی یہ گھر نہیں چھوڑ سکتی۔“ کرکین ہوا بھی آخر بول ہی پڑیں۔

”اور میں کب چھوڑ رہا ہوں اپنا گھر؟ میں تو بس اسرار میاں کو بھیج دوں گا پاکستان۔“ جمیل بھیا مزے میں آ کر ہنسنے اور کرکین ہوا نے کھیا کر برتن اٹھانے شروع کر دیئے۔

”پھر تم اپنی ایک دکان تو سنبھال ہی لیتا، تمہارے ابا اب تھک چلے ہیں، اور پھر تم ان کا ادب بھی کرو گے نا؟“

”میں سب کچھ کروں گا اماں، جو کچھ آپ کہیں گی وہی ہو گا“ بس پاکستان بن جانے دیجئے۔“ جمیل بھیا باتیں کرتے ہوئے بار بار عالیہ کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ اور وہ بے تعلق سی بیٹھی کھانا کھائے چلی جا رہی تھی۔ جانے آج کل اتنی بھوک کیوں لگتی ہے۔

”حد ہے، ہر وقت یہی باتیں، کھانا پینا حرام ہو گیا ہے۔“ اماں باتیں سن سن کر ایک دم جھلا اٹھیں۔ بس آپ تو عقل مند صرف تمہارے ملک کے لوگ رہ گئے ہیں، انگریز پھارے تو نے بے وقوف ہیں کہ آزادی باغی اور پچکے سے اپنے ملک لوٹ گئے۔ ارے اچھی تو برسوں جھگ مارا جب بھی آزادی نہیں ملتی۔“

”انہیں کون کا فرے وقوف سمجھتا ہے مگر اب دقت انہیں بے وقوف بننے پر مجبور کر رہا ہے، اگر نہ گئے تو نکال دیئے جائیں گے۔“ جمیل بھیا بھی جوش میں آ گئے۔

”خدا کی شان ہے۔ کیا بڑھ بڑھ کر باتیں مار رہے ہو“۔ اماں مجاز کراٹھ گئیں۔ ”کرہیں ہوا میرا کھانا میرے کمرے میں پچھا دو۔“ اماں جانے لگیں تو جمیل بھیا نے پکڑ لیا۔ ”چلے چھوڑیے چھوٹی چچی، اب اگر آزادی کا نام بھی لوں تو جو چرکی سزا دو میری۔“

بات مذاق میں نکل گئی مگر اماں کا موڈ ٹھیک نہ ہوا۔ کھانا کھاتے ہی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

سرور کا زور رکھتے ہی سب برآمدے میں سولے لگے تھے۔ پنے ہوئے پردے لپیٹ کر کب کے باندھ دیئے گئے تھے۔ اس وقت چاندنی برآمدے میں داخل ہو کر بہتوں پر لوٹ رہی تھی۔

جمیل بھیا اتنی ہیست یا باتیں کرنے کے بعد اب صحن میں نکل رہے تھے اور عالیہ بڑی چچی کے پاس بیٹھی چھالیا کات رہی تھی، اماں سب سے ردھ کر اپنے کمرے میں نہ جانے کیا کر رہی تھیں۔

”بڑے بھیا کہاں ہیں؟“ نجمہ پھوپھی اوپر سے آکر بڑی چچی کے پاس نکلیں۔ وہ کچھ فکر مند سی نظر آ رہی تھیں۔

”بھٹک میں ہوں گے، بلوالو۔“ بڑی چچی نے جواب دیا۔

”دیکھو کرہیں ہوا اگر کوئی نہ ہو تو بلا لاؤ۔“ نجمہ پھوپھی نے آکر کہا۔

بڑے چچا کے آتے ہی جمیل بھیا اپنے کمرے میں چلے گئے۔ عالیہ کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آج نجمہ پھوپھی کیا بات کرنا چاہتی ہیں جو اس قدر فکر مند ہو رہی ہیں۔

”بڑے بھیا، وہ بات یہ ہے کہ میں نے اپنے لئے زندگی کا ساقی تلاش کر لیا ہے، بس آپ کو اطلاع دینی تھی۔“ انہوں نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

سب حیران ہو کر ان کا منہ نکلے گئے۔ بڑے چچا آنکھیں جھکا کر خاموش بیٹھے تھے کیا انعکاش میں ایم اے کے کرکے انسان اپنی تہذیب پر لات مار دیتا ہے۔ نجمہ پھوپھی بھی کچھ بڑی چچی کے ذریعے بھی کھلا سکتی تھیں۔ عالیہ نے نفرت سے بڑی چچی کی طرف دیکھا۔

تو پھر ضرور کرو شادی، ہم سے کو، فوراً انتظام کر دیں گے۔“ بڑی چچی کھسیا کر بٹنے لگیں۔

”کیا انتظام کریں گی آپ، کیا میں جھمی ہوں جس کی شادی پر میرا شیش ہلائی جائیں گی، دھول پٹنی جائے گی اور میرا جینز سلے گا، میں خود جینز ہوں۔“ نجمہ پھوپھی سخت غرور ہو رہی تھیں۔

”تم جب کوئی میں شریک ہو جاؤں گا۔“ بڑے چچا اٹھ کر باہر چلے گئے۔

”بس گرمیوں کی چھٹی میں نکاح ہو جائے، پھر ہم لوگ شیلے چلے جائیں گے۔“ نجمہ پھوپھی نے بڑی چچی کو اطلاع دی اور خود بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”وہ کون ہیں صاحب؟“ بڑی چچی سے پوچھتے بغیر نہ رہا گیا۔

”ہمارے کالج کے کنجراہ کے بھائی ہیں، انہوں نے بھی انعکاش میں ایم اے کیا ہے۔ بہت زبردست تاجر ہیں۔“ وہ کھٹ پٹ کرتی زبوں پر ہو لیں۔

ذرا دیر تک سب چپ رہے۔ کوئی کسی سے نہ بولا مگر جیسے ہی جمیل بھیا پھر سے آکر شیلے لگے تو بڑی چچی نے دھیرے سے اطلاع کر دی دی۔ ”تمہاری نجمہ پھوپھی شادی کر رہی ہیں۔“

”اچھا تو اس وقت وہ یہی کچھ بتانے آئی تھیں؟“

”ہوں!“ بڑی چچی سر جھکا کر پاؤں بنائے گئیں۔

”ڈھول نہ باجے، دلہن نہ بنیں، یہ بھی کوئی شادی ہوئی، زمانے بدل گئے۔ سوا سو مہینے تک لڑکی کو مانگتے بٹھاتے تھے۔ باپ بھائیوں کا سایہ تک نہ دیکھتی لڑکی۔“ کریمیں بوا برتن دھوتے ہوئے برابر بڑبڑاتے جا رہی تھیں۔

”کچھ لکھ کر انہوں نے اتنا ہی سیکھا ہے۔ قاضی سے کہنا کہ نکاح بھی انگریزی میں پڑھائے۔“ جمیل بیبا زور سے کہنے لگا۔ ”واقعی اس خاندان کی بدنامی تھی کہ لڑکیوں کو تعلیم نہ دلائی گئی۔ اب ہماری مجھ پھوپھی خاندان کی پہلی لڑکی تھیں۔ جنہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ظاہر ہے کہ انہیں مارے غرور کے یہی کچھ بننا تھا۔ دوسری تعلیم یافتہ خاتون ہماری عالیہ بی بی ہیں، کچھ فور تو ان میں بھی ہے۔“ انہوں نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔

عالیہ سمجھ گئی کہ یہ کس فور کی طرف اشارہ ہو رہا ہے، اس کی جان جل کر رہ گئی۔ ”جی ہاں عورت اگر کچھ پتلی سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے گی تو ظاہر ہے کہ داغی فتور سمجھا جائے گا، مرد عورت کو بے وقوف دیکھ کر ہی بچی خوش محسوس کرتا ہے۔ مجھ پھوپھی کا طریقہ غلط ہے مگر انہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنی شادی کریں۔“

”کون کر رہا ہے شادی؟“ اماں نے کمرے سے نکل کر پوچھا۔

”مجھ پھوپھی۔“ عالیہ نے جواب دیا۔

”کہاں انتظام کر دیا بڑے بیبا نے؟“

”بڑے بیبا نے نہیں، انہوں نے خود انتظام کیا ہے۔“ بڑی چچی نے بتایا۔

”حد ہے بھی، ان کی بڑی بہن صاحبہ نے بھی تو اپنی مرضی سے شادی کی تھی اور آج ان کا شاندار بیٹا سفدر دنیا کی چھاتی پر دندنا مچھرتا ہے۔“ اماں کا غصہ پورے جوش پڑھا۔

سب چپ رہے، کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ عالیہ کو افسوس ہو رہا تھا کہ اماں اتنی تلخ باتیں کیوں کرتی ہیں۔

اماں اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ جمیل بھی اٹھ کر ٹہلنے اور منگناے لگے۔

بہلا نہ دل نہ تیرگی شام غم مٹی

یہ جانتا تو آگ لگتا نہ گھر کو میں

ٹھیک ہے، اسی لئے میرے دماغ کے فور کا رونا رویا جا رہا تھا، وہ ان کا دل نہ بہلا سکی۔ وہ ان کی شاموں کو رنگین نہ بنا سکی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا فور ہو گا۔

”میں ذرا باہر جا رہا ہوں اماں، ضروری کام سے، دیر سے آؤں گا، دروازہ بند کر لیجئے۔“ جمیل بیبا نے کہا اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ”بہلا نہ دل نہ تیرگی شام غم مٹی۔“ دروازے سے نکلنے ہوئے بھی وہ دھیمے دھیمے گا رہے تھے۔

دھوم دھام سے چکی ہوئی چاندنی میں اسرار میاں کی اندھیری آواز ابھری۔

”کریمیں بوا اگر سب لوگ کھانا کھا چکے ہوں تو۔“

عالیہ اپنے کمرے میں جانے کے لئے زیوں پر ہوئی۔

دوسرے کے خون کے پائے ہو رہے ہیں“ ان دنوں تو بڑی چچی کو ٹھیکل کی یاد شدت سے ستا رہی تھی۔

سرشام زور سے آندھی آئی۔ کریمین ہوا لائٹنیں جلا رہی تھیں۔ ساری کی ساری ایک ہی جھونکے سے بجھ گئیں — ”ناس جائے ان آندھیوں کا۔“ لائٹنیں سیٹ کر وہ بوڑھاتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں۔

”ہارم تو جنیپلی کے۔“ کلی میں ہار پیچے والا صدکا لٹا ہوا جا رہا تھا۔ ذرا دیر میں آندھی رک گئی۔ بارش کے دو چھینے پڑ کر زمین کی سونہمی خوشبو اڑا اٹھے تھے اور ٹھکے کی پھتوں سے گراموفون ریکارڈ بجنے کی آواز آ رہی تھی ”پابل مورانیر چھوٹو بی جائے۔“

”سب لوگ کھانا کھا لو“ پتہ نہیں پھر بارش ہونے لگے، بادل گھرے کھڑے ہیں۔ — کریمین ہوا نے کہا اور پھر برتنوں سے آندھی کی دھول صاف کرنے لگیں — ”جائے یہ ناس پڑی آندھیاں کیوں آنے لگی ہیں۔“ انہوں نے جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔

”پہلے زمانے میں تو اتنی آندھیاں نہ آتی ہوں گی کریمین ہوا؟“ جمیل بھیا نے ہنس کر پوچھا۔

”یہ آندھیاں تو ہمیشہ سے آتی تھیں جمیل میاں، جانے کیا کچھ اڑا لے گئیں۔“ کریمین ہوا ان کا مذاق نہ سمجھتے ہوئے سنجیدگی سے بولیں — ”ایک بار تو میرا چارنٹ کا دھینڈا اڑا لے گئیں، دھو کر الگٹی پر پھیلایا تھا۔“ کریمین ہوا اپنے لئے جیسے دوپٹے کو سر پر ٹھیک سے اوڑھنے لگیں — ”ناس جائے ان آندھیوں کا۔“ وہ ہلپیلی اٹھا کر دالان میں چلی گئیں۔

”شاید رات بھی بارش ہو۔“ جمیل بھیا نے عالیہ کی طرف دیکھا۔

”اللہ کرے ہو، مگر یہ سے نجات ملے۔“

کھانے کے بعد اماں اور بڑی چچی نے پائندہ انکھول لیا۔ کریمین ہوا اسرار میاں کے لئے ہالینٹوں سے بھا ہوا سامان ایک پالے میں جمع کر رہی تھیں۔ جمیل بھیا اب پھر پانی کڑی پر جا بیٹھے تھے۔

خنت مگری پڑ رہی تھی۔ ٹمہر پھو بھی اپنے تاجر میاں کے ساتھ شلے جا چکی تھیں۔ ان کی شادی پر نہ دھول بجی، نہ میرا شوں نے گائے گائے۔ کریمین ہوا کا مارے دکھ کے کلبج پھٹ گیا تھا۔ یہ زمانے کم بخت نے ان کو کیا دکھا دیا۔ اماں کو ان کی شادی کے بعد سے سلسلہ پھو بھی مرحومہ ہر وقت یاد آنے لگی تھیں اور صفدر بھائی کے لیے موت کی دعاؤں دل سے نکلنے لگی تھیں۔ اوھر ملک میں ہڑوٹنگ چچی تھی۔ کینٹ مشن بلہ چاکر واپس ہو گیا تھا۔ مسلم لیگیوں کا پلہ بھاری رہا تھا۔ بڑے چچا کا بس چٹا تو جمیل بھیا کی صورت نہ دیکھتے، وہ انہیں آستین میں پلا ہوا سانپ سمجھنے لگے تھے۔ اگر کسی وقت سامنا ہوتا تو ایک دوسرے پر چھینٹے کٹنے لگتے۔ —

سارے مسلم لیجی انگریزوں کے بچو ہیں۔“ بڑے چچا پھر کہتے۔
اس میں کیا شک ہے، مگر یہ حضرت نمرود اور ماؤنٹ بیٹن کی دوستی کب سے چلی ہے اور یہ ان کی لیڈی صاحبہ سے اتنا غلوں کیوں برتتے ہیں؟“ جمیل بھیا کب چوتے۔

”تمہاری جمالت ایسے ہی سوال کرے گی۔“

”اے جمیل بھیا، کیا آپ باہر بٹ کر کر کے نہیں جھٹکتے؟“ عالیہ بچ میں کود پڑتی تو جمیل بھیا اپنے باپ کے مقابلے میں بے بس ہو کر رہ جاتے۔

”فہو! ایک ایک مسلمان جو فساد میں مارا جا رہا ہے اس کا خون مسلم لیگیوں کی گردن پر ہے۔“ — بڑے چچا لھنڈی سانس بھرتے۔

جمیل بھیا عالیہ کی طرف دیکھ کر خاموش رہے۔ جواب دینے کے لیے ان کا جی تو گھٹنا ہوا مگر کچھ نہ کر پاتے۔

بڑی چچی کو ٹھیکل کی پڑی تھی ”اللہ جانے کہاں ہوگا“ ہندو مسلمان ایک

بڑے چچا کہاں ہیں، یہ ٹھنڈا کھانا ان کی صحت کو اور بھی تباہ کر دے گا۔ کم سے کم رات تو جلدی سے گھر آ جایا کریں۔ عالیہ اوپر جاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ رات روٹی ہوئی آنکھوں کی طرح بھیگی ہوئی تھی۔ چھت پر اپنا بستر لگانے کے بعد وہ دھیرے دھیرے ٹھلنے لگی۔ ”وقت نہیں گزرتا اللہ۔“ وہ بوڑھا رہی تھی۔ گراموفون ریکارڈ برابر بجے جا رہے تھے۔ ”مفت ہوئے بدنام سنوریا تیرے لئے۔“

”اوپر تو بڑے مزے کی ہوا چل رہی ہے۔“ جیل بھیا بھی آکر اس کے ساتھ ٹھلنے لگے۔

وہ چپ رہی۔ رات، تنہائی، اٹلے ہوئے بادل اور پھر جمیل بھیا۔ وہ ایک طوفان میں گھر کر رہ گئی۔ اس کا جی بیٹھنے لگا۔ کیسی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ بس یہی جی چاہتا کہ جمیل بھیا کو اٹھا کر نیچے گلی میں پھینک دے۔

وہ منڈیر سے جھک کر نیچے گلی میں جھانکنے لگی، جہاں گنڈیریوں والا دو لوگوں والا چراغ قتال میں سجائے صدا لگاتا چلا جا رہا تھا۔

”عالیہ۔“ جمیل بھیا نے بھاری سی آواز سے پکارا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ بھڑک اٹھی۔

”بہت سی باتیں ہیں مگر تم تو میرے لئے بہری بن گئی ہو۔“

”اور کیا رہ گیا ہے کہنے کو؟“ آپ سب کچھ تو کہہ چکے ہیں اور میں سن چکی

ہوں، آپ جھٹکنے کیوں نہیں کہہ کر کہہ۔“

جمیل بھیا اس کے پاس کھڑے ہو گئے اور اندھیرے میں جھک کر اسے دیکھنے

لگے۔ وہ اتنے قریب تھے کہ اسے ان کی سانسیں اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی

تھیں اور اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جون کی لو سے اس کا چہرہ پھٹکا جا رہا ہے۔

وہ ہٹ کر اپنے بستر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ رگڑ ڈالا۔

”تم میرے سلسلے میں اتنی بے درد کیوں ہو؟“ وہ بھی قریب آگئے۔ کون سا

کوسوں فاصلہ تھا جو طے نہ ہو سکتا تھا۔ وہ جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانک رہے

تھے۔ عالیہ نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں تو بادلوں سے زیادہ اندھیرا چھایا ہوا تھا،

مگر ان بادلوں کے باوجود لو چل رہی تھی۔ عالیہ کا دل جیسے پھٹنے لگا۔

”بیٹہ جائے۔“ وہ ایک طرف سرک گئی۔

”تمہارے بستر پر بیٹھ جاؤں؟ تمہارے بستر پر تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہو گا

جیسے۔“

عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ بہت سی بھڑاس اس کے جسم سے پلٹ گئی ہیں۔

”جمیل صاحب آپ میرے معاملے میں صرف خدا ہی گئے۔ آپ خواہ

خواہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر میں نہ ملی تو آپ مرجائیں گے، تباہ ہو جائیں

گے، اب مجھ سے زیادہ شاندار لڑکی اس زمانے میں کہیں نہیں ملے گی، مگر میں جانتی

ہوں کہ اگر آج میں آپ کی نظروں سے دور ہو جاؤں تو آپ کو کوئی اور مل جائے

گا۔ کبھی آپ نے مجھی کے لئے بھی یہی کچھ محسوس کیا ہو گا اور۔“ اس کی

آواز بھرا گئی اور وہ ٹھنڈوں میں سر چھپا کر رونے لگی۔ اس وقت وہ سخت کمزوری

محسوس کر رہی تھی۔

”ارے تو کیا تم مجھ سے اتنی بیزار ہو، مت رو عالیہ۔“ جمیل بھیا نے

گھبرا کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ”تم اطمینان رکھو اب میں کچھ نہ

کہوں گا، میں تم کو زندگی بھر ہنسنا چاہتا ہوں، رلانا نہیں چاہتا۔“ انہوں نے

شانوں پر سے ہاتھ ہٹائے۔ ”اب میں تم سے کوئی مطالبہ نہ کروں گا، مجھے حق

ہی کیا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب تم میری وجہ سے پریشان نہ ہو گی، اب تم

خوش ہو نا؟“

وہ بھلا کیا کہتی، یوں ہی گھٹ گھٹ کر رو رہی۔

”مت رو عالیہ بی بی۔“ وہ بھروسہ کی طرح دوڑ کھڑے رہے۔ ”تم میری

زندگی کی ساقھی نہیں بننا چاہتیں تو نہ سہی، یوں بھی زندگی گزر ہی جائے گی۔ کتنے

لوگ ہیں جو خشیوں سے بھرپور زندگی گزارتے ہیں، خیر۔ مگر اب تم چپ ہو جاؤ،

میں اب تم سے کچھ نہ کہوں گا۔“ ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

چند منٹ تک وہ خاموش کھڑے رہے اور پھر تیزی سے بیچنے چلے گئے۔

”کرکین بوا، بڑے بھیا رات باہر بیٹھ چکے آئیں گے، اب سب لوگ کھانا

کھا چکے ہوں تو مجھے بھی دے دو۔“ اسرار میاں کی صدا سناٹے کو چیر گئی۔
 عالیہ آنسو پونچھ کر بے سدھ لیٹ گئی۔۔۔ بہت اندھیرا ہے، بادل کس بری
 طرح گھرے ہیں۔ کیا آج اتنی بارش ہوگی کہ طوفان نوح آجائے گا؟ آج وہ ضرور
 ڈوب جائے گی۔ اس نے تو اپنی حفاظت کے لئے کوئی کشتی بھی نہیں بنائی! اس نے
 آنکھیں موند لیں۔

پاکستان بن گیا۔ نئی راہ نما کراچی دارالحکومت جا چکے تھے۔ پنجاب میں
 خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ بڑے چچا اس مدے سے جیسے نڈھال ہو گئے تھے۔
 بیٹھک میں بتاروں کی طرح وہ ہر ایک سے پوچھتے رہتے۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیا
 ہو گیا؟ یہ ہندو مسلمان ایک دم ایک دوسرے کے ایسے جانی دشمن کیسے ہو گئے؟ یہ
 انہیں کس نے سکھایا ہے؟ ان کے دل سے کس نے محبت چھین لی؟“

جب وہ یہ سب کچھ عالیہ سے پوچھتے تو وہ ان کا سر سلائے لگی۔ ”بڑے چچا
 آپ آرام کیجئے، آپ تھک گئے ہیں بڑے چچا۔“ اور بڑے چچا اس طرح آنکھیں
 بند کر لیتے جیسے خون کی ندی ان کی آنکھوں کے سامنے بہہ رہی ہو۔

”زمانے کی بات ہے، وہ بھی زمانہ تھا جب ہندو اپنے گاؤں کے
 مسلمانوں پر آج آتے دیکھتے تو سردھڑ کی بازی لگا دیتے اور مسلمان ہندو کی عزت
 بچانے کے لئے اپنی جان نچھاور کر دیتا، ایسا بھائی چارہ تھا کہ گلتا ایک ماں کے پیٹ
 سے پیدا ہوئے ہیں، پر اب کیا رہ گیا، دونوں کے ہاتھوں میں خنجر آگیا ہے۔“
 کریمین بوافساد کی خبریں سن سن کر فطرتی آہیں بھرا کرتیں۔ اپنے شہر میں فساد تو نہ
 ہوا تھا مگر سب کی جانوں پر بنی رہتی، پتہ نہیں کب کیا ہو جائے۔
 ”کہاں ہو گا میرا ٹھکانہ؟“ بستی میں فساد کی خبر سن کر بڑی چچی ہلکے گلیں

”تمہارا پاکستان بن گیا جمیل، تمہارے ابا کا ٹک بھی آزاد ہو گیا، پر میرے
 ٹکلیں کو اب کون لائے گا؟“

”سب ٹھیک ہو جائے گا اماں، وہ خیریت سے ہو گا۔ یہ فساد و ساد تو چاروں
 میں فتنہ ہو جائیں گے۔“ جمیل بیماں کو سمجھاتے مگر ان کا چہرہ فق رہتا۔

شام سب لوگ خاموش بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ماموں کا خط آگیا۔ انہوں نے اماں کو لکھا تھا کہ انہوں نے اپنی خدمات پاکستان کے لئے وقف کر دی ہیں اور وہ جلد ہی جا رہے ہیں۔ ”اگر آپ لوگوں کو چلنا ہو تو فوراً جواب دیجئے اور تیار رہئے۔“

بس ابھی تار دے دو جیل میاں، ہماری تیاری میں کیا لگے گا، ہم تو بس تیار بیٹھے ہیں۔“ ہے! اپنا بھائی ہے بھلا ہمیں اکیلا چھوڑ کر جا سکتا ہے؟“ مارے خوش کے اماں کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

جیل بھیا نے اس طرح گھبرا کر سب کی طرف دیکھا جیسے فساد ہی ان کے دروازے پر پہنچ گئے ہوں، مگر آپ کیوں جائیں گی چھوٹی چچی؟ آپ یہاں محفوظ ہیں۔ میں آپ کے لئے اپنی جان دے دوں گا۔“ انہوں نے آج بڑی مدت بعد عالیہ کی طرف دیکھا۔ کیسی سفارشی نظریں تھیں مگر عالیہ نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ ”میں نہ جاؤں تو کیا ہندوؤں کے نگر میں رہوں، پاکستان میں اپنوں کی تو حکومت ہوگی، پھر میں اپنے بھائی کو چھوڑ کر ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتی“ واہ۔“ مارے خوش کے اماں نے سچلا نہ بیٹھا جا رہا تھا۔

عالیہ جانے پر راضی نہیں ہو گی چھوٹی چچی، وہ نہیں جائے گی، وہ جا ہی نہیں سکتی۔“ جیل بھیا نے جیسے نیم دیوانگی کے عالم میں کہا۔

”تم اچھے حق دار آگے، کون نہیں جائے گا۔“ اماں ایک دم پھرا انہیں۔

تم ہوتے کون ہو روکنے والے؟“

”ضرور جانیے چھوٹی چچی۔“ جیل بھیا نے سر جھکا دیا عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ نہیں جا سکتی۔ صدیاں گزر جائیں گی مگر وہ یہاں سے ہل بھی نہ سکے گی۔

”میں ابھی آ کر دیتا ہوں کہ سب تیار ہیں۔“ جیل بھیا اٹھ کر باہر چلے گئے۔

عالیہ کا تہی پہاڑ کہ وہ چیخ چیخ کر اعلان کرے کہ وہ نہیں جائے گی، وہ نہیں جا سکتی، اسے کوئی نہیں لے جا سکتا، مگر اس کے گلے میں تو سینکڑوں کانٹے چبھ رہے تھے، وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی، اس نے ہر طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں مگر

وہ کیوں رکے، کس لئے، کس کے لئے، اس نے سوچا اور پھر جیسے بڑے سکون سے چھالہ کاٹنے لگی۔ عالیہ بیگم اگر تم رہ گئیں تو بیٹھ کے لئے دلدل میں پھنس جاؤ گی۔ ”کرہیں ہوا اگر سب لوگ چائے پی چکے ہوں تو۔“ اسرار میاں نے بیٹھک سے آواز لگائی اور کرہیں ہوا آج تو ڈانٹوں کی طرح چپٹے چپٹے گئیں۔

”ارے کوئی تو اس اسرار میاں کو بھی پاکستان بھیج دو۔ سب چلے گئے، سب چلے جائیں گے مگر یہ کیس نہیں جاتا۔“

بیٹھک میں اسرار میاں کے کھانے کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

”کیا تم سچ چلی جاؤ گی چھوٹی دلہن؟“ بڑی دیر تک چپ رہنے کے بعد

بڑی چچی نے پوچھا۔

”ظاہر ہے کہ چلی جاؤں گی۔“ اماں نے رکھائی سے جواب دیا۔

”یہ گھر تمہارا ہے چھوٹی دلہن، مجھے اکیلے نہ چھوڑو۔“ بڑی چچی نے ڈنڈائی ہوئی آنکھیں بند کر لیں، شاید وہ تنہائی کے موت سے ڈر رہی تھیں۔

عالیہ جیسے پناہ ڈھونڈنے کے لئے اوپر بھاگ گئی۔ دھوپ پھلی پڑ کر سامنے کے مکان کی اونچی دیوار پر چڑھ گئی تھی۔ ہائی اسکول کے احاطے میں بیٹھا لینے والے پرندے مسلسل شور مچائے جا رہے تھے۔

مکمل فضا میں آکر اس نے اطمینان کی سانس لی اور مسافروں کی طرح ٹل ٹل کر سوچنے لگی کہ اب آگے کیا ہوگا، شاید اچھی ہی ہو، وہ یہاں سے جا کر ضرور خوش رہے گی۔

جب وہ چپے اتری تو سب اپنے اپنے خیالوں میں گمن بیٹھے تھے، صرف کرہیں ہوا جانے کس بات پر بو بڑا رہی تھیں اور پھرتی سے روٹیاں پکائی جا رہی تھیں۔

جیل بھیا کہاں گئے، اب تک کیوں نہیں آئے۔ عالیہ نے سونی کرسی کی طرف دیکھا۔ جانے یہ سر پھرا آدی اسے یاد کرے گا یا بھول جائے گا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

لاہین کی جی خراب تھی اس لئے اس میں سے دولوں اٹھ رہی تھیں اور

ایک طرف سے چنی سیاہ ہو گئی تھی۔ مدھم روشنی میں اماں، بڑی چنی اور کریمین
بوا کے چرے بگڑے بگڑے لگ رہے تھے۔

جھیل بھیا گھر میں داخل ہوئے اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں تار کر آیا
ہوں چھوٹی چچی۔ ”انہوں نے دھیرے سے کہا۔

”تم اتنی دیر تک باہر نہ رہا کرو، شام سے گھرا جایا کرو“ جانے کب یہاں
بھی گڑ بو ہو جائے۔ بڑی چچی نے کہا۔

”رہنا تو پڑتا ہے، مسلمان ڈرے ہوئے ہیں، انہیں سمجھانا ہے کہ وہ یہاں
ڈٹ کر رہیں اور یہاں کی فضا کو پر امن رکھیں، گھر میں بیٹھ کر تو کام نہ چلے گا۔“

”تو یہ اب ملک آزاد ہو گیا تو یہ کام شروع ہو گئے، خیر مجھے کیا، تم نے تار پر
پتہ ٹھیک لکھا تھا؟“ اماں نے پوچھا۔

”آپ اطمینان رکھیں، پتہ ٹھیک تھا۔“

”خیر سے ہم تو پاکستان جا رہے ہیں، مگر اب تم اپنے گھر کی فکر کرو جھیل
میاں، کیا بری حالت ہو چکی ہے، اپنی ماں کی طرف بھی دیکھو۔“ اماں نے ہمدردی
سے بڑی چچی کی طرف دیکھا۔

”کون جا رہا ہے پاکستان؟“ بڑے چچا نے صحن میں قدم رکھتے ہی پوچھا کہ
پوچھا۔ انہوں نے اماں کی باتیں سن لی تھیں۔

”میں اور عالیہ جائیں گے، اور کسے جانا ہے۔“ اماں نے تراق سے جواب
دیا۔

”کوئی نہیں جا سکتا، میری اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں نکال سکتا، کس لئے
جاؤ گے پاکستان؟ یہ ہمارا ملک ہے، ہم نے قربانیاں دی ہیں، اور اب ہم اسے
چھوڑ کر چلے جائیں؟ اب تو ہمارے پیش کرنے کا وقت آ رہا ہے۔“ بڑے چچا سخت
جوش میں تھے۔

ماشاء اللہ آپ بڑے حق دار بن کر آ گئے، نہ کھلانے کے نہ پلانے کے،
کون سا دکھ تھا جو یہاں آ کر نہیں جھپلا، میرے شوہر کو بھی آپ ہی نے چھین لیا،
آپ ہی نے انہیں مار ڈالا۔ میری لڑکی کو جیتیم کر دیا اور اب حق جتا رہے ہیں۔“

مارے غصے کے اماں کی آواز کانپ رہی تھی۔

”کریمین بوا میرا کھانا بیٹھک میں بھجوا دو۔“ بڑے چچا سر جھکا کر بیٹھک میں
چلے گئے۔

”کیا آپ چلنے سے پہلے بڑے چچا کو یہی بدلہ دینا چاہتی ہیں؟ بڑے چچا نے
کسی کو چاہ نہیں کیا، بڑے چچا نے کسی کو دعوت نہیں دی تھی کہ آؤ اور میرا ساتھ
دو۔ آپ آج اچھی طرح سن لیں کہ مجھے بڑے چچا سے اتنی ہی محبت ہے جتنی ابا
سے تھی۔“ عالیہ نے کھانا چھوڑ دیا اور ہاتھ دھو کر بیٹھک میں چلی گئی، اماں کیا کتنی
رہ گئیں اس نے ذرا بھی نہ سنا۔

”کیا تم سچ سچ جا رہی ہو بیٹی؟“

”ہاں بڑے چچا، اماں جو بتا رہیں۔“ اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

”یہ اگر بڑے چچا جاتے جاتے بھی چال چل گیا، لوگوں کو گھر سے بے گھر کر دیا، پھر
بھی تم مت جاؤ بیٹی، اپنی ماں کو سمجھا لو، اب تمہارے سکھ کا زمانہ آ گیا ہے۔“

”بڑے چچا میں تو اماں کا واحد سارا ہوں، میں انہیں کس طرح چھوڑ دوں،
وہ ضرور جانیں گی، مگر آپ کو نہیں معلوم کہ یہ گھر چھوڑ کر میں کس طرح ترپوں
گی، آپ۔ آپ تو۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکتے لگی۔

”چھوٹی دلن کو مجھ سے سخت نفرت ہے، ٹھیک ہے، میں نے تم لوگوں کے
لئے کچھ بھی نہ کیا، مگر اب وقت آیا تھا کہ اس گھر میں پہلی سی شادی لوٹ آتی،
مجھے بڑی اچھی ملازمت دی جا رہی ہے، پھر دکانوں کو چلانے کے لئے دس پندرہ
ہزار کی امداد بھی ملنے کی توقع ہے، میں چھوٹی دلن کی سب شکایاتیں رفع کر دوں گا۔“
— انہوں نے عالیہ کو پیار سے تھپکا — کیا گھر میں تیل ختم ہو گیا ہے؟ لائین کی
ردشنی مدھم ہوتی جا رہی ہے، اب انشاء اللہ تھوڑے دنوں میں بجلی کا کنکشن بحال
کرالوں گا۔ اور اب تم ایم اے میں داخلہ لیں گے نہ لو۔ میرا خیال ہے کہ تم کو
اگلے سال ضرور داخل کرا دوں۔“

عالیہ کا کلیجہ کٹ رہا تھا۔ آسو پونچھ کر وہ خاموش بیٹھی رہی۔ جی بی جی میں
گھٹ رہی تھی، مگر ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔ خدا آپ کو سکھ دے بڑے چچا، خدا

آپ کے سارے سامنے خواب پورے کرے۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی۔ وہ بڑے بچا سے کس طرح کہتی کہ وہ تو یہاں سے خود بھاگ جانا چاہتی ہے۔ اسرار میاں بیٹک میں داخل ہونے کے لئے ہٹ کھول رہے تھے۔ عالیہ اٹھ کر صحن میں آگئی۔

اماں اور بڑی چچی جانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ جمیل بیاب تک کرسی پر بیٹھے اٹھیاں مروڑ رہے تھے۔ وہ ایک لمبے تک آئین میں کھڑی رہی اور پھر اوپر چلی گئی۔

جنم سے بیٹگی ہوئی رات بڑی روشن ہو رہی تھی۔ چاند جیسے وسط آسمان پر چمک رہا تھا اور روز کی طرح آج بھی قریب کی کسی چھت پر گراموفون ریکارڈ بج رہے تھے۔ ”تری گھڑی میں ناگاپور مسافر جاگ ڈرا۔“

وہ آہستہ آہستہ ٹھٹھنے لگی۔ کیسی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ جیسے سوچنے بھینے کی ساری صلاحیت کسی نے چھین لی ہو۔ ”کیا یہ میں ہوں؟“ اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر اپنی آواز سن کر حیران رہ گئی۔ ”ہاں یہ تو میری ہی آواز ہے۔“ وہ کس سے پوچھ رہی تھی۔

ٹھٹھٹھٹھ وہ ایک بار مڑی تو جمیل بیابیت کی طرح بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ وہ اور تیزی سے ٹھٹھٹھٹھ لگنے لگی۔ اب یہ کیا کہنے آئے ہیں۔ انہوں نے اپنا وعدہ بھلا دیا۔

”کیا سچ تم نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟“ انہوں نے دیر سے سے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے ٹھٹھٹھٹھ ہوئے جواب دیا۔

”تم یہاں سے جا کر غلطی کرو گی۔ تم نے ایک بار کہا تھا ناکہ دور رہ کر یادیں بہت اذیت ناک ہو جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم وہاں خوش نہ رہو گی۔“

”میں ہر جگہ خوش رہوں گی۔ مگر آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھ سے کبھی کچھ نہ کہیں گے۔“

”میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

”کچھ نہیں!“

”تم میری مقروض ہو، یاد رکھنا کہ تم کو یہ قرض چکانا ہو گا۔“ وہ جانے کے لئے مڑے۔ ”تم وہاں خوش رہو گی نا؟“ انہوں نے زک کر پوچھا۔

وہ چپ رہی۔ جمیل بیابیت توڑی دیر کھڑے رہے اور پھر پلے گئے اور اس نے محسوس کیا کہ اس وقت وہ سب کچھ کھو بیٹھی ہے۔

بڑی دیر تک یوں ہی ٹھٹھٹھ کے بعد جب وہ تھک گئی تو جمی کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ اسے یہاں سے جانے کی اطلاع دینی تھی۔

”چھوٹی دلمن، ایسا جان پڑتا ہے کہ کبھی منہ کو آیا جاتا ہے، بھرا پر اگھر تھا۔ دیکھتے دیکھتے سب بڑی بڑی ہو گئے، زمانے زمانے کی بات ہے۔ کوئی کچھ نہیں کر سکتا، قریان جاؤں اس نالک کے جس نے ایک ملک کے دو ملک بنا دیئے، اپنے مسلمانوں کی حکومت ہو گئی، پر ہم اکیلے رہ گئے۔“ کریمین ہوا جدائی کے صدمے سے بڑھال ہو رہی تھیں۔

”تم بھی چلو کریمین ہوا۔“ اماں نے بڑے غلوص سے کہا۔

”اب تو یہی دعا کریں چھوٹی دلمن کہ اس گھر سے لاش نکلے میری، آج یہاں سے چلی جاؤں تو مرنے کے بعد مالکین مرحومہ کو کیا منہ دکھاؤں گی، وہ اپنے جیتے جی جہاں بٹھا گئیں وہاں سے کیوں کپاؤں نکالوں۔“

بیٹا نے رام کی کچھنی ہوئی کیر سے باہر قدم رکھا تھا تو را دن اٹھالے گیا تھا۔ بیٹا نے جیتے جاگتے رام کی حکم بدلی کی تھی، مگر تم کریمین ہوا میری مالکین کا حکم نہیں ٹال سکتیں۔ پھر بھی بیٹا، بیٹا رہیں اور تم کریمین ہوا رہو گی، تم کو کون جانے گا۔ تمہارا قصہ کون لکھے گا۔

عالیہ نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کریمین ہوا کو دیکھا۔ لائینن کی مدھم زرد روشنی میں جدائیوں کے دکھ کتنے اجاگر ہو رہے تھے۔

”چھوٹی دلمن اب بھی اپنا فیصلہ بدل دو، مت جاؤ چھوٹی دلمن۔“ بڑی چیچی کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

”مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستان ادھوری۔“ جمیل بیبا ساری باتوں سے بے نیاز ہو کر جیسے اس ایک شہر کی کیفیت میں ڈوب کر رہ گئے تھے۔

اللہ کوئی تو اس رات کو گزار دے ورنہ آج وہ اپنی جان سے گزر جائے گی۔ عالیہ نے سروہ رکھ کر ادھر ادھر دیکھا۔ چاند نکل رہا تھا، آسمان روشن ہوتا جا رہا تھا۔

”ممی کا خط آیا تھا۔ اس نے کیا لکھا ہے عالیہ؟“ بڑی چیچی نے پوچھا۔

”اس نے لکھا ہے کہ پاکستان جانا مبارک ہو، ضرور جاسیے۔ اس پاک سرزمین کو میری طرف سے چوئے گا اور مجھے وہاں کی تھوڑی سی مٹی بھیج دیجئے گا۔

یہ رات پہاڑوں کا پوجہ اٹھائے ہوئے ہے، کوئی اسے گزار دے۔ کوئی صبح ہونے کا پیغام سناوے۔ اسے صبح ہونے کا انتظار ہے۔ صبح وہ چلی جائے گی اور اس کرب سے نجات حاصل کر لے گی۔

سب بول رہے ہیں، باتیں کر رہے ہیں، پھر بھی کیسا سناٹا چھایا ہوا ہے۔ چاند کی کون سی تاریخ ہے۔ اب تک چاند نہیں نکلا۔ چھالہ کاتے کاتے عالیہ نے سب کی طرف دیکھا۔ جمیل بیبا سب کی باتوں سے بے نیاز اپنی کرسی پر بیٹھے ایک سال گنگنائے جا رہے تھے۔

مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستان ادھوری

میری موت سے نہ ہو گی مرے غم کی ترجمانی

جمیل بیبا آج سارا دن باہر نہیں نکلے تھے۔ آج ان کو فرصت ہی فرصت تھی۔ جیسے سارے کام ختم ہو گئے اور اب انہیں کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔

”بڑی بھالی“ میں تو جا رہی ہوں مگر آپ میری ایک بات یاد رکھئے گا کہ اگر آپ نے بڑے بیبا اور جمیل میاں کو قابو میں نہ کیا تو آپ کی ساری عمر یوں ہی گزر جائے گی اب تو آزادی بھی مل گئی، اب کون سا باندہ رہ گیا ہے جو یوں سارا دن دونوں باپ بیٹے آوارہ پھرتے ہیں۔“ اماں بڑی چیچی کو سمجھا رہی تھیں۔

”مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستان ادھوری۔“ کہ ہے داستان ادھوری۔“

جمیل بیبا اسی ایک شعر کو رنے جا رہے تھے۔

اس شعر کو بار بار پڑھ کر وہ کیا جتنا چاہتے ہیں۔ وہ اس سے کیا کہہ رہے ہیں؟ عالیہ کا سروہ بڑی تیزی سے چھالہ کاتے لگا۔ اللہ میاں اگر اس وقت اسے بہرہ دے تو پھر کتنا اچھا ہو۔

آواز آ رہی تھی۔ اس نے کمرے پر ایک دوامی نظر ڈالی اور پھر نیچے آگئی۔
ناشتہ تیار تھا، وہ اماں اور بڑی چچی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ کمرے کے کٹے
دروازوں سے اس نے دیکھا کہ جمیل بیبا اب تک چادر تانے سو رہے تھے۔
”وہ ہو گئی ہے مروت کی، وہ جا رہی ہے اور ان کی آنکھ بھی نہیں کھلتی، جیسے
موت کی نیند آگئی ہے۔“ عالیہ کو کیسی غصیں لگ رہی تھی ان کے یوں ٹھٹھانے سے
سوئے نہ۔ وہ چلی جاتی تو پھر سو لیتے۔

ناشتے کے بعد اماں نے اپنے سارے سامان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔
کپڑوں اور ہلکے پھینکے دو کپلوں کے سوا تمام سامان بھیجی کے کمرے میں بھردیا گیا
تھا کہ جب اچھا وقت آئے گا تو پھر آکر سب کچھ لے جائیں گے۔
”تنگے آگئے ہیں۔“ اسرار میاں نے باہر سے آواز لگائی تو وہ جلدی سے
بیشک کی طرف بھاگی۔ ”کیا آج بوئے چٹا بھی سوتے رہیں گے۔“
”تمہارے بوئے چٹا تو بڑے ہی کہیں چلے گئے۔ کتے تھے کہ کام ہے اور یہ
بھی کتے تھے کہ میں سب کو جانتے نہ دیکھ سکوں گا۔“ کریمین بوائے بڑی رقت سے
بتایا۔

”یہ کو نا کریمین بوا کہ رقت نہیں تھا جو رخصت کرنے بیٹھے رہتے۔“
اماں نے برا سامنا بنایا۔ ”بڑی بھائی، میرا سامان حفاظت سے رکھنے کا، اس کمرے
میں تالا لگا دیتے گا۔“ اماں نے ایک بار پھر بدایت دی۔
اللہ آج کی شیشیں ریزرو نہ ہوتیں، آج وہ رک سکتی، بوئے چٹا سے ملے بغیر
وہ کسی طرح جا سکتی ہے۔ وہ جیسے تھک کر بیٹھ گئی۔
”اٹھ جاؤ جمیل، تمہاری بہن اور چچی جا رہی ہیں۔ انہیں رخصت تو کرو۔“
بڑی چچی نے تیسری بار جمیل بیبا کو آواز دی مگر وہ شس سے مس نہ ہوئے۔
”جلدی کرو کریمین بوا، ہوائی جہاز کسی کا انتظار نہیں کرتا، وقت پر اڑ جائے
گا۔“ اسرار نیماں نے پھر صدا لگائی۔

”خدا نہ کرے۔“ میرا بھائی آج لاہور کے ہوائی اڈے پر انتظار کرے گا، جو
نہم لوگوں کو نہ پایا تو کلبجہ بھٹ جائے گا اس کا۔“ اماں نے بوکھلا کر برقع اوڑھ

میں اسے اپنی ٹانگ میں لگاؤں گی، میں بد نصیب تو وہاں بھی نہیں جا سکتی۔ اور سب
دعا سلام لکھی ہے۔“ عالیہ کو جتنا یاد تھا سب سنا دیا۔
”اور بھی کچھ لکھا ہے؟“ بڑی چچی نے پوچھا۔
”بس یہی سلام دعا، خط اوپر رکھا ہے۔“
”مری موت سے نہ ہو گی مرے غم کی ترجمانی“ — جمیل بیبا اب بھی
سب سے بے نیاز تھے۔

”جائے ہمارے مسلمانوں کا ملک کیسا ہو گا، مکان بھی مل جائے گا جلدی سے
کہ نہیں، ہوٹل میں نہ ٹھہرنا چھوٹی دہلی، صحت خراب ہو جائے گی وہاں کے کھانے
سے۔“ کریمین بوا کو اب آگے کی فکر ستا رہی تھی۔
”تم پریشان نہ ہو کریمین بوا، میں جانتی ہی خط لکھ دوں گی۔“ اماں نے کہا۔
رات کے بارہ بج رہے تھے۔ رات سرد ہوتی جا رہی تھی مگر سب لوگ بیٹھے
تھے۔ عالیہ کا جی چاہ رہا تھا کہ بس اب کسی طرح اوپر بھاگ جائے۔
”اچھا بھئی اب سوئے کو چل دیئے، خدا حافظ —“ جمیل بیبا کرسی سے
اٹھ پڑے۔ ”مجھے اور زندگی دے۔“ وہ کمرے میں چلے گئے۔
بیشک کے دروازے کٹے اور بند ہو گئے۔ بوئے چٹا ایک ڈرا دیر کو بھی
اندر نہ آئے۔ عالیہ انتظار کرتی رہ گئی۔

گلی میں آوارہ کتے بھونک بھونک کر رو رہے تھے۔ کاش نیند آجائے، اس
کی آنکھوں میں مریٹیں سی لگ رہی تھیں — ایک دن جب وہ یہاں آئی تھی اور
پہلی رات اس کمرے میں گزار دی تھی تو ساری رات سو نہ سکی تھی اور آج جب
وہ یہاں سے جا رہی ہے تو پھر نیند کے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ کتنی بہت سی باتیں اس کا
کلبجہ فوج رہی تھیں — جمیل بیبا نے اس سے ایک بات بھی نہ کی۔ کیا جاتے
جاتے وہ اب اس سے کچھ نہ کہیں گے، کیا اب کچھ کہنے کو باقی نہیں رہ گیا، اللہ
بوئے چٹا کیا سوچ رہے ہوں گے، وہ بوئے چٹا کو چھوڑ کر جا رہی ہے۔ اور ”بھئی“
خدا کرے اسے پاکستان آنا نصیب ہو جائے۔

جانتے جانتے صبح ہو گئی، چلی منزل سے برتنوں کے کھڑکنے اور باتیں کرنے کی

بی بی سے میری دعا کہ دو اور کہہ دو کہ میرا کھانا معاف کریں اور کہہ دو کہ
— اسرار میاں کی آواز رک گئی۔

”خدا کرے کہ تمہاری زبان تھک جائے اسرار میاں۔“ کریمین بولے
تڑپ کر دعا مانگی۔

عالیہ سب کچھ سن رہی تھی مگر اس کے پاؤں! ارے کوئی اسے سمجھ کر ہی
لے جائے۔ وہ اس کمرے سے تو نکل جائے۔

”تم اس لئے دیر کر رہی ہو کہ ہوائی جہاز ہم کو چھوڑ کر اڑ جائے۔ میرے
بھائی کے نکلنے کے دامن غارت جائیں اور وہ ہمیں اس جہاز میں نہ پا کر پاگل ہو
جائے۔“ اماں جانے اور کیا کہیں کہ عالیہ وحشیوں کی طرح بھاگتی ہوئی کمرے
سے نکل گئی۔

”آپ کے بھائی اور بھادج سے اتنا بھی نہ ہوا کہ چار پانچ دن ہماری وجہ
سے ٹھہر جائے، ہمارے ساتھ سفر کر لیتے اور اب ہمارے لئے پاگل ہو جائیں گے،
فوہ!“ عالیہ زور سے بولی اور پھر بڑی چچی سے لپٹ کر سسکنے لگی۔

لی ”اب تم بھی جلدی کرو نا“۔ انہوں نے جھلا کر عالیہ کی طرف دیکھا جو اب
تک بے سدھ سی بیٹھی تھی۔

”بہت دقت ہو رہا ہے، پہلے سے پہنچنا اچھا ہوتا ہے۔“ اسرار میاں کی
آواز رکتی ہی نہ تھی۔

”ارے کوئی اس اسرار میاں کو بھی پاکستان بھیج دو۔“ کریمین بولے کچھ چھاڑ
کر رو دیں۔

کریمین بولا اور بڑی چچی اماں سے مل کر رو رہی تھیں مگر وہ دم بخود کھڑی
رہی اسے تو رونا بھی نہ آ رہا تھا۔

”اگر نکلیل وہاں ملے تو خط ضرور لکھنا۔“ بڑی چچی نے عالیہ کو لپٹا کر
سرکوشی کی۔

”مجھے یاد رکھنا، جاؤ خدا کو سونپنا“۔ ان کی آواز کانپ رہی تھی۔
”ارے اے جمیل اب تو اٹھ جا۔ بڑی چچی نے زور سے پکارا۔

”میں جا رہی ہوں“ خود مل لوں گی۔“ عالیہ نے کہا۔

”کیوں مل لوگی؟ وہ تو مارے نفرت کے لٹنا نہیں چاہتا۔“ اماں نے تیوریوں
پر تل ڈال لئے۔ ”بس اپلو جلدی۔“

”میں جا رہی ہوں“ خدا حافظ۔“ عالیہ نے جمیل بھیا کے منہ پر سے چادر
کھینچ لی اور پھر جھجک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ جھنجھکی اور سوچی ہوئی آنکھوں میں
ایک داستان دم توڑ رہی تھی۔ اس نے گہرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر بھی وہ
آنکھیں تو اس کی آنکھوں میں ٹھکی جا رہی تھیں۔

”تم جانتیں کیوں نہیں بے وقوف لڑکی؟ کیا یہی دیکھنے کے لئے مجھے جگا نے
آئی تھیں؟ خدا حافظ۔“ انہوں نے پھر منہ چھپا لیا۔

”جلدی چلو عالیہ۔“ اماں کی آواز آئی۔ تب عالیہ کو خیال آیا کہ اسے جانا
ہے باہر تاکہ کڑا ہے مگر اس کے پاؤں کیوں نہیں اٹھتے؟ اب وہ جاتی کیوں نہیں
اور یہ کمرے میں اتنا اندھیرا کیوں چھا رہا ہے۔

”کریمین بولا جلدی کرو بہت دیر ہو رہی ہے“ اور چھوٹی دلہن سے اور عالیہ

برائیاں تھی اور گلدان میں لگے ہوئے پھول بھڑک میز پر بکھرے ہوئے تھے۔ صرف کالی کالی سوکھی شاخیں اب تک گلدان میں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ سونے کے کمرے میں بستروں پر پنک پوش بچے ہوئے تھے اور سرہانے تپائی پر رکھا ہوا لیپ اندھا چڑا تھا۔ اس کمرے کے ساتھ چھوٹے سے کمرے میں آتش دان پر کرشن مہاراج کی مورتی رکھی تھی۔ مالا کے پھول جڑ کر آس پاس بکھرے پڑے تھے اور گلے میں صرف پیلا ڈور اٹکا رہ گیا تھا۔

”بھئی! اسے تو یہاں سے ہٹاؤ، باہر بچوں کو دے دو، کھلیں گے۔“ جب سے اماں یہاں آئی تھیں، انہوں نے کئی بار کہا تھا۔

عالیہ نے اماں کو کوئی جواب نہ دیا۔ مورتی کئی دن تک یوں ہی رکھی رہی۔ پھر جب اس کمرے کو استعمال کے بغیر اماں کا گزارہ نامکن ہو گیا تو عالیہ نے مورتی کو اٹھا کر اپنے بکس میں چھپا دیا۔

دن بڑے بے کیفی سے گزر رہے تھے۔ بیکار بیٹھے بیٹھے آگتا گئی تھی۔ اس کے خلوں کے جواب بھی نہ آئے تھے۔ کون کتنا ہے کہ دور رہ کر یادیں بہت اذیت ناک ہو جاتی ہیں، اسے تو سب بھول گئے۔ یادیں صرف اس کے لئے اذیت ناک ہو رہی ہیں۔

شاہیں عذاب کی طرح کشتیں امدادی کیٹیاں گھر گھر چکر لگاتی پھرتیں۔ اپنے مہاجر بھائیوں کی مدد کرو، قافلے آ رہے ہیں، مدد کرو۔ اور اماں بڑی رقت سے بتاتیں کہ تم تو خود مہاجر ہیں۔ لوگ چلے جاتے مگر عالیہ کا جی چاہتا کہ وہ اماں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر سب کچھ انہیں دے دے۔

ماسوں اور ان کی بیگم کبھی کبھی شام کو آٹھنے تو عالیہ کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کون سے دیہات کے مل میں جا چپے، اماں بولکھا جاتیں اور ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ اپنی بھائی کو کس کے سر آنکھوں پر بٹھا دیں۔

چند دن تک خاموش بیٹھے رہنے کے بعد اس نے ایک ہائی اسکول میں ملازمت کی درخواست دے دی جو جلد ہی منظور ہو گئی اور معروفت نے اسے بہت سے عذابوں اور دکھوں سے بچالیا، پھر بھی جب وہ اسکول سے واپس آتی تو بوڑھے

لاہور آکر تین چار دن ماموں کے ساتھ ان کی سرکاری کوشی میں گزارنے پڑے۔ وہ بھی اس طرح کہ عالیہ سارا دن ایک چھوٹے سے کمرے میں بند پڑی رہتی۔ وہ ہر وقت یہ سوچتی رہتی کہ اس میزار کن ماحول میں کس طرح زندگی گزارے گی۔ ہاں اماں بہت خوش تھیں۔ بھائی اور انگریز بھادج کے ساتھ رہنے کی بڑی پرانی آرزو اب پوری ہوئی تھی۔ انہوں نے زندگی بھر ساتھ رہنے کے پروگرام بنائے تھے اور عالیہ سے خفا تھی کہ وہ سب سے الگ تھلگ پڑی رہتی ہے۔ اور کچھ نہیں تو اپنی ممانی سے فر فرانگریزی بولنے کی مشق ہی کر لے مگر اس نے تو ان چار دنوں میں صرف ایک ہی کام کیا تھا کہ بڑی چچی اور بڑے چچا کو کئی کئی صفحوں کے خط لکھے تھے۔

پانچویں دن ماموں نے ایک چھوٹی سی کوشی کا تالا تروا کر اماں کو ان کے گھر جانے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے اماں کو چپکے چپکے سمجھایا کہ انگریز عورتیں تو اپنی ماں کے ساتھ بھی رہنا پسند نہیں کرتیں۔

اماں نے عالیہ سے یہ باتیں چھپائی چاہیں مگر جب وہ اپنے نئے گھر جا رہی تھی تو ممانی نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں سمجھایا دیا کہ سب کا الگ الگ رہنا ٹھیک ہوتا ہے۔ ساتھ رہنے میں بہت گڑبڑ ہوتی ہے۔

کوشی میں ایک ایک چیز اپنی جگہ پر موجود تھی۔ کھانے کی میز پر برتن قریب سے لگے ہوئے تھے اور برتنوں کے نقش و نگار دھول نے چھپا دیئے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بس ابھی پردے کے پیچھے سے نکل کر کوئی آئے گا اور کھانے کے لئے بیٹھ جائے گا۔ باورچی خانے میں پیتل کے برتن الماری میں لگے تھے اور چند برتن زمین پر لٹکے پڑے تھے۔ ڈرائنگ روم کے قالین اور صوفے سب پر دھول

نہیں روٹا۔“

عالیہ کو ان کے جانے کا نہ صدمہ ہوا نہ خوشی، چلے گئے تو چلے گئے۔ اس کا ان لوگوں سے واسطہ ہی کیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد ماموں نے کئی بار کہا بھی تھا کہ عالیہ اپنے باپ کی طرح دل سے انہیں ناپسند کرتی ہے۔ وہ یہ سب کچھ سن کر ہنس دی تھی۔ اس وقت اسے ابابکھی شہوت سے یاد آتے تھے مگر اب تو ان کی قبر تک کو دوسرے ملک میں چھوڑ آئی تھی۔ وہاں سے نابلہ لوٹ گیا تھا۔ کسی نے اس کے خط کا جواب تک نہ دیا تھا۔

بچا اور بڑی چچی کے خط کے لئے پوچھتی۔ اماں اس روز روز کے پوچھنے سے تنگ آ چکی تھیں وہ ہمیشہ جھٹلا کر جواب دیتیں۔

ایک دن ماموں اکیلے آئے تو انہوں نے بتایا کہ کوٹھی اماں کے نام الاٹ کرادی ہے۔ اب اسے کسی بھی صورت چھوڑنا نہیں۔ پھر انہوں نے فرنیچر وغیرہ کی چند رسیدیں دیں کہ اگر کوئی پوچھے تو یہ دکھا دینا کہ ہم نے یہاں آکر سب کچھ خریدا ہے اس کوٹھی میں تو بس کباڑ بھرا تھا۔

اماں اپنے بھائی کے کلاہ ناموں پر خوش ہوتی رہیں۔ ”بھائی ہو تو ایسا ہو۔ میرے آرام کے لئے اس نے کیا نہیں کیا“ اب انگریزوں میں یہ قاعدہ نہیں کہ سب ہر وقت سر پر نازل رہیں۔ اگر ہمارے ہاں جیسا قاعدہ ہوتا تو بھائی ایک منٹ کو جدا نہ کرتا۔“

عالیہ چپ چاپ سب کچھ سنتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کس کا حق کون اڑائے لئے جا رہا ہے۔ یہ رسیدیں کہاں سے آ گئیں، یہ کوٹھی اس کی کس طرح ہو گئی۔ مگر عالیہ یہ سب کچھ کس سے پوچھتی۔ اماں صرف اماں تھیں۔ اس کی تنخواہ ملنے اور کوٹھی کی مالک بننے کے بعد پہلی جیسی مغرور اور خود پسند۔

وقت گھٹ گھٹ کر گزر رہا تھا۔ اسکول سے آکر وہ پریشان پھرا کرتی۔ آس پاس کی کوٹھیوں میں بھی کسی سے ملنا جلتا نہ تھا۔ جانے کہاں سے لوگ آکر بس رہے تھے۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔

اماں کو اتنی فرصت ہی نہ ملتی کہ اس کی طرف بھی دیکھ لیتیں۔ سارا دن کوٹھی کی دیکھ بھال میں گزر جاتا۔ دس روپے مہینے پر رکھی ہوئی مانی اگر کسی چیز کو ذرا زور سے رکھ دیتی تو اماں کا لہجہ دکھ جاتا۔ ”یہ اتنی اچھی مہنگی چیزیں خریدی ہیں اور تم آپے میں نہیں رہتیں، ذرا ہوش بے کام کیا کرو۔“

بہت دن نہیں گزرے تھے کہ ماموں کراچی تبدیل ہو گئے۔ جب وہ رخصت ہو رہے تھے تو اماں کا رو رو کر برا حال ہو گیا۔ ان کی بھابی اس بے قراری کو دیکھ کر مسکراتی رہیں۔ ”ہمارا تو بچہ لوگ بھی بٹ ڈور ڈور چلا جاتا ہے مگر کوئی

دیکھا کہ اماں بلو میں منہ چھپا کر رو رہی تھیں۔

کمرے میں تھپڑ کدہ دیر تک سوچتی رہی کہ وہ کیا کرے۔ وہ اماں کو خوش نہیں رکھ سکتی، انہیں خوش رکھنے کے لئے اسے اس پرانے گھر میں پڑا رہنا ہو گا۔ تھانی اور بیکاری میں جو جذبہ اسے سائیں گے ان سے اس طرح پیچھا چھڑائے گی، اور جو یادوں کے بھوت اس کے گرد منڈلانے لگتے ہیں، ان سے بچ کر وہ کہاں بھاگے گی۔ وقت بیلوں میں گزر سکتا، اسے سارے کی ضرورت ہے۔ اور پھر اس خیال کے ساتھ ہی جانے کیسے اس کو والٹن کیپ کے ڈاکٹر کا خیال آ گیا۔ اچھا آدوی ہے پچکارا۔

رات اماں نے اکیلے کھانا کھالیا۔ اس نے بھی شکایت نہ کی۔

آج جب وہ اسکول سے واپس آئی تو اس اٹھی۔ آپ ہی آپ اسے ایسا محسوس ہوتا کہ جی بیٹھا جا رہا ہے۔ سرویاں دم توڑ رہی تھیں پھر بھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسے سخت سروی لگ رہی ہے۔ اس نے سوچا کہ آج وہ آرام کرے گی، آج کہیں نہ جائے گی۔

کھانے کے بعد کمرہ بند کر کے وہ سونے کے لئے لیٹ گئی۔ سستی دیر کو نہیں بدلتی رہی مگر نیند نہ آتی تھی نہ آئی۔ آتا کہ اس نے اخبار اٹھالیا۔ آج تو صبح جانے سے پہلے اس نے اخبار کو سرسری طور پر بھی نہ دیکھا تھا۔ جی ہی نہ چاہا۔

دو تین سوئی سوئی سرخیاں دیکھنے کے بعد ایک خبر پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔ مشہور مسلمان کانگریسیڈر کو کسی شخص نے مار دیا۔ نمرود کا اعلان افسوس، مرحوم کے خاندان کے لئے تین ہزار روپیہ کا عطیہ۔ ہندو مسلمان منافرت کی شدید مذمت۔

بڑے بچے کا نام پڑھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا۔ وہ ہانگوں کی طرح اٹھی اور پھر اپنے بستر پر گر پڑی۔ اسے اپنے دل میں درد سا ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے وہ تو بڑے بچے سے مل کر بھی نہ آئی تھی اور وہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ وہ اپنے پنگ کی پٹی سے سرنگ پنگ کر بڑی دیر تک روتی رہی، اب وہ بڑے بچے سے بھی نہ مل سکے گی۔ اس احساس نے اسے اس بری

فساد ختم ہو گئے تھے۔ بس کہیں اکا دکا واردات کی خبر پڑنے میں آ جاتی۔ اب دونوں ملک بھائی چارہ قائم کرنے پر زور دے رہے تھے۔ عالیہ کو ان خبروں سے ذرا بھی دلچسپی نہ ہوتی۔ بھلا ایسی بھی معصومیت کس کام کی۔

ماموں کے جانے کے بعد عالیہ نے پرودہ چھوڑ دیا تھا۔ یہاں اسے کون جانتا تھا جو اپنی پرانی روایات کو پکڑے بیٹھی رہتی۔ خالی وقت گزارنے کے لئے اس نے والٹن کیپ جانا شروع کر دیا تھا۔ اسکول سے آکر وہ تھوڑی دیر آرام کرتی اور پھر بس سے چلی جاتی۔ وہاں بچوں کو مفت میں پڑھا کر اسے عجیب سا سکون ملتا۔ مصروفیت کی دھول نے بچپنی یادوں کو دھندلا دیا تھا۔

اماں اس کے والٹن کیپ جانے کی وجہ سے سخت اکڑی اکڑی رہتیں۔ جب بھی وہ وہاں سے واپس آتی کوئی نہ کوئی ناخوشگوار بات ہو جاتی۔ ایسے موقع پر وہ چپ رہتی۔ وہ اپنی طرف سے بات نہ بڑھانا چاہتی تھی۔

آج چھ بجے شام جب وہ واپس آئی تو اماں اجاڑا ٹن میں کرسی پر بیٹھی جیسے اسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ ”تم وہاں کس لئے جاتی ہو؟ تم کو اس بیکار کام میں کیا مل جاتا ہے؟“ انہوں نے سختی سے سوال کیا۔

”سکون ملتا ہے۔“ اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔

”وہی باپ اور بچا والی باتیں، کیا اب تم مجھے تباہ کرنا چاہتی ہو؟“

”بچوں کو پڑھانے سے اگر آپ تباہ ہوتی ہیں، تو میں مجبور ہوں۔“ اس نے ٹھک آکر جواب دیا۔

”تم مجبور ہو؟“ اماں نے غصے سے پوچھا۔

”ہاں میں مجبور ہوں۔“ وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ اس نے پلٹ کر بھی نہ

طرح ترپایا کہ اس کے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکتی تھی۔

شام ہو گئی۔ کمرے میں اندھا بچہ لیٹ گیا۔ روتے روتے وہ تھک چکی تھی۔ اماں کئی بار دروازہ کھٹکھا کر لوٹ چکی تھیں۔ اس نے سوچی ہوئی آنکھوں کو یہ مشکل کھولا اور کمرے میں بکھرے ہوئے اخبار کے صفحوں کو ردندقی باہر نکل گئی۔

”ارے تم کو کیا ہوا ہے؟“ اماں اس کے سرخ چہرے اور سوچی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر گھبرا گئی تھیں۔

”بڑے بچا کو کسی بندو نے چپکے سے مار دیا۔“ اس نے بڑے سکون سے کہا۔ اتنا رو پکنے کے بعد اسے جیسے مبر آیا تھا۔

”ہے ہے“ ساری زندگی بندو کی غلامی کرنے کے بعد یہ بدلہ ملا؟“ اماں کی آواز بھرا رہی تھی۔ انہوں نے پلوں میں آنسو خشک کر لے۔

”ہے بے چاری بڑی بھائی کا کیا حال ہو گا“ انہوں نے تو ہم لوگوں کو اطلاع تک نہ دی۔“

عالیہ اماں کو ان کے حال پر چھوڑ کر باہر لان میں چلی آئی۔ بس بڑے بچا! اتنی شاندار زندگی کا یہی انجام ہونا تھا؟۔ تین ہزار روپے کا عطیہ اور اٹھارہ افسوس؟۔ پتہ نہیں کپڑے کی دکانوں کے لئے ہیں بچکین ہزار روپے ملے تھے یا نہیں؟ بجلی کا کٹکشن بحال ہوا تھا یا نہیں؟ کیا اسی لائین کی بجلی بجلی روشنی میں بڑے بچا کی لاش رکھ کر سب روتے رہے ہوں گے؟ پتہ نہیں جمیل بیٹا کا کیا حال ہو گا؟ موت نے سارے اختلافات مٹا دیئے ہوں گے کہ نہیں؟

رات لیپ کی روشنی میں میز پر بھی وہ بڑی دیر تک بیٹھی چلی کو خط لکھتی رہی اور اماں ہاتھیں کرتی رہیں۔ جانے کیا حال ہو گا بڑی بھائی کا، بڑے بیٹا مرحوم نے نہ زندگی بھر خود چین لیا نہ دوسروں کو لینے دیا۔ بھرے پرے گھر تباہ کر دیئے، کیا مل گیا انہیں؟ جن کا ساتھ دیا انہوں نے ہی پردیس میں موت کی نیند سلا دیا۔ ہائے پلے ہی آئے ان کافروں کے ملک سے۔ بھلا کیا ضرورت تھی وہاں رہنے کی۔ اور اب وہ جمیل میاں ہیں، وہ بھی دیسے ہی شاندار نکلے۔

خط ختم کر کے اس نے لفافے میں بند کر دیا۔

”سو جائیے اماں۔“ وہ لیپ بٹھا کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ ذرا دیر بعد اماں کے خزانے لینے کی آواز آنے لگی مگر وہ آنکھیں کھولے اس اندھیرے میں کیا کچھ نہیں دیکھ رہی تھی۔ یہ بڑے بچا کی کفنائی ہوئی لاش میاں اتنی دور لا کر کون رکھ گیا۔ اسرار میاں تم بڑے بچا کو ہاتھ نہ لگنا، کریمین ہوا ناراض ہو جائیں گی۔ کریمین ہوا اتنی زور زور سے قرآن شریف نہ پڑھو، موت کا احساس اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بڑے بچا نہیں مرے ایک دنیا مر گئی، چپکے چپکے پڑھو کریمین ہوا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں مگر وہ اپنے کانوں کو کیسے بند کر لیتی۔ اتنی دور سے بڑے بچا کے ملک سے کریمین ہوا کے قرآن شریف پڑھنے کی آواز برابر آئے جا رہی تھی اور بڑی جچی کے بین کی آواز اس کے کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھی۔

”اے اللہ اس رات کو گزار دے۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کہتے ہیں کہ سولی پر بھی نیند آ جاتی ہے۔ پھر آخر اسے نیند کیوں نہیں آ رہی، کیسی کسی غلط کہاں تیں مشور ہو گئیں اور آج تک کسی نے صحیح نہ کیں۔

صبح وہ ابھی تو تھکن اور صدمے سے نڈھال ہو رہی تھی۔ برآمدے میں دھوپ آگئی تھی اور اماں مائی کے ساتھ ناشتی کی تیاری میں مصروف تھیں۔ وہ حسب معمول اسکول جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔ اماں نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ بھلا اتنے صدمے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ اماں اور مائی کے بے حد اصرار کے باوجود ناشتہ کئے بغیر اسکول چلی گئی۔

ایک بیجے جب وہ اسکول سے واپس آئی تو دھوپ میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر خود کو جیسے گرا دیا اور جب مائی نے اس کے سامنے کھانا رکھ دیا تو وہ اس طرح کھانے لگی جیسے کڑوی روٹی نگل رہی ہو۔ اماں اب تک اپنے کام میں مصروف تھیں۔ ”افہ سارا دن گزر جاتا ہے مگر کام ختم نہیں ہوتا، کوٹھیوں میں کتنا کام ہوتا ہے، مائی برآمدے میں رکھے ہوئے گملوں میں پانی ڈال دو سوکھے جا رہے ہیں۔“ اماں برابر بولے جا رہی تھیں۔ ”مائی تم نے کمرے میں میز پر کھانا کیوں نہیں لگایا؟ میز کرسی تو آدمی کیا مڑے سے کھانا کھاتا ہے، اپنے ہاں کا بھی کیسا برا

رواج تھا کہ تخت پر بیٹھے کھا رہے ہیں۔“

آج مرے کل دوسرا دن، مرے والے کو کون رو تا ہے۔ آج اماں پر اپنے ہاں کے رواجوں کے بیوں کا انکشاف ہو رہا تھا۔ اگر یہ کوٹھی نہ ملتی تو پھر یہ اتنے بہت سے راز کیسے کھلتے۔

کھانا کھا کر وہ والٹن کیپ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اماں نے اسے مڑ کر دیکھا اور کوئی اعتراض بغیر پھر کام میں مشغول ہو گئیں۔

شام جب وہ والٹن کیپ سے واپس آئی تو کسی قدر پرسکون تھی۔ والٹن کیپ میں ڈاکٹر نے اسے کتنے مددگار اور پیارے لمبے میں سمجھایا تھا۔ اسے تسلی دی تھی۔ اسے وہاں سے جلدی چلے جانے پر مجبور کیا تھا اور پھر نیند کی دو گولیاں دے کر ہدایت کی تھی کہ رات کو ضرور کھالے، اسے نیند کی سخت ضرورت ہے۔

وہ اچھا اور مریبان آدمی ہے۔ رات سوئے سے پہلے عالیہ نے نیند کی گولیاں کھاتے ہوئے فیصلہ کیا۔

اسکول سے آنے کے بعد اس نے دیکھا کہ بستر پر لٹا ہوا ہے۔ کتنے دن بعد بڑی چچی نے جواب دیا تھا۔ وہ تو ان کے خط سے ایوس ہو گئی تھی۔

لٹاف کھول کر وہ جلدی جلدی پڑھنے لگی۔ پیاری عالیہ، تمہارا خط ملا۔ دل قابو میں نہ تھا جو تم کو جواب دے سکتی۔ تم نے دیکھا، تمہارے بڑے چچا کتنے بے مروت نکلے۔ میں نے زندگی بھر ان کا ساتھ دیا اور وہ مجھے تنہا چھوڑ گئے۔ تم کو کیسے بتاؤں کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ میں تمہارے بڑے چچا کو برابر منع کر رہی تھی کہ دلی مت جاؤ۔ کیا پتہ کہ ابھی کیا عالم ہو۔ مگر وہ نہیں مانے اور نہرو سے ملنے چلے گئے۔ وہاں کسی ہندو نے چپکے سے شہید کر دیا۔ چنتے بولتے گئے تھے اور جب آئے تو ہونٹوں پر آلا پڑ چکا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ وہاں کے جاننے والوں نے لاش پہچان لی اور عزت کے ساتھ گھر لے آئے ورنہ آخری دیدار کو بھی ترستی رہ جاتی۔ بیٹی خدا سے دعا کرو کہ اب وہ تمہاری چچی کی لاج رکھ لے اور جلدی سے اٹھا لے۔

نہرو نے تین ہزار روپے دینے کا اعلان کیا تھا مگر تمہارے جمیل بمیا نے یہ امداد لینے سے انکار کر دیا۔ تمہارے جمیل بمیا نے باپ کی موت کا اس قدر دکھ کیا کہ اب تک ان کے نام پر پہلے پڑ جاتے ہیں۔ تمہارے جمیل بمیا بہت دن تک بیکار رہے، ملازمت ڈھونڈتے نہ ملتی، گھر میں فاقے پڑنے لگے، وہ خدا بھلا کرے تمہارے بڑے چچا کے کانگریسی دوستوں کا جنہوں نے تمہارے جمیل بمیا کو زبردستی اسسٹنٹ جیلر کرا دیا۔ بڑی سفارشوں سے یہ نوکری ہاتھ لگی اور وہ بھی تمہارے بڑے چچا کی خدمات کے سلسلے میں مل گئی ہے۔ خدا ”ان“ کے دوستوں کو اجر دے۔ کتنے دن ہو گئے تمہارے بڑے چچا کو سدھارے، مگر اب بھی ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ ہنٹھک سے نکلے چلے آ رہے ہیں۔ کریمین ہوا تم کو اور ولین کو بہت یاد کرتی ہیں، بہت لٹ گئی ہیں۔ تمہارے بڑے چچا کے مرنے کی خبر سننے ہی انہوں نے اسرار میاں کو دھکے دے کر نکال دیا تھا، پتہ نہیں کہاں چلے گئے۔ آج تک نہ لوئے۔

اگر کلیل کہیں ملے تو ماں کے کیچے کا حال سنا دینا۔ اب کتنے دن اور جیون کی عالیہ، ایک بار تو اس کی صورت بھی دیکھ لیتی۔

حیدر آباد دکن پر ہندوستان کا قبضہ ہوتے ہی تمہارے ظفر چچا کراچی چلے گئے، ان کا خط آیا ہے کہ ابھی بیٹھے کا ٹھکانا بھی نہیں ملا۔ اللہ اپنا رحم کرے تمہاری نگرہ پھوچی اپنے گھر خوش نہیں ہیں، طلاق لینے کی سوچ رہی ہیں۔ بہت سمجھایا مگر نہیں مانیں، کہتی ہیں کہ ان کا میاں جاہل ہے، انگریزی کے دو لفظ سمجھ نہیں بول سکتا۔ انہیں سخت شرم آتی ہے کہ ان کا شوہر ایسا ہو۔ ان کی سہیلی نے دھوکے پر شادی کرا دی۔ نگرہ کے میاں تو صرف بارہ جماعتیں پڑھے ہیں۔

چھوٹی ولین کو بہت بہت دعا کہو۔ بس جیتی ہوں یہ دنیا ظالم نہیں چھوٹی درندہ تمہارے بڑے چچا کے ساتھ ہی لاش افشتی۔ خط لکھتی رہا کرو۔

تمہاری بڑی چچی

خط پڑھ کر اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹپک دیا۔ بڑے چچا اسرار میاں کو بھی اپنے ساتھ دلی لے گئے ہوتے۔ شاید کسی کو رحم آ جاتا اور ایک تیز چمرا ان کی گردن پر بھی پھیر دیتا۔

اماں سے آٹو چھپانے کے لئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

”کس کا خط ہے؟“ اماں نے پوچھا۔

”بڑی چچی کا، آپ کو دعا لکھی ہے۔“

”حد کر دی اتنے دن بعد جواب دیا ہے، وہ ہمیں اپنا سمجھتی کب ہیں، سناؤ

کیا لکھا ہے؟“

”خود پڑھ لیجئے اماں، میں تھک گئی ہوں۔“ اس نے آنکھیں کھولے بغیر

جواب دیا۔

اماں نے خط پڑھ کر رکھ دیا اور ٹھنڈی سانس بھری۔ ”کیسی بے وقوفی کی کر تین ہزار روپے واپس کر دینے، ایک دکان میں لگا دینے تو چل نکلتی۔“

”اب تم کہاں ہو گے اسرار میاں؟ عالیہ دلی دل میں پوچھ رہی تھی۔“

”خیر کریمین ہوا نے یہ کام خوب کیا کہ اسرار منٹھڑے کو نکال دیا۔ مفت خودہ کسی کام کا بھی نہ تھا، لکھا گیا منحوس سب کو۔“

”اماں۔“ عالیہ نے سرخ سرخ آنکھیں کھول کر اماں کو پکارا۔

”کیا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے گھر کی تباہی کے لئے پوچھے کہ وہ کون لایا تھا۔ وہاں کون سے اسرار میاں تھے۔ ابابو کون کھایا۔ ابابو مسرت کے لئے کون ترسانا رہا۔ مگر وہ یہ سب نہ پوچھ سکی۔ آخر وہ اس کی اماں ہیں۔

وہ پڑے پڑے ٹھنڈی سانسیں بھرتی رہی۔ اماں لوٹوں سے بھر بھر کر کیا ریوں میں پانی ڈالے لگیں۔

جیل بھیا کیا بالکل بھول گئے، اس کے خط کا جواب بھی نہ دیا۔ مگر اب وہ شاک کیوں ہے۔ ٹھیک ہے، جواب نہیں دیا، یاد نہیں آتی ہوگی۔ دوری سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ کوئی جذبہ اس کے کیچے کو نوٹنے لگا۔

اماں کی آواز پر وہ کھانا کھانے کے لئے اٹھ گئی۔ بڑی چچی نے بھی کے لئے تو کچھ کھایا نہیں۔ جانے اس کا کیا حال ہو گا۔ اس کی بیٹا تو اب مزے سے بیٹھنے لگی ہوگی۔

کھانا کھا کر وہ والٹن کیپ جانے کی تیاری کرنے لگی۔ اللہ جانے ظفر چچا حیدر آباد کی جنت سے نکل کر کس حال میں ہوں گے۔

”میں کہتی ہوں کہ کسی دن گھر بھی بیٹھو۔ آخر یہ بیہودہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔“ لوٹا رکھ کر اماں ایک دم بگڑ گئیں۔

”یہ بے ہودہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا۔“ اس نے بڑی سختی سے جواب دیا۔ اماں بردت اپنے حال میں گمن رہتی ہیں، یہ تک نہیں دیکھتیں کہ آج بوہ

جی کا خط آیا ہے، آج اس کے دل پر چھراں چل رہی ہیں۔

”سکون؟ تنکو سکون ملتا ہے؟ بغیر پیسے کوڑی کے ان بھک منگوں کی خدمت کر کے سکون ملتا ہے؟ وہ تم کو کیا دے دیتے ہیں جو اس طرح ماری پھرتی ہو؟“ مارے غصے کے اماں کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

”مجھے ان سے کچھ نہیں چاہئے۔ وہ لٹے ہوئے غریب مجھے کیا دے سکتے ہیں“ ان کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے۔ اس وقت تو میں ساری دنیا کو بھول جاتی ہوں۔“ عالیہ نے پیسے بھرپور سرت سے آنکھیں موند لیں۔ اسے اس وقت وہ بچی یاد آ رہی تھی، جس کی کتابیں امرت سرین رہ گئی تھیں اور وہ ان کتابوں کو یاد کر کے اب بھی رہتی ہے۔ اس نے بدلے میں اس کو کئی کتابیں دیں مگر وہ ان کتابوں کو نہیں بھولتی۔

”ہوں! تمہارے باپ بھی یہی کہتے تھے کہ مجھے فلاں کام میں سرت ہوتی ہے، مجھے سکون ملتا ہے، اور تمہارا چچا بھی یہی کہتا تھا۔“ اماں اسے گھور رہی تھیں۔

”میں اب نہیں ہوں اور نہ میں بڑے بچا کی طرح بن سکتی ہوں۔ آپ ان کا نام نہ لیا کریں تو بہتر ہو گا۔ آپ تو مجھے صرف اپنی بیٹی سمجھتے اور بس۔“ وہ تیزی سے باہر نکلنے لگی تو اماں نے پھر سے لوٹا اٹھالیا۔

ہمارے مرچھائے ہوئے پودوں میں جان ڈال دی تھی۔ منہ منہ کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں اور گلاب کے پودے میں دو بڑے بڑے پھول بھول رہے تھے۔ عالیہ کو ایک دم یاد آیا کہ ایک بار اس نے کیاری سے ایک پھول توڑ کر اپنے بالوں میں لگا لیا تھا مگر جب جمل بیانیہ اسے بڑے اشتیاق سے دیکھا تھا تو اس نے اپنے بالوں سے پھول کھٹو کر کیاری میں پھینک دیا تھا۔

پھانک سے باہر جاتے جاتے اس نے ایک پھول توڑ کر بالوں میں لگا لیا۔ شام جب وہ والٹن کپ سے باہر آئی تو کپڑے تبدیل کر کے لان میں آ بیٹھی۔ اماں تو تخت ناراض تھیں، انہوں نے اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا تھا۔ پھانک کے اس پار سڑک پر کاریں اور تانے خور چائے گزر رہے تھے۔ پھر

بھی عالیہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہر طرف سناٹا طاری ہے۔ وہ گھبرا کر ٹپٹے گئی۔ خزاں میں جھرنے ہوئے خشک پتے اب تک گھاس پر پڑے تھے جو اس کی چپلوں کے نیچے آکر خزاں کی یاد دل رہے تھے۔

”کیا آج نہیں بیٹھی رہو گی؟“ جب اندھیرا چھانے لگا تو اماں نے برآمدے میں آکر کہا اور پھراٹے پیروں واپس چلی گئیں۔

اب اماں کا موڈ ٹھیک ہو رہا ہے۔ وہ سرکنڈوں کی پرانی کرسی پر تھک کر بیٹھ گئی۔ اب خاصا اندھیرا چھا گیا تھا۔ پھر بھی اس نے اٹھنے کا نام نہ لیا۔ اب یہ خط و کتابت کا سلسلہ بھی ختم ہو جانا چاہئے۔ کیا قاعدہ کہ مسلسل اذیت سستی رہے۔ یادیں سب سے زیادہ ظالم ہوتی ہیں اور۔

اچانک پھانک زور سے کھلا اور کوئی بے تحاشہ بھاگتا ہوا اندر آ گیا۔

”کون؟“ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

بھاگنے والا ایک لمبے کورک گیا۔ ”آپ میری ماں ہیں، میری بہن ہیں، مجھے چھپ جانے دیجئے، میں غریب سماجر ہوں، وہ ظالم پولیس مجھے خواہ مخواہ پکڑ رہی ہے، میں ابھی چلا جاؤں گا۔“ آدی دوڑ کر بچ کے پیچھے چھپ گیا۔

عالیہ خوف کے مارے کرسی پر جم کر رہ گئی۔ اس نے اماں کو آواز دینا چاہی مگر ساری جان کا زور لگانے کے بعد بھی وہ ہوں تک نہ کر سکی۔

اسی لمبے اماں نے آکر برآمدے کا کلب روشن کر دیا۔ ”کھانا کھا لو آ کر۔“ اماں کے لمبے میں اب تک سختی تھی۔

روشنی میں اس نے ہر طرف دیکھا مگر بھی اس سے کچھ نہ بولا گیا۔ اماں پھر چلی گئیں۔ اور وہ ہاتھ بڑھا کر رہ گئی۔ اس نے اٹھ کر اندر بھاگنا چاہا تو پیروں نے جواب دے دیا۔

بچ کے پیچھے بالکل خاموشی تھی۔ عالیہ کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ پتہ نہیں کون سا ڈاکو آچھا ہو۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھی اور اندر جانا چاہتی تھی کہ ایک دم کھڑبو ہوئی اور وہ آدی نکل آیا۔ وہ باہر بھاگنے والا تھا کہ عالیہ سے اس کی ہتھکیں چار ہو گئیں۔ ”ارے عالیہ بچیا آپ؟“ کھیلنے لے اپنی ننگی سرخ

وہ اسے کھانے کے کمرے میں لے گئی جہاں اماں ردھ کر انہی بیٹیوں
نزدکت سے کھانا کھا رہی تھیں اور مائی آنکھیں پھاڑے کھیل کو دیکھ رہی تھی۔
اماں نے نظریں بھی نہ اٹھائیں۔

”اماں کھیل آیا ہے۔“

”کون کھیل۔“ اماں نے نظریں اٹھائیں۔ ”ارے تم کب آئے پاکستان؟“

اماں نے خوش ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”تھوڑے دن ہوئے چھوٹی چچی“ اور وہ سب غلط ہے، وہ دایمات لوگ یوں
بی خواہ خواہ پر دیسی جان کر۔“ کھیل اماں کے سامنے بھی اپنی صفائی پیش کر رہا
تھا۔ شاید اسے خیال ہو گا کہ عالیہ ضرور سب کچھ بتا دے گی مگر عالیہ نے تو جلدی
سے اس کی بات کاٹ دی۔ اماں کھیل بھاریہ قاتلوں کے ساتھ آیا ہے، ادھر ادھر
شر کے اندر کہیں ٹھہرا ہے، ابھی تو بچارے کو کچھ پتہ نہیں۔ اس لئے ادھر ادھر
محنت مزدوری کر کے بیٹ بھر رہا ہے۔ اپنا کوئی نہ ہو تو پھر یہی حالت ہو جاتی
ہے۔“ اس نے کھیل کے لئے کرسی کھینچ دی۔

”اب اگر ہمارے پاس جگہ ہوتی تو دے دیجے، اتنی سی تو کوشی ہے۔“
اماں نے چھ کمرؤں کی کوشی کو اتنا سنا دیا، ان کے لیے یہ سخت بے اعتنائی تھی۔
وہ کھیل کو ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

”اب یہ کافی عرصے میں میرے پاس ٹھہرے گا۔“ عالیہ نے سخت اور فیصلہ
کن لیے میں کہا۔

اماں نے گھور کر عالیہ کو دیکھا اور بے تعلقی سے کھانا کھانے لگیں۔ کھیل
مرہٹوں کی طرح جلدی جلدی کھا رہا تھا۔ وہ روٹی اس طرح اٹھاتا جیسے جھپٹ رہا
ہو۔ ”بہت دن بعد کمر کا کھانا ملا ہے، مزہ آیا کیا بچیا۔“

اماں سب سے پہلے اٹھ کر چل گئیں۔ جاتے ہوئے انہوں نے کھیل اور
عالیہ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ عالیہ بیٹی کھیل کو کھاتے دیکھتی رہی اور یہ
سوچ سوچ کر دلتی رہی کہ اگر اس وقت پولیس اسے پکڑ ہی لیتی تو کیا ہوتا۔ کھانے
کے بعد وہ کھیل کو اپنے کمرے میں لے آئی۔

آنکھیں جھکا لیں۔ ”انہوں نے مجھے غریب جان کر گرہ کٹ سمجھ لیا، میں ایسا
نہیں ہوں بچیا۔“

عالیہ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ سامنے کھیل کھڑا تھا۔ اس کی
فیض شانے سے پٹی ہوئی تھی اور پیسے ہوئے بال اتارے پر کھڑے ہوئے تھے۔

”اب میں جاتا ہوں بچیا، کسین وہ مجھے تلاش کرتے اندر نہ آجائیں۔“

”تم کہاں جاؤ گے کھیل، میرے بھیا۔“ عالیہ بے قرار ہو کر اس کے لپٹ
گئی اور پھر اسے اپنی کرسی پر بٹھا کر جلدی سے برآمدے کی جی بجا آئی۔ ”اب
تم کسین نہ جاؤ۔ کسین وہ ظالم تم کو پکڑ نہ لیں، تم میرے کمرے میں چلو۔“

وہ اسے کھینچتی ہوئی اپنے کمرے میں لے آئی اور برآمدے میں کھلنے والا
دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

”مجھے جانے دیجئے بچیا۔“ وہ اب تک گھبرا ہوا تھا۔

”میں تم کو کسین نہ جانے دوں گی، یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے
میرے بھیا۔“ وہ کھیل کے پسے کپڑوں اور لاغر چہرے کو دیکھ کر جیسے ہلکی جا رہی
تھی۔ ”تم یہاں اس حالت میں پھر رہے ہو اور وہاں بڑی چچی تمہارے لئے ادھ
موٹی ہو گئیں۔“ اس نے کھیل کو چنگ پر بٹھا دیا۔

”اچھا! اماں مجھے یاد کرتی تھیں؟ مجھے اور کون کون یاد کرتا تھا؟ ابا تو مجھے
خاک یاد کرتے ہوں گے، وہ تو کسی سے مطلب ہی نہ رکھتے تھے، اور ممی اور جمیل
بھیا، وہ تو میری خوب برائیاں کرتے ہوں گے؟“ اس کی آنکھوں میں اشتیاق تھا

”میں سخت بھوکا ہوں بچیا، کل سے میں نے کچھ نہیں کھایا۔“

”بڑے چچا تم کو خاک یاد کرتے ہوں گے، ٹھیک ہے کھیل میرے بھیا۔“
عالیہ کا گلا رندے لگا۔ ”چلو تم کو کھانا کھاؤں پھر باتیں ہوں گی۔“ اس نے کھیل کا
ہاتھ پکڑ لیا۔

”آپ یہاں کب آئیں بچیا؟“ ساتھ چلتے ہوئے کھیل نے پوچھا۔

”پاکستان بننے کے تھوڑے دن بعد آگئی تھی۔“

اب کہیں نہ جانے دوں گی، اب میں ملازم ہو گئی ہوں، میں تم کو بھی اسکول میں داخل کرا دوں گی، تم آرام سے پڑھو، اس طرح زندگی بن جائے گی، میں کل ہی بڑی چچی کو لکھ دوں گی کہ کھیل میرے پاس ہے، ہم بھائی بہن بڑے مزے سے رہتے ہیں۔“

”اب کیا پڑھوں گا بچیا، جو پڑھا تھا وہ بھی بھلا دیا، اور بچیا، ہمارے گھر کے سامنے والا اسکول تو اسی طرح تھا نا؟“

”ہاں اسی طرح تھا۔ جب پڑھنا شروع کرو گے تو سب یاد آ جائے گا۔“

”اب صبح باتیں ہوں گی بچیا، مجھے نیند آرہی ہے۔“ کھیل نے آکٹا کر جمای لی۔

”سو جاؤ مگر اب یہ سن لو کہ میں تم کو جانے نہ دوں گی، تم میرے پاس رہو گے۔“

”اب سو رہے بچیا، مجھے سخت نیند آرہی ہے۔“ وہ پھر لیٹ گیا۔۔۔

اب آپ اٹھ جائے، میں اندر سے دروازہ بند کر لوں۔“

”دروازہ بند کر لو گے تو کمری نہیں لگے گی؟“

”نہیں بچیا میں دروازہ بند کروں گا، مجھے ڈر لگتا ہے۔“

عالیہ آکر برآمدے میں لیٹ گئی۔ پاس کے چنگ پر اماں بڑی بے خبر سو رہی تھیں۔ اسے ان پر رحم آئے گا۔ خواہ خواہ آج ان سے بد زبان بنی گی۔

وہ بڑی دیر تک یوں لیٹی اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ کھیل کے بھاگ کر آنے اور چھپنے کے سفر نے اس کی نیند کو لوٹ لیا تھا۔ وہ سب سمجھ گئی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کسی بھی صورت میں کھیل کو نہ جانے دی گی، چاہے اس سلسلے میں اماں سے کتنی ہی دشمنی مول لینی پڑے۔

رات گئے وہ سو گئی اور جب صبح اٹھی تو کھیل کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ”کیا کھیل غسل خانے میں ہے؟“ اس نے اماں سے پوچھا۔

”میں نے صبح اٹھ کر اسے دیکھا نہیں، شاید چلا گیا۔ کام جو کرنا ہوا، مزدور آدی ٹھہرا۔“ اماں نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

”دروازے بند کر لیجئے بچیا مجھے ڈر لگتا ہے۔“ کھیل بڑے آرام سے عالیہ کے بستر پر لیٹ گیا۔

”یہ تمہارا کمرہ ہے، ٹھیک رہے گا نا؟“ اس نے پوچھا۔

”اب تو اباً کا ملک آزاد ہو گیا، اب وہ کیا کرتے ہیں؟ منرو نے ان کو کون سی جاگیر دے دی؟“ کھیل نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں کتنی نفرت تھی۔

”بڑے چچا؟“ عالیہ کی آواز کانپ گئی۔ ”وہ تو اس دنیا سے سدھار گئے کھیل، میرے بھیا، انہیں تو کسی ہندو نے فساد میں شہید کر دیا۔“

”کیا؟“ اس نے نکتے میں منہ چھپا لیا اور اس کا سارا جسم ہولے ہولے لرزے لگا۔

تھوڑی دیر بعد عالیہ نے اپنے آنسو پونچھ کر اس کا سر اٹھایا تو سارا ہیکہ بیگہ ہوا تھا۔

”مجھے اس وقت اماں یاد آرہی ہیں بچیا۔“ وہ دو سال کے بچوں کی طرح منٹنایا۔

”اب تم ان کے پاس چلے جاؤ کھیل، ان کی زندگی میں بہار آ جائے گی، بڑے چچا کی موت نے ان کو کہیں رکھا، تمہیں دیکھ کر وہ تھوڑے دن اور جی لیں گی۔“

”ابا کا مر جانا ہی ٹھیک ہوا بچیا، انہوں نے کسی کے لئے کچھ نہ کیا، اب میں گھر جا کر کیا کروں۔ وہ تمہیں بھیا مجھے طعنے دے دے کر زندگی حرام کر دیں گے، میرے لئے تو اب بھی اس گھر میں کچھ نہ ہو گا۔ یہاں کما کما لوں گا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”مگر اس طرح تو نہ لگاؤ کہ پولیس تمہارے پیچھے پیچھے پھرے۔ تم بہت بے رحم ہو کھیل میرے بھیا۔“

”میں کچھ نہیں کرتا بچیا، پولیس بہت بے رحم ہے۔ وہ غریبوں کو جینے نہیں دیتی، مجھے اماں یاد آرہی ہیں۔“

”اگر تم بڑی چچی کے پاس نہیں جاتے تو پھر میرے پاس رہنا ہو گا، میں تم کو

سب جھوٹ ہے۔ صبح اس نے جانے کو کہا ہو گا اور اماں نے اسے اجازت دے دی ہو گی۔ ”اس نے آپ سے جانے کے لئے کہا ہو گا اور آپ نے خوش ہو کر اجازت دے دی ہو گی۔“ عالیہ نے غصے سے کہا۔

”تم بولا گئی ہو، مجھ سے بات مت کرو“ ورنہ اپنا سر پھوڑ لوں گی۔“ اماں باورچی خانے میں چلی گئیں۔

پتہ نہیں اب کب آئے گا؟ اماں کی اجازت سے کتنا پیوس ہو کر گیا ہو گا۔ اماں نے کیا ظلم کیا۔ ان کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک بنگ پر پاؤں لٹکاے گم سم بیٹھی رہی۔

منہ ہاتھ دھو کر جب وہ اپنے کمرے میں گئی تو کپڑے تبدیل کرنے کے لئے اسے الماری کا تالا کھولنے کی ضرورت نہ پڑی۔ ٹوٹا ہوا تالا جھوٹے ہی کھل گیا۔

پرس کھلا پڑا تھا اور اس کی بیج جھ سے پچاس روپے غائب تھے۔ نکیل میرے بھیا، تم سے اب بھی ملاقات نہ ہو گی۔ اب تم سدا کے لئے کھو گئے، اب تم کو کون پاسکتا ہے؟

بڑی چچی کا خط سامنے پڑا تھا اور وہ نئے حادثے پر ملول بیٹھی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اب ممی کی زندگی کا کیا بنے گا۔ آخر اس نے اپنی ساس اور اپنے شوہر کے ساتھ پاکستان آنے سے انکار کیوں کیا۔ آخر اسے یہ کیا سوچھی تھی جس پاکستان کے لئے وہ تھوڑا اچھل اچھل کر نعرے لگاتی تھی اس پاکستان میں وہ کیوں نہ آئی؟

اس نے ایک بار پھر خط اٹھایا اور اس حصے کو پڑھنے لگی جس میں ممی کے متعلق لکھا تھا۔ ممی نے اپنے میاں کے ساتھ پاکستان جانے سے انکار کر دیا اور جب اس سے ضد کی تو لڑائی پر آمادہ ہو گئی۔ جھڑا میاں تک بڑھا کہ ممی نے اپنی ساس کو بال پکڑ کر خوب مارا اور اس کی ساس نے اپنے بیٹے سے اسی دم طلاق دلو کر مع لڑکی کے میاں بھجوا دیا۔ انہوں نے جانے سے پہلے مجھے پیغام بھجوایا تھا کہ اب اپنی اس بے گام لڑکی کا کسی بھتی سے نکاح کر دو، ہمارے بیٹے کو تو کراچی میں چاند جیسی دلن مل جائے گی۔ اب ممی جب سے میاں آئی ہے بالکل چپ ہے، اپنی بچی کو سینے سے لگائے دم بخود پڑی رہتی ہے۔ اس ممی نے بیشہ اپنے ساتھ دھنی کی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا انجام ہو گا۔ میں اسے دیکھتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

”اماں ممی کو طلاق دے کر اس کے میاں کراچی آ گئے۔“ اماں کو قریب آتے دیکھ کر عالیہ نے اطلاع دی۔

”ایں!“ اماں نے حیرت سے عالیہ کی طرف دیکھا اور پھر خط اٹھا کر پڑھنے لگیں۔

اب بیچاری ممی کیا کرے گی۔ عالیہ سوچ رہی تھی۔

”ٹھیک ہی کیا ان لوگوں نے، بھلا ایسی لڑکی سے کون نباہ کر سکتا تھا۔ غضب خدہ اکا‘ میاں اور ساس دونوں کو پیٹ کر رکھ دیا۔“ اماں نے خط میز پر ڈال دیا اور کمرے کا تری بڑی سامان ٹھیک کرنے لگیں۔

”ہو!“ عالیہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ والٹن کیپ سے آکر اس نے کپڑے بھی نہ تبدیل کئے تھے۔ مائی نے اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی پکڑا دی تو وہ کھڑے کھڑے پینے لگی۔ اے کیا ہو گیا ہے، کمرے میں ہر چیز بھیر دی ہے اور اماں ٹھیک کرتی پھرتی ہیں۔ اتنی لاپرواہی بھی کس کام کی، اماں کیا سوچتی ہوں گی۔

چائے کی خالی پیالی مائی کو تھما کر وہ لان میں آگئی۔ جون کی شام بھی کس قدر تپ رہی تھی۔ اونچے اونچے درخت بالکل ساکت کھڑے تھے۔ ایک پتہ بھی تو نہ مل رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے خشک گھاس پر ٹپٹپٹنے لگی۔ اب تو تھمائی اور اداسی کا شدید احساس ہر وقت ستانے لگا تھا۔ وہ اپنی اس گلی بھٹی زندگی سے کس قدر عاجز آگئی تھی۔

اس وقت بھی جب وہ بھیگی کی برباد زندگی کا ماتم کر چکی تھی تو پھر اپنی برباد زندگی کے لئے سوچنے لگی تھی۔ اب وہ کیا کرے؟ زندگی کس طرح کئے۔ سوچتے سوچتے اسے چند لمحوں کے لئے ڈاکٹر کا خیال آگیا۔ عالیہ نے اس کی آج کی باتوں کو یاد کرنے کی کوشش کی اور پھر اس طرح جی اچاٹ ہو گیا جیسے کوئی عجیب سی حرکت کرنے جا رہی ہو۔ وہ باتیں ہی کیا کرتا ہے۔ ٹھیک ہے وہ اچھا آدمی ہے مگر اسے باتیں کرنی ہی کب آتی ہیں؟ کوٹھی، کار، پریکٹس کا حال اور بس۔ کوٹھی تو ماموں نے اسے بھی دلا دی ہے، اور رہی کار تو وہ روز بس پر جاتی ہے۔ بس یہی فرق ہے تاکہ وہ کار سے بڑی ہوتی ہے اور کسی ایک شخص کی ملکیت نہیں ہوتی۔

”اب کھانا کھا لو، میاں اندھیرے میں اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہو؟“ اماں اس کے پاس آکھڑی ہوئیں تو اسے احساس ہوا کہ واقعی اندھیرا پھیل گیا ہے۔ وہ اماں کے ساتھ ہو لی۔

”تم ہر وقت چپ رہتی ہو، میں نے تمہارے ماموں کو لکھ دیا ہے کہ“ اماں نے چلتے ہوئے کہا۔ ”کہ اب تمہاری شادی کا بندوبست کر دیں۔“

”اچھا، مجھے آج معلوم ہوا کہ میں اسی لئے اداس رہتی ہوں۔“ وہ اس چٹائی پر جھلا گئی۔ ”مگر آپ نے ماموں کو یہ حق کب سے دے دیا؟ میں تو ان کو ماموں بھی نہیں مانتی، مجھے ان سے کوئی مطلب نہیں۔ میں شادی نہیں کروں گی۔“ اماں نے اسے ملامت بھری نظروں سے دیکھا مگر چپ رہیں۔ ادھر کچھ دنوں سے انہوں نے عالیہ کو ڈانٹنا پٹنا اور اس سے لڑنا چھوڑ دیا تھا۔

دونوں خاموشی سے کھانا کھاتی رہیں۔ عالیہ کا جی بھر رہا تھا۔ پھر بھی وہ ضبط کئے بیٹھی کھاتی رہی اور اماں جانے کیا سوچتی رہیں۔

لگے۔ میں چپ بیٹھی رہی۔ جب سے طلاق لے کر آئی تھی، انہوں نے مجھ سے ایک بات بھی نہ کی تھی۔ میں کیا منہ لے کر ان سے بولتی آپ ہی پوچھنے لگے کہ تم پاکستان کیوں نہیں گئیں؟ 'بجیا' میں انہیں کیا جواب دیتی مارے دکھ کے کلیجہ پھٹ رہا تھا کہ جس کی خاطر اتنا سب کچھ کیا وہ یہ بھی نہیں جانتا۔ میں رونے لگی تو وہ ایک دم بے چین ہو گئے اور مجھے لپٹا لیا اور میری بنیاد سے پوچھنے لگے کہ میں تیرا باپ بن جاؤں؟ پھر مجھ سے بولے کہ 'بجیا' تمہاری محبت مجھ پر قرض ہے۔ اب اس قرض سے نجات پاؤں گا۔ وہ میرے آنسو پونچھ کر کچے چلے گئے اور دوسرے دن بڑی چچی نے میرے ہاتھوں میں مندی لگا کر مجھے دلہن بنا دیا۔

اب میں بہت خوش ہوں 'بجیا'، جیل میری بہت فکر رکھتے ہیں، میری بنیا کو بہت چاہتے ہیں، 'بجیا' آپ کو ایک بات بتاؤں، جب بنیا ہوئی تھی تو میں نے یہ سوچا ہی نہ تھا کہ یہ جیل کی بیٹی نہیں ہے۔

بڑی چچی بہت خوش ہیں، میں ان کی خوب خدمت کرتی ہوں۔ کریں ہوا بھی بہت خوش ہیں، کبھی ہیں کہ اپنا خون اینڈ میں آگیا۔ ہر دم بنیا کو لپٹائے پھرتی ہیں۔ آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔ اب گھر کی بڑی اچھی حالت ہے۔ بس بڑی چچی کو تکلیف بہت یاد آتا ہے۔ اچھا 'بجیا' اب رخصت ہوتی ہوں۔ اللہ کرے میری 'بجیا' کو بھی چاند جیسا دولہا ملے۔ 'بجیا' اب آپ بھی جلدی سے شادی کر لیجئے۔ چھوٹی چچی کو آداب کہئے۔

آپ کی پیاری 'بجیا'

خط ختم کر کے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وہ اس وقت کتنی خالی اور دیران ہو رہی تھی۔ "بڑا اچھا ہوا 'بجیا' کی زندگی بن گئی۔" اس نے ایسی آواز میں کہا جو اس کی اپنی نہیں تھی۔

"اور کیا تم جیل میاں کو برتی ہوئی 'بجیا' ہی ملنا تھی۔" اماں نے بڑے سکون سے کہا۔

عالیہ خاموشی سے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی اور یوں ہی بے مقصد ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اٹھ کر والٹن کمپ جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔

اسکول سے واپسی پر اس نے دیکھا کہ میز پر بھی کھڑا ہے جسے اماں، کھول کر پڑھ چکی تھیں۔ خط کا ایک صفحہ کمرے کے فرش پر پڑا تھا اسے ذرا سا غصہ آیا اور پھر جلدی جلدی خط پڑھنے لگی۔

پیاری 'بجیا' تسلیم آپ کو گئے ایک سال ہونے آ رہا ہے مگر آپ نے کبھی مجھے یاد نہ کیا۔ ٹھیک ہے میں نے بھی آپ کو خط نہ لکھا مگر میں آپ کو کبھی نہ بھولی۔ میں نے تو آپ کو ہر دکھ اور ہر خوشی میں یاد کیا اور جب میں بہت خوش ہوں، میری زندگی میں ہمارا آگئی ہے۔ تب بھی میں آپ کو یاد کر رہی ہوں۔ 'بجیا' کاش آپ یہاں ہوتیں تو دیکھیں کہ میں کتنی خوش ہوں۔ آپ کے جیل بھیا نے مجھے اپنا بنا لیا ہے، مجھے اب تک یقین نہیں آتا کہ میں ان کی بن گئی ہوں۔ طلاق کے بعد جب میں اس گھر میں آکر پڑ گئی تھی تو ایسی بات سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ بہت دن پہلے جب انہوں نے مجھ سے آنکھیں پھیری تھیں تو مجھے اپنی بدھنسی کا یقین ہو گیا تھا 'بجیا' اب آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں اسی لئے پاکستان نہیں گئی تھی وہ مجھے اتنی دور لے جا رہے تھے جہاں سے پلٹ کر پھر میں جیل کو نہ دیکھ سکتی۔ وہ ظالم لوگ مجھ سے سب کچھ پھینے لے رہے تھے۔

'بجیا' مزے کی بات تو یہ ہے کہ بڑی چچی جیل کے لئے رشتہ تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جیل کی دلہن کی خدمت کر کے زندگی گزار لوں گی۔ کبھی تو جیل کو احساس ہو گا، وہ بچھتاں گے، انہیں افسوس ہو گا۔ اس وقت میں سمجھوں گی کہ مجھے محبت میں کامیابی ہو گئی۔ میں نے انہیں پایا۔ مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی 'بجیا' اور اس دن جب بڑی چچی لڑکی کے گھر آخری جواب لینے جا رہی تھیں تو رات کو جیل بھیا میرے پاس آ بیٹھے اور میری بنیا کو گود میں لے کر کھلا۔

آتا جاتا تھا۔ آج انہوں نے ہمارے ماموں کا ذکر کیا اور بتایا کہ ان کی بہن یہاں
ساٹنے رہتی ہیں۔ میں ضبط نہ کر سکا، تم سے ملنے کو تڑپ گیا۔ چچی کہاں ہیں؟ مگر خیر
انہیں میرے آنے کی اطلاع مت دو۔“ وہ منمنائے۔

”صنذر بھائی!“ عالیہ نے بشکل آواز نکالی۔ ماضی اس کے سامنے ماتم کرتا آ
گیا تھا۔ ”اچھا تو آپ اب آئے ہیں، بیٹھ جائیے، آپ کو کیا کام ہے؟“ عالیہ نے
سر دھری سے کہا۔

”عالیہ بی بی“ اتنی مدت گزر گئی۔ بارہ تیرہ سال کا عرصہ، اس کے بعد بھی
میرے لئے ہمارے دل سے نفرت نہ گئی۔ مگر میں غلط کہہ رہا ہوں تو مجھ سے
نفرت نہ کرتی تھی۔ تیسری یاد ہے؟ تم بھولیں تو نہیں؟“
بارہ تیرہ سال گزرنے کے بعد بھی ان کی آواز میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہی
لجابت وہی بھاری لہجہ۔

”آپ کہاں رہتے ہیں؟ آپ کے بیوی بچے کہاں ہیں؟“ عالیہ نے پوچھا۔ وہ
ان سے باتیں کرنے پر مجبور ہی ہو گئی تھی۔ ان کی آواز کی لجابت نے جیسے اس کا
دل پگھلا دیا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ کبھی اس شخص نے اس کے گھر میں زندگی کے
بدترین دن گزارے تھے۔

”میرے بیوی بچے؟“ وہ بے بسی سے ہنسے۔ ”تہینہ کے بعد میری زندگی میں
کوئی عورت داخل نہیں ہوئی۔ مجھے اس کے لئے بتاؤ عالیہ بی بی۔“

”جب آپ تہینہ آپا کو چھوڑ کر چلے گئے اور جب آپ نے اسے کبھی نہ
پوچھا اور صرف ایک خط لکھ کر اسے مرجانے پر مجبور کر دیا تو اب میں آپ کو کیا
بتاؤں؟ اب آپ یہ معلوم کر کے خوش ہونا چاہتے ہیں کہ اس نے زہر کھا لیا تھا۔
جیل بیما کی بننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ بے وقوف تھی، اس لئے مر گئی۔ آپ دانا
تھے، اس لئے زندہ رہے اور آج اتنی مدت بعد مجھے ماضی کی یاد دلانے کے لئے
میرے سامنے بیٹھے ہیں۔“

”میں زندہ ضرور ہوں مگر مرے سے بھی بدتر۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر میں
وہاں رہتا تو چچی مجھے اپنا پناہ بنا کر لیتیں؟ ایسا ناممکن تھا۔ بھرا پر انگریز تاجہ جاتا۔

آج ڈاکٹر نے اس سے بڑی التجا سے شادی کی درخواست کی تھی۔ زمین
مکان سب اس کے نام لکھنے کے لئے کہا تھا۔ ساری زندگی اس کے قدموں میں
گزارنے کا وعدہ کیا تھا اور جب وہ یہ سب کر رہا تھا تو ایک لمحے کو اس کا ہنسی چاہا کہ
وہ ہاں کر دے، وہ اس سامنے تلے بیٹھ جائے مگر جب وہ اقرار کرنا چاہتی تھی تو
اسے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ کار، کوشی، بنگ، ٹیلنس اور یہ ڈاکٹر جو والٹن کپ
میں لئے ہوئے انسانوں کا علاج کر کے روپے کما تا ہے۔ بس اس نے یہی چاہا
تھا؟ کیا اس کا معیار یہی شخص تھا؟ اور وہ جانے کس جذبے کے تحت وہاں سے
نہیں نہیں؟ کتنی بھاگ آئی تھی اور اب اپنے گھر میں بڑی سوچ رہی تھی کہ آخر
وہ چاہتی کیا ہے۔ ادھر تو کتنے دن ہو گئے تھے کہ اسے جیل بیما کی یاد بھی نہ آئی
تھی۔ اس نے بڑی جچی کے خطوں کا جواب بھی نہ دیا تھا۔ اس نے تو وہاں سے تمام
رشتے توڑ لئے تھے۔ اسے اب کوئی دلچسپی نہ محسوس ہوتی تھی۔

بادل بڑے زور سے گھر کر آ گئے تھے۔ وہ کمرے سے نکل کر باہر لان میں آ
گئی۔ پارشوں نے گھاس کو گھٹا اور سبز کر دیا تھا۔ بجلی بجلی ہوا میں ٹپٹپٹے ٹپٹے اس
نے دیکھا کہ چمکاک کے پاس کوئی شخص کھڑا اسے دیکھ رہا ہے۔

”میں اندر آ جاؤں عالیہ بی بی؟“ وہ آگے بڑھنے لگا۔
چالیس یا پچاس سال کی ایک پرکشش شخصیت اس کے سامنے کھڑی تھی۔
عالیہ نے اسے حیران نظروں سے دیکھا۔ جانے کہاں دیکھا ہے، کس سے ملتی
صورت ہے۔ اس نے اپنے ذہن پر زور ڈالا۔ ”آپ کون ہیں؟“ آخر اس نے
پوچھا۔

”میں صنذر ہوں۔ تم نے پہچانا نہیں عالیہ بی بی؟ یہ سامنے والی کوشی تھی

اسی لئے میں راہ سے ہٹ گیا۔ میں نے روپے لینا بھی بند کر دیئے تھے۔ تم سوچ نہیں سکتیں کہ اس کے بعد زندہ رہنے کے لئے مجھے کیا کچھ کرنا پڑا۔ بہر حال میرا ضمیر صاف ہے۔ میں نیک کام کرتا رہا اور اس کے بدلے میں بڑے چٹاکی طرح جلیں کاٹتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تہینہ مجھے بھولے گی نہیں اور جان دے دے گی۔ ان کی آواز یادوں کے بوجھ سے کانپنے لگی تو وہ خاموش ہو گئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

”اب آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ کچھ اپنے لئے بتائیے۔ پرانی باتوں کو نہ اٹھیرئے اب مجھ میں برواشت کی طاقت نہیں رہی۔“ وہ اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

ذرا دیر کے لئے بالکل خاموشی چھا گئی۔ عالیہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بچے ہوئے زمانے کی ایک ایک بات اسے یاد آ رہی تھی۔ اسے خواہ مخواہ صفحہ بھائی سے بے پناہ ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ آخر ان کا کیا قصور تھا۔ آپا کنزور تھیں، وہ اپنی بات نہ منوانا سکتی تھیں، اس لئے اماں نے گھر کو تیار کر دیا۔

عالیہ نے سراٹھا کر دیکھا تو صفحہ بھائی اسے بڑے اشتیاق اور پیار سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ اس طرح کہ عالیہ کی نظریں جھک گئیں اور وہ بھی گھبرا گئے۔

”مجھے اپنے لئے بتائیے۔“ اس نے پھر کہا۔

”میں اپنے لئے کیا بتاؤں؟ یہاں آنے کے بعد دوبارہ سسٹنی ایکٹ کے تحت جیل جا چکا ہوں اور اب تھک سا گیا ہوں۔ پر اب بھی یہی چاہتا ہوں کہ تھکوں نہیں، زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کرتا رہوں، اور۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

ذرا دیر کے لئے پھر خاموشی چھا گئی۔ بڑی بے ڈھنگی سی خاموشی، جیسے کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا بات کرے۔ آج عالیہ کے سامنے وہ شخص بیٹھا تھا جس نے مدتوں اس کے گھر میں عذاب سے تھے۔ گناہوں سے پہلے دو وزح کے مزے جمیل لئے تھے، جسے ”بھگنوں کا قیدہ اور ڈھروں پانی ملا دودھ دیا جاتا“ جسے کئی کہانی و قہوں کا پاسی سزا ہوا کھانا کھلا کر اس کی موت کی دعا میں مانگی جاتیں۔ اس کا قصور

صرف یہی تھا کہ وہ غریب باپ کا بیٹا تھا۔ کتنے ہیں کہ حشر کے روز ماں کے نام سے پکارا جائے گا۔ کاش صفحہ بھائی کے لئے بھی یہ دنیا روز حشری رہتی، انہیں جاگیر دار کی بیٹی سلسلہ چھو بھی کے نام سے یاد کیا جاتا۔ پھر تو یقیناً ان کی قیمت بڑھ جاتی۔

سوچتے سوچتے اس نے صفحہ بھائی کی طرف دیکھا، وہ آنکھیں بند کئے، کرسی کی پشت سے سر ٹیکے جانے لگا سوچ رہے تھے، اس وقت وہ اسے بڑے مظلوم نظر آ رہے تھے۔ بالکل پتلے جیسے صفحہ بھائی۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ گھر کے لڑائی جھگڑوں سے ہراساں ہو کر مٹ بسورتی پھرتی تو یہی صفحہ بھائی اس کو خوشیوں کی راہ دکھاتے اور اس کی خاطر اماں کی تیز گھورتی ہوئی نظروں کے تیر اپنے کیچے کے پار کر لیتے۔

اس نے پھر ان کی طرف دیکھا تو وہ اسے بڑے پیار سے تنک رہے تھے۔ کچھ ایسی عجیب سی نظریں کہ وہ بوکھلا کر رہ گئی اور صفحہ بھائی جھینپ گئے۔ ”عالیہ بی بی! مجھے آج بھی تہینہ سے اسی طرح محبت ہے۔ آج جب یہاں بیٹھا ہوں تو جانے کیا کیا یاد آ رہا ہے۔ تم تو بڑی ہو کر بالکل تہینہ جیسی لگنے لگی ہو، ہو بسو تہینہ۔ تمہیں دیکھ کر خیال ہی نہیں آتا کہ وہ مر گئی ہے۔“

وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ بادلوں سے لدی پھندی شام بہت ادا اس لگ رہی تھی۔ اس نے صفحہ بھائی کو غور سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے دو آنسو لڑھک کر رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ کیا بچ صفحہ بھائی آج تک تہینہ کو اسی طرح چاہتے ہیں؟ اور کیا اسی لئے ان کی زندگی میں کوئی عورت نہ آ سکی؟ اور آج وہ اس کو صرف اس لئے اتنے پیار سے دیکھ رہے ہیں کہ وہ تہینہ آپا جیسی دکھائی دیتی ہے؟ عالیہ کو یاد آیا کہ صفحہ بھائی تہینہ کو ایسی ہی نظروں سے پیچھے چوری دیکھا کرتے تھے۔ کیا محبت اتنے دنوں تک بھی زندہ رہتی ہے؟ اب صفحہ بھائی کتنے تھک چکے ہیں، کتنے بہت سے بال سفید ہو گئے ہیں۔ شاید انہوں نے کبھی سکھ کی سانس نہ لی ہوگی۔

”صفحہ بھائی کیا بچ میں تہینہ آپا جیسی لگتی ہو؟“ اس نے اچانک سوال کیا اور پھر اپنے سوال پر خود ہی گھبرا گئی۔

”ہاں بالکل اس جیسی“ — وہ پھر اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگے۔
 ”میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ تم وہ نہیں ہو، اگر تم تہینہ ہو تیں تو مجھے اپنے دل میں چھپا لیتیں، مجھے زندگی کی خوشیاں دے دیتیں۔“ وہ جیسے خواب میں بولنے لگے۔ ”تم تہینہ بن جاؤ عالیہ، تم میری بن جاؤ، میں تمک گیا ہوں۔“ — وہ اٹھ کر اس پر جھک گئے۔ ”تم میرا ساتھ دے دو، تہینہ کتنی تھی کہ میں جو کچھ بھی کروں گا وہ میرا ساتھ دے گی اور کیا کچھ کتنی تھی۔“ — وہ جیسے ہوش میں آکر بیٹھ گئے۔

عالیہ نے آنکھیں موند لیں، وہ کچھ ایسی کیفیت میں ڈوبی ہوئی تھی جیسے کسی دلہن کو پہلی بار اس کے دولہا کے کمرے میں لے جایا جا رہا ہو۔ اس کے کانوں میں آندھوں جیسی سائیں سائیں ہو رہی تھیں۔ پتہ نہیں صفدر بھائی کرسی پر بیٹھنے کے بعد اور کیا کہتے رہے، اس نے سنائی نہیں۔ وہ تو بالکل بہری ہو رہی تھی۔
 ”کیا آج یہاں سے اٹھنے کا ارادہ نہیں؟“ اماں برآمدے میں آکر کہہ رہی تھیں۔
 ”اور یہ کون بیٹھا ہے وہاں؟“ وہ پاس آئیں۔

عالیہ نے ہوش میں آکر ان کی طرف دیکھا۔ وہ صفدر بھائی کو پچاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”السلام علیکم چچی۔“ صفدر بھائی منمنائے ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”تم۔۔۔؟“ اماں پچان کر زور سے ہاتھ دھکائے لگیں۔ ”تم یہاں کس لئے آئے ہو؟ اس گھر کا پچھا نہیں چھوڑو گے کبھی؟ سب کچھ تو تباہ ہو گیا۔ تم نے اب چھوڑا کیا ہے؟“

”میں۔۔۔ میں ملنے آیا ہوں، آپ لوگوں کو دیکھنے کے لئے جی چاہ رہا تھا، ابھی چلا جاؤں گا چچی۔“ انہوں نے عالیہ کو الوداعی نظروں سے دیکھا تو اسے اپنا کلیجہ پھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

”یہ نہیں جائیں گے اماں، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب یہ ہمیشہ میرے پاس رہیں گے، آپ ہم دونوں کو ایک کر دیجئے۔“ عالیہ نے نظریں جھکا کر بڑے

بزم سے کہا۔

”افوہ! لعلتی تم اتنی دیر سے یہاں بیٹھے عالیہ کو یہی پٹی پڑھا رہے تھے۔“
 مارے غصے کے اماں کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ ”تم ابھی یہاں سے نکل جاؤ۔“

”میں تہینہ آپ کی طرح کوئی نہیں ہوں اماں، یہ نہیں جائیں گے۔“ عالیہ کو اپنے گلے میں کانٹے پھنستے معلوم ہو رہے تھے۔

اماں نے پٹنی پٹنی نظروں سے عالیہ کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم نے اسی دن کے لئے کھانا پڑھا تھا؟“

”میں کوئی برا کام نہیں کر رہی ہوں۔“ اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ اس کے سامنے صفدر بھائی بے بسی کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ عالیہ نے پیار سے ان کی طرف دیکھا۔ ساری زندگی دنیا کے لئے وقف رکھی مگر ان کا کوئی نہ بنا، کسی نے ساتھ نہ دیا، اب وہ ضرور ساتھ دے گی۔

”تم ضرور شادی کرو، میری طرف سے اجازت ہے، میں کل اپنے بھائی کے گھر چلا جاؤں گی، میں مرتے ہوئے تم کو دودھ نہ بخشنو گی۔ مجھے اس وقت بڑی خوشی ہو گی کہ تم میری زندگی میں ہی سسلہ کی طرح تباہ ہو جاؤ، یہ شخص جیلوں میں زندگی گزارے اور تم گھر میں پڑی رہو۔“

”میں ان کا انتظار کیا کروں گی اماں، میں تڑپوں گی نہیں۔ میں سسلہ چھو بھی کی طرح بھی نہیں مروں گی۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

اماں نے ساری کا آنچل اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ ان کا جسم لرز رہا تھا۔
 ”چچی آپ کہیں نہیں جائیں گی۔“ صفدر بھائی نے التجا کی۔ ”میں آپ کی خدمت کروں گا، میں نے اپنی زندگی کی ڈگر کو بدل دیا، دنیا تباہ ہوتی ہے تو ہو جائے مجھے کوئی مطلب نہیں، میں اب صرف دولت کمائوں گا، عیش کروں گا، میں اب کار، کوئچی کے خواب پورے کروں گا۔ میں اب جیل نہیں جاسکتا۔ میں اب اسپورٹ ایکسپورٹ کا لائسنس لینے کی کوشش کر رہا ہوں، بہت جلد مل جائے گا۔ چچی میں اب بڑا آدمی بن جاؤں گا، آپ مجھے قبول کر لیجئے۔“

”اے!“ عالیہ نے اجنبیوں کی طرح صفدر بھائی کی طرف دیکھا۔ ارے بس اب آپ کی زندگی کا یہی مقصد رہ گیا ہے، بس اتنی سی بات۔ عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ بہت دور سے ریتلے میدانوں میں سے چل کر آ رہی ہے۔ تھکن سے نڈھال۔ جنم جنم کی پیاسی۔ ارے کوئی تو اس کے حلق میں ایک قطرہ پانی کا ٹپکا دے۔

”تم پہلے کچھ بن کر دکھاؤ پھر میں عالیہ کی خواہش پوری کر دوں گی۔“ اماں نے بڑی چالاکی سے معاملے کو ٹالنے کے لئے کہا۔

”میں شادی نہیں کروں گی اماں۔ آپ بھی سن لیجئے صفدر بھائی، میں شادی نہیں کروں گی۔“ وہ کرسی سے اٹھی۔ اب جب آپ یہاں آئیں تو سوچ لیجئے گا کہ مجھے تمہیں آپا یاد آتی ہیں، میں اس یاد سے چھٹکارا چاہتی ہوں۔“ وہ تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بھاگنے لگی۔ ”خدا حافظ۔“

جب وہ اپنے کمرے میں بے سدھ پڑی تھی تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسی اس کے سینے پر دھم دھم کرتی گزر گئی۔ ”میں نے آپ کو ہرا دیا بچیا، میں نے آپ کو ہرا دیا بچیا۔“

اس نے دونوں ہاتھ زور سے اپنے سینے پر باندھ لئے۔